DDUR203DCT

نثری اصناف

ڈپلوما اِن اردو

(دوسرا سمسٹر)

چھٹا پرچہ

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد۔500032، تلنگانہ، بھارت

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course: Nasri Asnaaf

ISBN: 978-81-994387-0-5

First Edition: **October 2025**

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2025
Copies	:	1000
Price	:	165/- (The price of the book is included in admission fees of distance mode students)
Copy Editing	:	Dr. Md Nehal Afroz/Dr. Mohd Jafar, CDOE , MANUU
Cover Designing	:	Dr. Mohd. Akmal Khan, CDOE, MANUU
Printer	:	Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

Nasri Asnaaf

Paper VI

Diploma in Urdu 2nd Semester

Centre for Distance and Online Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TG), India

*Director:*dir.dde@manuu.edu.in*Publication:*ddepublication@manuu.edu.in

Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission from the publisher (registrar@manuu.edu.in)

مدیر

پروفیسر نکہت جہاں

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

معاون مدیر

پروفیسر محمد نسیم الدین فریس

سابق ڈین اسکول آف لینگویجز و صدر شعبہ اردو

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مجلس اِدارت

پروفیسر نکہت جہاں

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

پروفیسر محمد نسیم الدین فریس

سابق ڈین اسکول آف لینگویجز و صدر شعبہ اردو

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ڈاکٹر ارشاد احمد

اسسٹنٹ پروفیسر، اردو

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ڈاکٹر محمد نہال افروز

اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ڈاکٹر محمد اکمل خان

اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ڈاکٹر محمد جعفر

اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی

مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

کورس کوآرڈی نیٹر

پروفیسر نکہت جہاں، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
ڈاکٹر حکیم رئیس فاطمہ، شعبہ اردو، حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 1 ،14
ڈاکٹر محمد نہال افروز، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مانو، حیدرآباد	اکائی2،5،6،13
ڈاکٹر علی ظفر، لکچرر گورنمنٹ انٹر کالج، محمود آباد، سیتاپور	اکائی3،8
ڈاکٹر فیروز عالم، شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی4
پروفیسر سید محمود کاظمی، شعبہ ترجمہ، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی7
پروفیسر مسرت جہاں، صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 9،11
پروفیسر نکہت جہاں، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مانو، حیدرآباد	اکائی10 ،16
ڈاکٹر محمد جعفر، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مانو، حیدرآباد	اکائی12
پروفیسر فضل اللہ مکرم، صدر شعبہ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی15

فہرست

کورس کا تعارف : کو آرڈی نیٹر 06

بلاک I

اکائی 1 داستان: اقتباس (قصہ حاتم طائی: باغ و بہار) 09

اکائی 2 داستان: اقتباس (رانی کیتکی کی کہانی) 20

اکائی 3 ناول: اقتباس (امراؤ جان ادا) 31

اکائی 4 ناول: اقتباس (شکست) 48

بلاک II

اکائی 5 افسانہ: نجات 63

اکائی 6 افسانہ: بھولا 76

اکائی 7 ڈراما: اقتباس (انار کلی) 91

اکائی 8 ڈراما: اقتباس (آگرہ بازار) 112

بلاک III

اکائی 9 مضمون: بحث و تکرار (سر سید) 125

اکائی 10 مضمون: ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں (ڈاکٹر زور) 136

اکائی 11 انشائیہ: انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا (محمد حسین آزاد) 146

اکائی 12 انشائیہ: جھینگر کا جنازہ (خواجہ حسن نظامی) 160

بلاک IV

اکائی 13 خاکہ: نام دیو مالی (مولوی عبد الحق) 170

اکائی 14 خاکہ: مخدوم محی الدین (مجتبیٰ حسین) 184

اکائی 15 خطوط: انتخاب مکاتیب غالب 198

اکائی 16 خطوط: انتخاب مکاتیب اقبال 212

نمونہ امتحانی پرچہ 227

پیغام

پروفیسر سید عین الحسن
شیخ الجامعہ (مانو)

گزشتہ چند برسوں کے دوران یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ غیر اردو داں طبقے میں اردو سیکھنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے جس کے نتیجے میں شائقین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ نئی نسل اردو ادب سے بالخصوص اردو شاعری سے دلچسپی رکھتی ہے۔ آج اردو شاعری کو بہتر انداز سے سمجھنے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے نوجوان اور باذوق لوگ اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ اردو کی وہ نئی نسل، جس نے انگلش میڈیم اسکولوں میں تعلیم حاصل کی ہے لیکن اردو نہیں جانتی، وہ بھی اردو سیکھنا چاہتی ہے۔ اردو زبان کے شائقین اور اردو سیکھنے کے خواہشمند افراد کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن نے "ڈپلوما ان اردو" کا نصاب ترتیب دیا ہے۔ یہ ایک فاصلاتی طرز کا پروگرام ہے جسے اساتذہ نے بہ حسن خوبی انجام دیا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ CDOE کے معاونین کی انتھک اور مخلصانہ کاوشوں کی بدولت "ڈپلوما ان اردو" کا اکتسابی مواد تیار ہو سکا۔ میں ان سب کو دلی مبارک باد دیتا ہوں، ساتھ ہی اردو سیکھنے کے شائقین کو دعوت دیتا ہوں کہ آیئے مانو کے اس فاصلاتی پروگرام کے ذریعے اردو زبان سیکھیے اور اردو کے اس نصاب کے مدِّ نظر اپنے ذوق سلیم کی تربیت کیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اکتسابی مواد اردو زبان سیکھنے میں معاون ثابت ہوگا۔ مزید یہ کہ اس حوالے سے آپ نہ صرف اردو زبان سے واقف ہوں گے بلکہ اردو کے علمی، ادبی اور ثقافتی ورثے سے بھی شناسائی حاصل کریں گے جس کی روح ہندوستانی ہے۔

پیغام

پروفیسر محمد رضاءاللہ خاں
ڈائرکٹرCDOE(مانو)

دور حاضر میں فاصلاتی طرز تعلیم کو ساری دنیا میں ایک نہایت کارآمد اور مفید طریقہ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ بڑی تعداد میں لوگ اس طریقہ تعلیم سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اردو آبادی کی تعلیمی صورتِ حال کے پیش نظر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اپنے قیام کے روز اول ہی سے اس طرزِ تعلیم کو اپنایا ۔ چنانچہ مانو کے مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم (سنٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن) کے تحت یو.جی، پی.جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکٹ کورسوں پر مبنی جملہ (19) پروگرام نہایت کامیابی سے چلائے جارہے ہیں ۔ جن کی تعداد میں سال بہ سال اضافہ ہورہا ہے۔ مانو کے مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم کے تحت پیش کیا جانے والا نیا تعلیمی پروگرام "ڈپلوما ان اردو" ہے۔ اس کا آغاز اسی سال (2025) سے ہورہا ہے۔

یہ پروگرام بنیادی طور پر غیر اردو داں طبقے کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کا خود اکتسابی مواد تیار کرنے والے ماہرین نے غیر اردو داں طبقے کے ذہن و مزاج اور اکتسابی دشواریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے پیش نظر اکتسابی مواد تیار کیا ہے تاکہ غیر اردو داں افراد کو اردو سیکھنے میں دقت نہ ہو اور وہ آسانی سے اردو زبان سیکھ لیں ۔ میں اکتسابی میں مواد لکھنے والے اساتذہ اور ماہرین کو صمیم قلب سے مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تدریسی مواد، اردو زبان سیکھنے کے خواہشمند افراد میں اردو کی لسانی مہارتوں (سمجھنا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا) کو فروغ دینے میں مددگار ثابت ہوگا۔

کورس کا تعارف

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مانو) ہندوستان کی ایک اہم مرکزی یونیورسٹی ہے جس کا قیام 1998 میں پارلیمنٹ کے ایک خصوصی ایکٹ کے ذریعے عمل میں آیا۔ مانو کو ملک کی دیگر جامعات کے مقابلے میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ یونیورسٹی اردو ذریعہ تعلیم (اردو میڈیم) کی یونیورسٹی ہے جو اردو زبان میں روایتی اور فاصلاتی طرز پر اردو آبادی کو اعلیٰ پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم فراہم کر رہی ہے۔ اس یونیورسٹی کو جو مینڈیٹ دیا گیا ہے اس کے تحت اس کے قیام کے بنیادی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد اردو زبان کی ترویج و ترقی ہے۔

مانو کے تمام روایتی و فاصلاتی طرز کے پروگراموں اور کورسوں میں یہ مقصد زیریں لہر کی طرح کار فرما ہے۔ یہ بات محتاج وضاحت نہیں کہ عہد حاضر میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اردو زبان کو ادب کے علاوہ سوشیل سائنس اور سائنس کی مختلف شاخوں، کامرس اور بزنس مینجمنٹ کمپیوٹر سائنس اور انجینئرنگ، قانون اور صحافت جیسے عصری علوم سے جوڑنے میں نہایت طاقتور اور متحرک کردار ادا کر رہی ہے۔ اس میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کے شعبوں کے ساتھ مانو کے مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم کے پروگرام بھی برابر کے شریک ہیں۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم کے تحت مختلف شعبہ ہائے علم میں مختلف سطحوں کے متعدد پروگرام پیش کیے جاتے ہیں جن کے ذریعہ اردو داں طبقے کی ایک بڑی تعداد استفادہ کر رہی ہے۔ مانو کے شیخ الجامعہ پروفیسر سید عین الحسن ہمیشہ یونیورسٹی کی ترقی و توسیع، تعلیمی معیار کی بلندی اور اردو زبان کے فروغ و استحکام کے لیے نئے نئے منصوبوں پر غور کرتے رہتے ہیں، ان کے ذہن رسا نے یہ سوچا کہ اردو زبان کا ایک ایسا ڈپلوما پروگرام متعارف کرانا چاہیے جس کے ذریعے غیر اردو داں افراد کو اردو زبان سیکھنے میں سہولت ہو اور وہ اردو میں نوشت و خواند کی استعداد کے حامل ہو سکیں و نیز ان میں اردو ادب اور اردو کی گنگا جمنی ثقافت کی اہمیت اور عظمت کا شعور بھی پیدا ہو۔ شیخ الجامعہ کی ایما اور پروفیسر محمد رضاء اللہ خاں، ڈائرکٹر مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم کی رہنمائی میں اردو کے ایک ڈپلوما پروگرام کا خاکہ تیار کیا گیا۔ ماہرین کے مشوروں سے اس کا نصاب ترتیب دیا گیا اور فاصلاتی طرز تعلیم کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرتبہ نصاب کے مطابق اس ڈپلوما پروگرام کا خود اکتسابی مواد اور کتابیں تیار کی گئیں۔ اور اب یونیورسٹی کے ارباب مجاز کی منظوری سے یہ پروگرام جسے ڈپلوما اِن اردو (Diploma in Urdu) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ مانو کے مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم کے تحت اردو زبان سیکھنے کے خواہش مندوں کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔

موجودہ زمانے میں اردو زبان کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ برصغیر ہند و پاک کے علاوہ اردو زبان خلیجی ممالک شرق اوسط، وسطی ایشیا، مشرق بعید یورپ اور امریکہ کے کئی شہروں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو زبان دستور ہند کے آٹھویں شیڈول میں درج

بڑی ہندستانی زبانوں میں شامل ہے۔ملک کی کچھ ریاستوں میں اسے دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ایک اندازے کے مطابق ہندی کے ساتھ مل کر اردو دنیا کی تیسری سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔

ہندوستانی فلموں کے مکالموں اور نغموں میں اردو استعمال کی جاتی ہے۔اردو زبان کے مشاعرے، غزل اور قوالی کے پروگرام بڑے ذوق وشوق سے سنے جاتے ہیں۔ان پروگراموں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے غیر اردو داں سامعین اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ گلوکار فلمی اداکار، اسٹیج پر مظاہرہ کرنے والے فن کار، الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ اینکر اور خبریں نشر کرنے والے وغیرہ سب صحیح تلفظ اور خوبصورت لہجے میں بات کرنے کے لیے اکثر اردو سیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ان کے علاوہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باذوق افراد بھی جو اردو زبان کی شیرینی، نفاست اور شائستگی کے دلدادہ ہیں اردو سیکھنا چاہتے ہیں، یہ پروگرام ان تمام افراد کی ضرورت کی تکمیل کر سکتا ہے۔علاوہ ازیں یہ پروگرام مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے میں بھی معاون ثابت ہوگا جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔یہ پروگرام ان افراد کے لیے بھی مددگار ثابت ہوگا جو اردو زبان کے بیش بہا اور رنگارنگ ادبی سرمائے تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ڈپلوما اِن اردو پروگرام دو سمسٹروں پر مبنی ہے جس کے پہلے اور دوسرے سمسٹر میں تین، تین پرچے ہوں گے۔ہر پرچے میں سولہ اکائیاں ہیں جنھیں چار بلاکوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ہر پرچے کے ذریعے طلبا کو موضوع سے متعلق ڈپلوما کی سطح کے مطابق تمام ضروری معلومات پہنچانے کی ممکنہ کوشش کی گئی ہے۔ہر سمسٹر میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے طلبا کو تینوں پرچوں کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے علاوہ تفویضات (Assignments) کی تکمیل بھی لازمی طور پر کرنا ہے۔تبھی وہ اس پروگرام میں کامیاب اور ڈپلوما ان اردو کے اہل قرار پائیں گے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ڈپلوما اِن اردو کے چھٹے پرچے کی یہ کتاب پیش کر رہے ہیں، جس کا عنوان "نثری اصناف" ہے۔اس سے قبل تیسرے پرچے کی کتاب "مطالعہ نثر" میں آپ نے اردو نثر کی مختلف اصناف سے واقفیت حاصل کی تھی۔اس کتاب میں اردو میں نثر کی اہم اصناف، داستان، ناول، افسانہ، ڈراما، مضمون، انشائیہ، خاکہ اور خطوط کے منتخب متون کا مطالعہ کیا جائے گا۔اس کتاب میں داستان کے زمرے میں "باغ و بہار" اور "رانی کیتکی کی کہانی" اور ناول کے زمرے میں "امراؤ جان ادا" اور "شکست" کے اقتباسات شامل کیے گئے ہیں۔اسی طرح افسانے کے زمرے میں "نجات" اور "بھولا" کا مکمل متن اور ڈراما کے تحت "انارکلی" اور "آگرہ بازار" کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔اسی طرح مضامین کے تحت سر سید احمد خان اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے مضامین اور انشائیہ کے تحت محمد حسین آزاد اور خواجہ حسن نظامی کے انشائیے شامل کیے گئے ہیں۔خاکوں کے زمرے میں مولوی عبدالحق اور مجتبیٰ حسین کے خاکوں اور خطوط کے ضمن میں غالب اور اقبال کے منتخب خطوط شامل کیے گئے ہیں۔ہر نثری متن کے مطالعے میں اُس متن کی تشریح اور خلاصے کے ساتھ مصنف اور اس کے فن یا فن پارے کی امتیازی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کے ذریعے طلبا میں اردو کی نثری اصناف سے دلچسپی اور نثری تصانیف کے مطالعے کا ذوق پیدا ہوگا۔

پروفیسر نکہت جہاں
کورس کوآرڈی نیٹر

اصناف نثر

بلاک I

اکائی 1: داستان

قصہ حاتم طائی (باغ و بہار)

اکائی کے اجزا

1.0		تمہید
1.1		مقاصد
1.2		قصّہ حاتم طائی (باغ و بہار)
	1.2.1	میر امن کا تعارف
	1.2.2	قصّہ حاتم طائی (متن)
	1.2.3	خلاصہ
1.3		اکتسابی نتائج
1.4		مشکل الفاظ
2.5		مشقیں
2.6		نمونہ امتحانی سوالات

1.0 تمہید

داستان طویل کہانی کو کہتے ہیں جس میں قصہ در قصہ واقعات بیان کیے ہیں۔ یہ حیرت انگیز واقعات اور کارناموں سے بھری ہوتی ہے۔ اس میں انسانوں کے علاوہ جن، پری، بھوت، دیو اور کرشماتی چیزیں ہوتی ہیں۔

داستان اردو ادب کی ایک اہم اور قدیم ترین صنف ہے۔ اردو میں داستان نگاری کی ابتدا دکن میں ہوئی۔ دکن میں اردو کی پہلی نثری داستان ملا وجہی کی "سب رس" ہے جو قطب شاہی دور میں لکھی گئی۔ شمالی ہند کی پہلی داستان عیسوی خان بہادر کی قصہ "مہر افروز و دلبر" ہے۔ عہد قدیم میں کئی داستانیں لکھی گئیں۔ اردو داستان کی تاریخ میں فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کی خدمات ناقابل فراموش ہیں-اس کالج نے اردو میں داستانوں کے فروغ میں اہم حصہ لیا۔ اس کالج کی نثری خدمات کا زیادہ تر حصہ داستانوں پر مشتمل ہے۔ یہ داستانیں فارسی اور سنسکرت

قصوں یا داستانوں کا ترجمہ ہیں- فورٹ ولیم کالج میں لکھی گئی داستانوں میں میر امن کی "باغ و بہار" کو سب سے زیادہ مقبولیت اور اہمیت حاصل ہوئی۔ اس اکائی میں آپ میر امن کی مشہور داستان "باغ و بہار" کے دوسرے درویش کے قصے میں درج "قصّہ حاتم طائی" کے بارے میں پڑھیں گے۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- داستان نگار میر امن سے واقف ہو سکیں۔
- داستان "قصّہ حاتم طائی" (باغ و بہار) کے منتخب متن کا مطالعہ کر سکیں۔
- داستان "قصّہ حاتم طائی" (باغ و بہار) کا خلاصہ بیان کر سکیں۔

1.2 داستان: قصّہ حاتم طائی (باغ و بہار)

1.2.1 میر امن کا تعارف:

داستان باغ و بہار کے مصنف کا نام میر امن ہے- میر امن دہلی میں پیدا ہوئے لیکن ان کی پیدائش اور واقعات زندگی تاریکی میں ہیں۔ دہلی میں ان کی آبائی جاگیر موجود تھی لیکن سورج مل جاٹ نے 1753ء میں جاگیر ضبط کر لی اور احمد شاہ ابدالی کے دہلی پر حملے (1761ء) میں مکان تباہ ہو گیا۔ میر امن دہلی کی سکونت ترک کر کے اپنے خاندان کے ساتھ عظیم آباد (پٹنہ) چلے گئے- کچھ عرصہ وہاں قیام رہا لیکن جب وہاں بھی حالات ناساز گار ہوئے تو کلکتہ پہنچے- کچھ دن تلاش روزگار میں لگے رہے۔ آخر کار نواب دلاور جنگ نے انھیں اپنے چھوٹے بھائی محمد کاظم خان کی اتالیقی کے لیے مقرر کیا۔ یہاں دو سال ملازمت کی پھر سلسلہ ملازمت ترک کر کے منشی بہادر علی حسینی کے توسط سے فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ ہندوستانی کے صدر ڈاکٹر گل کرسٹ تک رسائی حاصل کی۔ انھوں نے میر امن کو شعبہ ہندوستانی سے منسلک کر دیا۔

1801ء کو میر امن کا ماتحت منشی کی حیثیت سے تقرر عمل میں آیا اور چالیس روپیہ ماہوار تنخواہ پانے لگے- فورٹ ولیم کالج سے میر امن پانچ سال وابستہ رہے- 1806ء میں وہ سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد بھی میر امن کلکتہ ہی میں مقیم رہے اور یہیں وفات پائی- میر امن نے فورٹ ولیم کالج کے زمانہ ملازمت ہی میں "باغ و بہار" اور "گنج خوبی" تصنیف کیں۔

انھوں نے "باغ و بہار" کو ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی فرمائش پر 1801ء میں لکھنا شروع کیا یہ داستان 1802ء میں مکمل ہوئی اور پہلی بار 1804ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔ باغ و بہار میر امن کی طبع زاد تصنیف نہیں ہے۔ اس کا ماخذ "نوطرز مرصع" ہے جسے میر محمد حسین عطا خاں تحسین نے فارسی "قصۂ چہار درویش" سے اردو میں ترجمہ کیا تھا لیکن اس کی زبان نہایت مشکل تھی۔ میر امن نے اسے آسان، سادہ اور بول چال کی زبان میں تحریر کیا ہے- انھوں نے دہلی کی تہذیب و معاشرت کا جیتا جاگتا مرقع پیش کرتے ہوئے اس داستان کو عام فہم اور سادہ نثر میں لکھا، جس کی مقبولیت آج بھی ہے۔ "باغ و بہار" ایک داستان ہے۔ اس داستان میں چار درویشوں کے قصے ہیں جنھیں روم کے بادشاہ

آزاد بخت نے بند ھن میں باندھ رکھا ہے۔ اس داستان میں چار درویش ہیں جو الگ الگ ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ بادشاہ آزاد بخت کے ملک روم میں ان کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہاں وہ اپنا اپنا قصہ بیان کرتے ہیں۔ اس اکائی میں "قصہ حاتم طائی" کو پیش کیا گیا ہے جو "سیر دوسرے درویش کی" یعنی دوسرے درویش کے قصے سے لیا گیا ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل کہا جاچکا ہے کہ قصہ حاتم طائی باغ و بہار کی داستان میں دوسرے درویش کی سیر سے لیا گیا ہے۔ دوسرے درویش کی روداد اس طرح شروع ہوتی ہے۔

1.2.2 "قصّہ حاتم طائی" (متن):

"جب دوسرے دَرویش کے کہنے کی نوبت پہنچی، وہ چار زانو ہو بیٹھا اور بولا:

اے یارو! اِس فقیر کا ٹک ماجرا سنو
میں ابتدا سے کہتا ہوں تا انتہا، سنو!
جس کا علاج کر نہیں سکتا کوئی حکیم
ہے گا ہمارا درد نپٹ لا دوا سنو!

اے دلق پوشو! یہ عاجز، بادشاہ زادہ فارس کے ملک کا ہے۔ ہر فن کے آدمی وہاں پیدا ہوتے ہیں، چناں چہ "اصفہان نصف جہاں" مشہور ہے۔ ہفت اقلیم میں اُس اقلیم کے برابر کوئی ولایت نہیں، کہ وہاں کا ستارہ آفتاب ہے اور وہ، ساتوں کواکب میں، نیر اعظم ہے۔ آب وہوا وہاں کی خوش، اور لوگ روشن طبع اور صاحب سلیقہ ہوتے ہیں۔ میرے قبلہ گاہ نے (جو بادشاہ اُس ملک کے تھے) لڑکپن سے، قاعدے اور قانون سلطنت کے تربیت کرنے کے واسطے، بڑے بڑے دانا استاد ہر ایک علم اور کسب، کے چن کر میری اتالیقی کے لیے مقرر کیے تھے، تو تعلیم کامل ہر نوع کی پا کر قابل ہوں۔ خُدا کے فضل سے چودہ برس کے سن و سال میں سب علم سے ماہر ہوا، گفتگو معقول، نشست و برخاست پسندیدہ، اور جو کچھ بادشاہوں کو لائق اور درکار ہے، سب حاصل کیا اور یہی شوق شب و روز تھا کہ قابلوں کی صحبت میں، قصے ہر ایک ملک کے اور احوال اولوالعزم بادشاہوں اور نام آوروں کا سنا کروں۔

ایک روز ایک مصاحب دانا نے، کہ خوب تواریخ داں اور جہاں دیدہ تھا، مذکور کیا کہ اگرچہ آدمی کی زندگی کا کچھ بھروسا نہیں، لیکن اکثر وصف ایسے ہیں کہ اُن کے سبب سے انسان کا نام قیامت تک زبانوں پر بہ خوبی چلا جائے گا۔ میں نے کہا: اگر تھوڑا سا احوال اُس کا مفصل بیان کرو، تو میں بھی سنوں اور اُس پر عمل کروں۔ تب وہ شخص حاتم طائی کا ماجرا اس طرح سے کہنے لگا کہ:

حاتم کے وقت میں ایک بادشاہ عرب کا نوفل نام تھا؛ اُس کو حاتم کے ساتھ، بہ سبب نام آوری کے، دشمنی کمال ہوئی۔ بہت سا لشکر، فوج جمع کر کر لڑائی کی خاطر چڑھ آیا۔ حاتم تو خدا ترس اور نیک مرد تھا؛ یہ سمجھا کہ اگر میں بھی جنگ کی تیاری کروں، تو خدا کے بندے مارے جائیں گے اور بڑی خوں ریزی ہو گی؛ اُس کا عذاب میرے نام لکھا جائے گا۔ یہ بات سوچ کر، تن تنہا اپنی جان لے کر، ایک پہاڑ کی کھوہ میں جا چھپا۔ جب حاتم کے غائب ہونے کی خبر نوفل کو معلوم ہوئی؛ سب اسباب، گھر بار حاتم کا قرق کیا اور منادی کروادی کہ جو کوئی ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر پکڑ لاوے، پان سے اشرفی بادشاہ کی سرکار سے اِنعام پاوے۔ یہ سن کر سب کو لالچ آیا اور جستجو حاتم کی کرنے لگے۔

ایک روز ایک بوڑھا اور اُس کی بُڑھیا، دو تین بچے چھوٹے چھوٹے ساتھ لیے ہوئے، لکڑیاں توڑنے کے واسطے اُس غار کے پاس، جہاں حاتم پوشیدہ تھا، پہنچے اور لکڑیاں اُس جنگل سے چننے لگے۔ بڑھیا بولی کہ اگر ہمارے دن کچھ بھلے آتے، تو حاتم کو کہیں ہم دیکھ پاتے اور اُس کو پکڑ کر نوفل کے پاس لے جاتے، تو وہ پانچ سو اشرفی دیتا؛ ہم آرام سے کھاتے، اس دکھ دھندے سے چھوٹ جاتے۔ بوڑھے نے کہا: کیا ٹر ٹر کرتی ہے! ہمارے طالع میں یہی لکھا ہے کہ روز لکڑیاں توڑیں اور سر پر دھر کر بازار میں بیچیں، تب لون، روٹی میسر آوے؛ یا ایک روز جنگل سے باگ لے جاوے۔ لے اپنا کام کر۔ ہمارے ہاتھ حاتم کاہے کو آوے گا اور بادشاہ (سے) اتنے روپے دلاوے گا! عورت نے ٹھنڈی سانس بھری اور چپکی ہو رہی۔

یہ دونوں کی باتیں حاتم نے سُنیں؛ مَردُمی اور مُروّت سے بعید جانا کہ اپنے تئیں چھپائے اور جان کو بچائے اور ان دونوں بے چاروں کو مطلب تک نہ پہنچائے۔ سچ ہے: اگر آدمی میں رحم نہیں، تو وہ انسان نہیں اور جس کے جی میں درد نہیں، وہ قصائی ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

غرض حاتم کی جواں مردی نے نہ قبول کیا کہ اپنے کانوں سے سن کر چپکا ہو رہے، وو نہیں باہر نکل آیا اور اُس بوڑھے سے کہا کہ اے عزیز! حاتم میں ہی ہوں، میرے تئیں نوفل کے پاس لے چل۔ وہ مجھے دیکھے گا؛ جو کچھ روپے دینے کا قرار کیا ہے، تجھے دیوے گا۔ پیر مرد نے کہا: سچ ہے اس صورت میں بھلائی اور بہبودی میری البتہ ہے؛ لیکن وہ کیا جانیے تجھ سے کیا سلوک کرے! اگر مار ڈالے، تو میں کیا کروں! یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو سکے گا کہ تجھ سے انسان کو، اپنی طمع کی خاطر، دشمن کے حوالے کروں۔ وہ مال کیے دِن کھاؤں گا اور کب تک جیوں گا! آخر مر جاؤں گا، تب خدا کو کیا جواب دوں گا؟

حاتم نے بہتیری منت کی کہ مجھے لے چل، میں اپنی خوشی سے کہتا ہوں اور ہمیشہ اسی آرزو میں رہتا ہوں کہ میرا جان و مال کسو کے کام آوے تو بہتر ہے؛ لیکن وہ بوڑھا کسو طرح راضی نہ ہوا کہ حاتم کو لے جاوے اور انعام پاوے۔ آخر لاچار ہو کر حاتم نے کہا: اگر تو، مجھے یوں نہیں لے جاتا، تو میں آپ سے آپ بادشاہ پاس جا کر کہتا ہوں کہ اس بوڑھے نے مجھے جنگل میں ایک پہاڑ کی کھوہ میں چھپا رکھا تھا۔ وہ بوڑھا ہنسا اور بولا: بھلائی کے بدلے بُرائی ملے تو یا نصیب! اس رد و بدل کے سوال جواب میں آدمی اور بھی آن پہنچے، بھیڑ لگ گئی۔ اُنھوں نے معلوم کیا کہ حاتم یہی ہے؛ ترت پکڑ لیا اور حاتم کو لے چلے۔ وہ بوڑھا بھی افسوس کرتا ہوا پیچھے پیچھے ساتھ ہو لیا۔ جب نوفل کے روبہ رو لے گئے، اُس نے پوچھا کہ اس کو کون پکڑ لایا؟ ایک بد ذات، سنگ دل بولا کہ ایسا کام سوائے ہمارے کون کر سکتا ہے؟ یہ فتح ہمارے نام ہے، ہم نے عرش پر جھنڈا گاڑا ہے۔ ایک اور لن ترانی والا ڈینگ مارنے لگا کہ میں کئی دن سے دوڑ دھوپ کر جنگل سے پکڑ لایا ہوں۔ میری محنت پر نظر کیجیے اور جو قرار ہے، سو دیجیے۔ اسی طرح، اشرفیوں کے لالچ سے، ہر کوئی کہتا تھا کہ یہ کام مجھ سے ہوا۔ وہ بوڑھا چپکا ایک کونے میں لگا ہوا، سب کی شیخیاں سُن رہا تھا اور حاتم کی خاطر کھڑا روتا تھا۔

جب اپنی اپنی دلاوری اور مردانگی سب کہہ چکے، تب حاتم نے بادشاہ سے کہا: اگر سچ بات پوچھو تو یہ ہے کہ وہ بوڑھا، جو الگ سب سے کھڑا ہے، مجھ کو لایا ہے۔ اگر قیافہ پہچان جانتے ہو، تو دریافت کرو اور میرے پکڑنے کی خاطر جو قبول کیا ہے، پورا کرو؛ کہ سارے ڈیل

میں زبان حلال ہے۔ مرد کو چاہیے، جو کہے، سو کرے، نہیں تو جیبھ حیوان کو بھی خدا نے دی ہے، پھر حیوان اور انسان میں کیا تفاوت ہے !نوفل نے اُس لکڑہارے بوڑھے کو پاس بلا کر پوچھا کہ سچ کہہ اصل کیا ہے؟ حاتم کو کون پکڑ لایا؟ اُس بیچارے نے، سر سے پانو تک جو گزرا تھا، راست کہہ سنایا اور کہا: حاتم میری خاطر آپ سے آپ چلا آیا ہے۔ نوفل یہ ہمت حاتم کی سُن کر متعجب ہوا کہ بل بے تیری سخاوت! اپنی جان کا بھی خطرہ نہ کیا! جتنے جھوٹھ دعوے حاتم کے پکڑ لانے کے کرتے تھے، حکم کیا کہ ان کی ٹنڈیاں کس کر؛ پان سو اشرفی کے بدلے، پان پان سے جوتیاں ان کے سر پر لگاؤ، کہ ان کی بھی جان نکل پڑے۔ وونہیں تڑتڑ پیزاریں پڑنے لگیں، کہ ایک دم میں سر اُن کے گنجے ہو گئے۔ سچ ہے: جھوٹھ بولنا ایسا ہی گناہ ہے کہ کوئی گناہ اُس کو نہیں پہنچتا۔ خُدا سب کو اس بلا سے محفوظ رکھے اور جھوٹھ بولنے کا چسکا نہ دے۔ بہت آدمی جھوٹھ موٹھ بکے جاتے ہیں لیکن آزمایش کے وقت سزا پاتے ہیں۔

غرض اُن سب کو موافق اُن کے انعام دے کر، نوفل نے اپنے دل میں خیال کیا کہ حاتم سے شخص سے (کہ ایک عالم کو اُس سے فیض پہنچتا ہے، اور محتاجوں کی خاطر، جان اپنی دریغ نہیں کرتا، اور خُدا کی راہ میں سرتاپا حاضر ہے) دشمنی رکھنی اور اُس کا مدعی ہونا مرد آدمیت اور جواں مردی سے بعید ہے۔ وونہیں حاتم کا ہاتھ بڑی دوستی اور گرم جوشی سے پکڑ لیا اور کہا: کیوں نہ ہو؛ جب ایسے ہو، تب ایسے ہو۔ تواضع، تعظیم کر کر پاس بٹھلایا اور حاتم کا ملک و املاک اور مال و اسباب جو کچھ ضبط کیا تھا، وونہیں چھوڑ دیا۔ نئے سر سے سرداری قبیلۂ طے کی اُسے دی۔ اور اُس بوڑھے کو پانچ سو اشرفیاں اپنے خزانے سے دلوا دیں۔ وہ دُعا دیتا ہوا چلا گیا۔

1.2.3 خلاصہ:

میر امن دہلوی کی "باغ و بہار" اردو کی مشہور و معروف داستان ہے۔ جو انہوں نے فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی فرمائش پر لکھی۔ "باغ و بہار" پہلی بار 1804ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوئی۔

داستان "باغ و بہار" میں میر امن نے 'دوسرے درویش کی سیر' کے ضمن میں "حاتم طائی کا قصہ" بیان کیا ہے۔ دوسرے درویش کا وطن فارس تھا۔ وہ ملک فارس کے بادشاہ کا بیٹا تھا۔ دوسرا درویش کہتا ہے کہ اس کے والد نے اس کی تربیت کے لیے ہر علم و فن کے بہترین استاد مقرر کیے تھے۔ اور وہ چودہ برس میں تمام علوم و فنون میں ماہر ہو گیا تھا۔ بادشاہوں کے لائق اور درکار تمام اوصاف جیسے گفتگو کا سلیقہ، نشست و برخاست، پسندیدہ آداب وغیرہ سب حاصل کیا تھا۔ اسے سب سے زیادہ شوق اس بات کا تھا کہ باصلاحیت اشخاص کی صحبت میں بیٹھے اور ان سے ہر ایک ملک کے احوال اور نامور اور بلند حوصلہ بادشاہوں کے قصے سنے۔

ایک دن بادشاہ کے ایک مصاحب نے جو بڑا عقلمند، تاریخ سے واقف اور تجربہ کار تھا۔ کہا کہ آدمی کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، لیکن کچھ ایسے وصف ہوتے ہیں جن کی وجہ سے قیامت تک انسان کا نام زندہ رہ جاتا ہے۔ شہزادے نے کہا، یہ بات تفصیل سے بیان کیجیے، تاکہ میں بھی اس سے کچھ سیکھوں اور اس پر عمل کروں۔ تب وہ مصاحب اسے حاتم طائی کی زندگی کا ایک قصہ سناتا ہے۔

حاتم طائی اپنے زمانے میں اپنی بے پناہ سخاوت، ہمدردی اور رحم دلی کے سبب بڑا مقبول تھا۔ اس کے زمانے میں عرب کا ایک بادشاہ نوفل تھا۔ حاتم کی شہرت کے سبب وہ اس سے دشمنی کرنے لگا۔ اس نے حاتم طائی کو نقصان پہنچانے کے لیے بڑا سا لشکر لے کر اس کے ملک پر

حملہ کر دیا۔ حاتم طائی تو خدا ترس اور رحم دل تھا اس نے یہ اطلاع پا کر سوچا کہ اگر میں بھی جنگ کی تیاری کروں، تو بہت سے بے گناہ مارے جائیں گے اور بڑی خوں ریزی و غارت گری ہو گی اس لیے وہ جنگل کے ایک غار میں چھپ گیا کہ اس کی وجہ سے لڑائی جھگڑا نہ ہو۔ جب حاتم کے غائب ہونے کی خبر بادشاہ نوفل کو ہوئی تو اس نے حاتم طائی کی ساری دولت پر قبضہ کر لیا اور اعلان کیا کہ جو کوئی حاتم طائی کو ڈھونڈ کر اس کے روبرو پیش کرے گا اسے پانچ سو اشرفی انعام میں دی جائیں گی۔ اشرفیوں کے لالچ میں سب حاتم طائی کو تلاش کرنے لگے۔

ایک دن ایک بوڑھا، اس کی بڑھیا (بیوی) اور ان کے دو تین بچے اس غار کے قریب پہنچ کر لکڑیاں چن رہے تھے جہاں حاتم طائی چھپا ہوا تھا۔ بڑھیا کہتی ہے کہ اگر حاتم طائی ہمیں مل جائے تو ہمیں پانچ سو اشرفیاں ملیں گی اور ہماری غریبی دور ہو گی۔ بوڑھا اپنی بیوی (بڑھیا) سے کہتا ہے کہ ہماری قسمت میں تو یہی لکھا ہے یا ایک دن جنگل میں شیر ہمیں مار کر کھا جائے۔

جب حاتم طائی نے غار میں چھپ کر ان کی گفتگو سنی، حاتم طائی ویسے ہی سخی اور رحم دل انسان تھا، اس غریب خاندان کی پریشانی دیکھ کر وہ غار سے باہر نکل آیا اور ان کے سامنے اپنی حقیقت بیان کر دی کہ میں وہی حاتم طائی ہوں۔ مجھے بادشاہ کے روبرو پیش کر دو اور اپنا انعام پا کر اپنی غربت دور کر لو۔ حاتم طائی کی یہ سخاوت دیکھ کر بوڑھے کو رحم آیا اور اس نے کہا کہ چند سو اشرفیوں کی خاطر ہم تمہاری جان جوکھم میں نہیں ڈال سکتے۔ حاتم طائی اصرار کرتا رہا کہ مجھے لے چلو، مگر وہ نہ مانا۔ آخر حاتم طائی نے کہا، میں خود نوفل کے پاس جا کر کہوں گا کہ اس بوڑھے نے مجھے غار میں چھپا رکھا تھا۔ بوڑھا ہنس کر کہتا ہے بھلائی کے بدلے برائی ملے تو سمجھوں گا یہی میری قسمت میں تھا۔ یہ تکرار سن کر اور کچھ لوگ وہاں جمع ہو گئے اور حاتم طائی کو پہچان کر اسے بادشاہ کے روبرو لے گئے۔

بادشاہ نوفل کے دربار میں پہنچ کر ہر ایک نے دعویٰ کیا کہ اسے میں نے پکڑا ہے۔ بوڑھا چپ کونے میں بیٹھا تھا۔ یہ ماجرا دیکھ کر حاتم طائی نے بادشاہ سے کہا کہ سب سے پہلے اس بوڑھے شخص نے مجھے دیکھا ہے اسے انعام دیا جائے۔ بوڑھے نے بادشاہ سے سارا ماجرا سنایا اور کہا کہ ہماری باتیں سن کر خود حاتم طائی باہر آیا تھا۔ نوفل نے اس بوڑھے کو پانچ سو اشرفیاں انعام دیں، وہ دعا دیتا ہوا چلا گیا اور جن لوگوں نے جھوٹ بولا تھا ان کے سروں پر اتنی جوتیاں لگوائیں کہ سب کے سر گنجے ہو گئے۔

نوفل نے دیکھا کہ حاتم ایسا نیک اور بہادر ہے کہ دوسروں کی مدد کے لیے اپنی جان تک دینے سے نہیں کتراتا۔ ایسے آدمی سے دشمنی کرنا بری بات ہے۔ یہ سوچ کر حاتم طائی سے دوستی کی، اسے اپنے پاس بٹھایا اور اس کا ملک اسے لوٹا دیا۔

"باغ و بہار" کے اس انتخاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں زندگی کی اعلیٰ اور مثبت قدریں عام تھیں۔ حاتم طائی ویسے ہی اپنی سخاوت کے لیے ساری دنیا میں مشہور تھا۔ شہزادے (دوسرے درویش) نے حاتم طائی کی دریا دلی کا یہ قصہ سنا تو اسے بڑی غیرت آئی، اس نے اپنے جی میں ٹھانی کہ اسے بھی ایسا کچھ کام کرنا چاہیے کہ وہ بھی دنیا میں مقبول اور زندہ جاوید ہو جائے۔ اس نے سوچا کہ دنیا میں سخاوت سے بڑا کوئی کام نہیں۔ چنانچہ اس نے ایک عالی شان مکان تعمیر کروایا اور اس میں بیٹھ کر صبح سے شام تک غریبوں، ضرورت مندوں اور بے کسوں میں روپے اور اشرفیاں تقسیم کرنے لگا۔

1.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- داستان طویل کہانی کو کہتے ہیں جس میں حیرت انگیز واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔
- اردو میں داستان نگاری کا آغاز دکن میں ہوا۔
- اردو کی پہلی داستان ملا وجہی کی "سب رس" ہے
- شمالی ہند کی پہلی داستان "قصہ مہر افروز و دلبر" ہے جو عیسوی خاں بہادر کی تصنیف ہے۔
- فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) میں اردو کی بہت سی داستانیں نے لکھی گئیں۔
- فورٹ ولیم کالج کی سب سے مشہور داستان "باغ و بہار" ہے۔ جس کے مصنف میر امن ہیں۔
- میر امن دہلی کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے 1802 میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر "باغ و بہار" لکھی۔
- اس کا قصہ میر امن نے میر محمد حسین عطا خان تحسین کی تصنیف "نو طرز مرصع" سے لیا ہے۔
- باغ و بہار میں چار درویشوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔
- باغ و بہار کے دوسرے درویش کی داستان میں حاتم طائی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔
- حاتم طائی نہایت نیک اور سخی انسان تھا۔ اس کی شہرت سے حسد کر کے بادشاہ نوفل نے اس پر حملہ کیا۔
- لوگوں کو جنگ اور قتل و خون سے بچانے کے لیے حاتم ایک غار میں چھپ گیا۔ نوفل نے اس کی گرفتاری پہ انعام مقرر کیا۔
- ایک بوڑھے لکڑہاڑے کی غربت پر ترس کھا کر حاتم نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کیا تا کہ وہ انعام حاصل کر سکے
- وہاں کئی لوگ جمع ہو گئے اور حاتم کو پکڑ کر نوفل کے پاس لے گئے۔ ہر شخص انعام کا دعویدار تھا۔
- حاتم نے بتایا کہ یہ سب جھوٹ ہے مجھے سب سے پہلے اس بوڑھے لکڑہارے نے دیکھا تھا۔
- بوڑھے نے بتایا کہ حاتم اپنی خوشی سے گرفتار ہوا ہے تا کہ مجھ غریب کو انعام مل سکے۔
- نوفل نے جھوٹے دعویداروں کو سزا اور بوڑھے کو انعام دیا۔
- وہ حاتم کی نیکی اور ایثار سے بے حد متاثر ہوا اور اسے اپنا دوست بنالیا۔

1.4 مشکل الفاظ

نام آوری	شہرت	Fame, Renown
خداترس	رحم دل	God-fearing, Pious
خوں ریزی	قتل و غارت گری	Bloodshed

قرق	ضبطی، جو شئے حاکم کی ضبطی میں آجائے	Confiscated, Restricted
منادی	ڈھنڈورا پیٹنا، اعلان	Proclamation, Announcement
طالع	قسمت، نصیب، مقدر	Fate, Fortune
باگھ	شیر	Tiger
مردمی	بہادری، مروت، انسانیت	Humanity, Humbleness
کروبیاں	فرشتے	Angels
دونہیں	اسی وقت، فوراً	Without doubt, Certainly
پیرمرد	بوڑھا مرد	Old man
ترت	فوراً	Immediately, At once
سنگ دل	پتھر دل	Hard-hearted, Cruel
دلاوری	ہمت، بہادری، شجاعت	Bravery, Valor
قیافہ	چہرہ دیکھ کر حال معلوم کرنا	Appearance, Look
تفاوت	فرق	Difference, Distinction
ٹنڈیاں	مجرم کے دونوں بازوؤں (یا ہاتھوں) کو جکڑنا	Branches (cut ones)
پیزاریں	جوتیاں (پیزار کی جمع)	Shoes, Footwear
دریغ	افسوس، غم	Reluctance, Hesitation
مدعی	دشمن ہونا، مخالفت رکھنا	Claimant, Plaintiff
تواضع	مہمان داری، خاطر مدارت، خوش اخلاقی سے پیش آنا	Hospitality, Humble treatment
املاک	مال اسباب، جائداد (مِلک کی جمع)	Properties, Estates

1.5 مشقیں

مشق 1: متن اور خلاصے کی مدد سے خالی جگہ کو پر کیجیے۔

i. "باغ و بہار".....کی تصنیف ہے۔

ii. حاتم طائی کی مقبولیت سے.....بادشاہ اس سے حسد کرنے لگا۔

iii. دوسرا درویش.....ملک کا شہزادہ تھا۔

iv. حاتم طائی تاریخ میں.....کے لیے بہت مقبول تھا۔

v. حاتم طائی کو سب سے پہلے.....نے دیکھا۔

vi. داستان "باغ و بہار" .....میں لکھی گئی۔

مشق 2: نیچے لکھے ہوئے واحد الفاظ کی جمع تحریر کیجیے۔

واحد		جمع
خوبی	:	.....
فوج	:	.....
پہاڑ	:	.....
ملک	:	.....
اشرفی	:	.....
شخص	:	.....

مشق 3: مندرجہ ذیل مذکر کے مونث اور مونث کے مذکر لکھیے۔

بادشاہ	:	.....
رانی	:	.....
مرد	:	.....
بوڑھا	:	.....
بچارے	:	.....
لڑکا	:	.....
فقیر	:	.....
گائے	:	.....
بکری	:	.....

مشق 4: درست املا کے گرد دائرہ لگائیں۔

واصطے	واسطے	واستے
ضبط	زبط	ضبت

بھروثا	بہروصا	بھروسا
سخاوط	سخاوت	صقاوت
خاطر	قاطر	خاتر

مشق 5: نیچے دیئے گئے جملوں میں صحیح الفاظ کا انتخاب کیجیے۔

1) سچ ہے اس.....میں بھلائی اور بہبودی میری البتہ ہے۔ (سورت، صورت)
2) وہ بوڑھا بھی افسوس کرتا ہوا پیچھے پیچھے.....ہو لیا۔ (سات، ساتھ)
3) فوج.....کر کر لڑائی کی خاطر چڑھ آیا۔ (جمع، جما)
4) وو نہیں تڑتڑ پیزاریں.....لگیں۔ (پڑنے، پڑھنے)
5) جب حاتم کے غائب ہونے کی.....نوفل کو معلوم ہوئی۔ (خبر، قبر)

1.6 نمونہ امتحانی سوالات

1.6.1 معروضی سوالات:

1۔ اردو میں داستان کی ابتدا کہاں ہوئی؟

(a)دہلی (b)لکھنؤ (c)دکن (d)کلکتہ

2۔ اردو کی پہلی داستان کون سی ہے؟

(a)الف لیلہ (b)پنچ تنتر (c)لیلیٰ مجنوں (d)سب رس

3۔ فورٹ ولیم کالج کہاں قائم کیا گیا تھا؟

(a) دہلی (b)کلکتہ (c)مدراس (d)حیدرآباد

4۔ میر امن کی جاگیر کس نے ضبط کر لی؟

(a)اورنگ زیب (b)نادر شاہ درانی (c)احمد شاہ ابدالی (d)سورج جاٹ مل

5۔ "نوطرز مرصع" کس کی تصنیف ہے؟

(a) میر محمد حسین عطا خاں تحسین (b)عیسوی خاں بہادر (c)میر امن (d)بہادر علی حسینی

6۔ روم کے بادشاہ کا کیا نام تھا؟

(a) فیروز بخت (b)آزاد بخت (c)بیدار بخت (d)سکندر بخت

7۔ حاتم طائی کا قصہ کس درویش کی روداد میں شامل ہے؟

(a) پہلے (b)دوسرے (c)تیسرے (d)چوتھے

8۔ دوسرا درویش کس ملک کا شہزادہ تھا؟

(a) فارس (b)فرنگ (c)چین (d)روم

9۔ حاتم پر کس نے حملہ کیا؟

(a) سکندر (b)دارا (c)نوفل (d)جمشید

10۔ حاتم کو پکڑلانے پر نوفل نے کتنا انعام مقرر کیا؟

(a)پانچ سواشرفی (b)چھے سواشرفی (c)سات سواشرفی (d)ہزار اشرفی

1.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. داستان کسے کہتے ہیں؟
2. اردو کی پہلی داستان کون سی ہے اور وہ کہاں لکھی گئی؟
3. میر امن دہلی سے پٹنہ کیوں گئے؟
4. میر امن نے باغ و بہار کس کی فرمائش پر اور کب لکھی؟
5. دوسرا درویش کون تھا؟

1.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. داستان کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں، لکھیے۔
2. میر امن کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔
3. حاتم طائی کا قصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

1.6.1 کے جوابات:

A (v)	D (iv)	B (iii)	D (ii)	C (i)
A (x)	C (ix)	A (viii)	B (vii)	B (vi)

اکائی 2: داستان
(اقتباس: رانی کیتکی کی کہانی)

اکائی کے اجزا

2.0		تمہید
2.1		مقاصد
2.2		رانی کیتکی کی کہانی
	2.2.1	انشااللہ خاں انشاؔ کا تعارف
	2.2.2	انشااللہ خاں انشاؔ کی داستان نگاری
	2.2.3	"رانی کیتکی کی کہانی": متن (اقتباس)
	2.2.4	خلاصہ
2.3		اکتسابی نتائج
2.4		مشکل الفاظ
2.5		مشقیں
2.6		نمونہ امتحانی سوالات

2.0 تمہید

پچھلی اکائی میں آپ نے داستان "باغ و بہار" میں شامل "قصہ حاتم طائی" کے منتخب متن کی قرات کی اور اس کے خلاصے کا مطالعہ کیا۔ ادب میں داستان گوئی کی روایت خاصی قدیم ہے۔ اردو ادب میں اس کی ابتدا ترجمہ شدہ داستانوں سے ہوئی۔ داستانوں کو ترجمہ کرنے یا ان کو آسان زبان میں منتقل کرنے کا کام سب سے پہلے فورٹ ولیم کالج، کلکتہ میں ہوا، جہاں پر عربی، فارسی اور سنسکرت کی کئی اہم داستانوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ جس وقت فورٹ ولیم کالج میں مختلف زبانوں سے اردو میں داستانیں ترجمہ ہو رہی تھیں اسی وقت 'انشااللہ خاں انشاؔ' نے اردو میں ایک طبع زاد داستان "رانی کیتکی کی کہانی" لکھی۔ اس داستان کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ انشا اللہ خاں انشاؔ نے اس میں عربی اور فارسی زبان کے الفاظ سے احتراز کیا ہے اور خالص ہندوستانی الفاظ کا استعمال کر کے "رانی کیتکی کی کہانی" کو مکمل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس داستان کو اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں یکساں اہمیت حاصل ہے۔ اس اکائی میں ہم داستان "رانی کیتکی کی کہانی" کے منتخب متن کی قرات کے ساتھ اس کے خلاصے کا بھی مطالعہ کریں گے۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- انشا اللہ خاں انشاؔ کے حالات زندگی بیان کر سکیں۔
- "رانی کیتکی کی کہانی" کے منتخب متن کی قرات کر سکیں۔
- "رانی کیتکی کی کہانی" کا خلاصہ بیان کر سکیں۔

2.2 رانی کیتکی کی کہانی

"رانی کیتکی کی کہانی" انشا اللہ خاں انشا کے تمام ادبی کارناموں میں سب سے اہم کارنامہ ہے۔ اس کہانی کو لکھنے کے لیے انشاؔ نے باہر کی زبانوں (عربی، فارسی، ترکی وغیرہ) کے الفاظ استعمال کرنے سے احتراز کیا ہے۔ اس طرح کا تجربہ انشاؔ شاعری میں پہلے کر چکے تھے۔ انشاؔ نے ایک مثنوی "مثنوی در لہجہ اردو" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا، جس میں انہوں نے عربی، فارسی اور ترکی کے کسی بھی لفظ کا استعمال نہیں کیا تھا۔ یہ مثنوی 51 اشعار پر مشتمل ہے، جو نامکمل اور ادھوری ہے۔ ایسا لگتا ہے انشاؔ کا یہ تجربہ شاعری میں کامیاب نہ ہو سکا اور انہوں نے نثر میں 'رانی کیتکی کی کہانی' لکھ کر اپنے اس تجربے کو مکمل کیا اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

"رانی کیتکی کی کہانی" کے زمانۂ تصنیف میں محققین کے درمیان اختلاف ہے۔ چوں کہ اس داستان کو ہندی کی پہلی کہانی بھی کہا جاتا ہے اس لیے یہاں ہندی کے محققین کی رائے جاننا بھی ضروری ہے۔ ہندی کے محققین اس کہانی کا سنہ تصنیف الگ الگ بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر چھوی ناتھ ترپاٹھی نے 1803، ڈاکٹر پرمانند سری واستو نے 1800-1810، اور پنڈت رام چندر شکل 1798 سے 1803 کے درمیان قیاس کرتے ہیں، لیکن کسی نے حتمی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اردو کے محققوں نے بالاتفاق اس داستان کا سنہ تصنیف 1803ء مانا ہے۔

2.2.1 انشا اللہ خاں انشاؔ کا تعارف:

انشا اللہ خاں انشاؔ کے آباو اجداد نجف اشرف (عراق) کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا سید نور اللہ خاں ماہر طبیب تھے، جنہیں دہلی کے بادشاہ فرخ سیر نے اپنے علاج کے لیے دہلی بلوایا تھا۔ وہ اپنے فرزند یعنی کہ انشا اللہ خاں انشاؔ کے والد میر ماشا اللہ خاں کے ساتھ ہندوستان آئے اور بادشاہ وقت کا علاج کیا۔ صحت یاب ہونے کے بعد بادشاہ نے نور اللہ خاں کو بہت کچھ نوازا اور وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ سید نور اللہ کے بیٹے میر ماشا اللہ خاں جوانی میں مرشد آباد چلے گئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ ماشا اللہ خاں نے مرشد آباد میں دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی بنگال کے نواب کی بیٹی سے کی، جس کے بطن سے حکیم مسیح اللہ خاں پیدا ہوئے۔ انشا اللہ خاں انشاؔ ان کی دوسری بیوی سے مرشد آباد میں 1752 میں پیدا ہوئے۔ انشا اللہ خاں شجاع الدولہ کے دور حکومت میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے اور جب نواب شجاع الدولہ نے اپنا دارالحکومت فیض آباد منتقل کیا تو وہ بھی اپنے والد میر ماشا اللہ خاں کے ساتھ فیض آباد آ گئے۔

انشا اللہ خاں انشاؔ جس وقت فیض آباد آئے اس وقت ان کی عمر تقریباً نو سال تھی۔ اسی عمر میں صرف و نحو، منطق و حکمت اور عربی و فارسی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ سولہ سال کی عمر میں انشاؔ نے اپنا اردو دیوان مرتب کیا، جس میں کچھ عربی اور فارسی کے اشعار بھی شامل

تھے۔ یہ شجاع الدولہ کا دور تھا۔ شجاع الدولہ کے بیٹے آصف الدولہ نے جب اپنا دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا تو انشا اللہ خاں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آ گئے۔ کچھ دنوں بعد دونوں باپ بیٹے دہلی چلے گئے اور وہاں شاہ عالم کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ جب دہلی کے حالات خراب ہوئے تو انشا لکھنؤ واپس آ گئے۔ یہاں ان کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے۔ اس کے بعد جب نواب سعادت علی خاں سے ان کی قربت ہوئی تو ان کی زندگی بہت پر سکون اور فراغت میں گزرنے لگی۔ اسی زمانے میں انشاؔ نے اپنے بیشتر تخلیقی کارنامے انجام دیے۔ دریائے لطافت، لطائف السعادت اور رانی کیتکی کی کہانی اسی زمانے کی تصانیف ہیں۔

انشا اللہ خاں انشاؔ ایک تجرباتی ادیب تھے۔ ان تصانیف کے علاوہ دیوان ریختی اور دیوان بے نقط بھی ان کی یادگار ہیں۔ انشا نے تقریباً پینسٹھ (65) سال کی عمر پائی۔ 1233ھ مطابق 1817 میں لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا۔

2.2.2 انشا اللہ خاں انشا کی داستان نگاری:

انشا اللہ خاں انشاؔ نے دو داستانیں لکھیں ہیں، جن کا شمار اردو ادب کی مختصر ترین داستانوں میں ہوتا ہے۔ پہلی داستان "کہانی رانی کیتکی اور اودے بھان کی" ہے۔ اس داستان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں انشا نے خالص مہند الفاظ کا استعمال کیا ہے اور عربی فارسی کے الفاظ سے احتراز کیا ہے۔ باوجود اس کے اس داستان میں داستان کے تمام عناصر بہ خوبی موجود ہیں۔ اس میں عشق کی داستان ہے۔ راجہ، رانی ،راج کمار اور راجکماری بھی ہیں۔ بھبھوت کا بھی ذکر ہے، جس کو آنکھ میں لگانے سے انسان سب کچھ دیکھ سکتا ہے، لیکن اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اس میں جنگ بھی ہے اور مافوق فطری عناصر بھی ہیں۔ پریاں بھی ہیں اور رقص اور موسیقی کا جشن بھی ہے۔ حتیٰ کہ ایک کامیاب داستان میں جو عناصر درکار ہوتے ہیں وہ تمام عناصر اس میں خوبی کے ساتھ موجود ہیں۔

انشا اللہ خاں انشاؔ کی دوسری داستان "سلک گہر" ہے۔ 'رانی کیتکی کی کہانی' کی طرح اس داستان میں بھی انشا نے ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ اس داستان کی خاصیت یہ ہے کہ یہ داستان غیر منقوط ہے، یعنی کہ پوری داستان میں نقطے والے حروف کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اردو میں سلک گہر بے نقط نثر کا پہلا نمونہ ہے۔

2.2.3 "رانی کیتکی کی کہانی": متن (اقتباس)

(i)

کسی دیس میں کسی راجا کے گھر ایک بیٹا تھا۔ اوسے اوس کے ما، باپ اور سب گھر کے لوگ کنور اودے بھان کر کے پکارتے تھے۔ سچ مچ اوس کے جوبن کی جوت میں سورج کی ایک سوت آملی تھی۔ اوس کا اچھا پن اور بھلا لگنا کچھ ایسا نہ تھا جو کسی کے لکھنے اور کہنے میں آ سکے۔ پندرہ برد بھر کے اونّے سولھوے میں پاؤں رکھا تھا۔ کچھ یوں ھیں سی اس کی مسیں بھیگتی چلیں تھیں۔ اکڑ تکڑ، اوس میں بہت سی سمارھی تھی۔ کسی کو کچھ نہ سمجھتا تھا۔ پر کسی بات کی لوچ کا گھر گھاٹ پایا نہ تھا اور چاہ کی ندی کا پاٹ اونّے دیکھا نہ تھا۔

ایک دن ہریالی، دیکھنے کو اپنے گھوڑے پر چڑھ کے اپنے اوسی اٹھکھیل اور الڑھ پن کے ساتھ دیکھتا بھالرتا چلا جاتا تھا۔ اتنے میں ایک ہرنی جو اوس کے سامھنے آئی تو اوس کا جی لوٹ پوٹ ھوا۔ اوس ھرنی کے پیچھے سب کو چھوڑ چھاڑ کر گھوڑا پھینکا۔ کوئی گھوڑا اوس کو پا سکتا

تھا؟ جب سورج چھپ گیا اور ہرنی آنکھوں سے اوجھل ہوئی، تب تو یہ کنور اودے بھان بھوکھا، پیاسا اور اوداسا جمائیاں اور انگڑائیاں لیتا ہکا بکا ہو کے آسر اڈھونڈھنے۔ اتنے میں کچھ امریاں دھیان چڑھیں۔ اودھر چل نکلا تو کیا دیکھتا ہے چالیس پچاس رنڈیاں، ایک سے ایک جوبن میں اگلی، جھولا ڈالے ہوئے پڑی جھول رہی ہیں اور ساون گاتیاں ہیں۔ جو اونہوں نے اوس کو دیکھا "تو کون، تو کون" کر چنگھاڑ سی پڑ گئی۔ اون سبھوں میں ایک کے ساتھ اوس کی آنکھ لڑ گئی۔

(ii)

کنور اودے بھان اپنے گھوڑے کی پیٹھ لگ کر اپنے لوگوں سے مل کر اپنے گھر پہنچے۔ کنور جی کا انوپ روپ کیا کہوں کچھ کہنے میں نہیں آتا، نہ کھانا نہ پینا، نہ لگ چلنا، نہ کسی سے کچھ کہنا نہ سننا۔ جس دھیان میں تھے، اس میں گوتھے رہنا اور گھڑی کچھ کچھ سوچ سوچ سر دھنا۔

ہوتے ہوتے اس بات کا لوگوں میں چرچہ پھیل گیا۔ کسی کسی نے مہاراج اور مہارانی سے بھی کہا۔ کچھ دال میں کالا ہے۔ وہ کنور اودے بھان جس سے تمہارے گھر کا اجالا ہے، ان دنوں کچھ اوس کے برے تیور اور بے ڈول آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔ گھر سے باہر تو پاؤں نہیں دھرتا۔ گھر والیاں جو کسی ڈول سے کبھی بہلاتی ہیں تو اور کچھ نہیں کرتا، ایک اونچی سانس لیتا ہے اور جو بہت کسی نے چھیڑا تو چھپر کھٹ پا جاگے اپنا مونہ لپیٹ کے آٹھ آٹھ آنسو پڑا روتا ہے۔ یہ سنتے ہی ما، باپ دونوں کنور کے پاس دوڑ آئے۔ گلے لگایا، مونہہ چوما، بانو پر بیٹے کے گر پڑے، ہاتھ جوڑے اور کہا:

"جی کی بات ہے سو کہتے کیوں نہیں؟ کیا دکھ پرا ہے، جو پڑے پڑے کراہتے ہو؟ راج پاٹ جس کو چاہو دے دالو۔ کہو تم کیا چاہتے ہو؟ تمہارا جی کیوں نہیں لگتا؟ بھلا وہ کیا ہے کیا جو ہو نہیں سکتا۔ مونہہ سے بولو، جی کھولو، جو کہنے میں کچھ سوچتے ہو ابھی لکھ بھیجو۔ جو کچھ لکھو گے، جوں کی توں وہیں کر تمہیں دے جاویں گے۔ جو تم کہوں کنویں میں گر پڑو، تو ہم دونوں ابھی گر پڑتے ہیں۔ جو کہو سر کاٹ ڈالو، تو ابھی سر کاٹ ڈالتے ہیں۔"

کنور اودے بھان جو وہ بولتے ہی نہ تھے، اونہوں نے لکھ بھیجنے کا آسرا پا کے اتنا بولے:

"اچھا آپ سدھاریے۔ ہاں میں لکھ بھیجتا ہوں۔ پر میرے اوس لکھ بھیجنے کو میرے مونہہ پر کسی ڈھب سے نہ لانا۔ نہیں تو میں شرماؤں گا۔ اسی لیے مکھ بات ہو کے میں کچھ نہ کہا۔"

اور یہ لکھ بھیجا:

"اب جو میرا جی ناک میں آ گیا اور کسی ڈھب نہ رہا گیا اور آپ نے مجھے سو سو روپ سے کھولا اور بہت سا ٹٹولا، تب تو لاج چھوڑ کے ہاتھ جوڑ کے مونہہ کو پھوڑ کے گتھیائے لکھتا ہوں۔"

وہ اوس دن جو میں ہریالی دیکھنے کو گیا تھا، وہاں جو میرے سامنے ایک ہرنی کنوتیاں اوٹھائے ہوئے ہولی تھی، اوس کے پیچھے میں نے گھوڑا بگ چھٹ پھینکا۔ جب تک اوجالا رہا اوسی کی دھن میں پھینکا کیا۔ جب اندھیرا ہو گیا اور سورج ڈوبا، جی میرا بہت اوداس ہوا۔ امریاں تک میں اون میں گیا، تو اون امریوں کا پتا پتا میرے جی کا گاہک ہوا۔ وہاں کا یہ شغلا ہے۔ کچھ رنڈیاں جھولا جھول رہی تھیں۔ اون سب کی سردھری کوئی رانی کتکی، مہاراج جگت پرکاش کی بیٹی ہے۔ اونہوں نے یہ انگوٹھی اونہوں نے لی اور لکھاوٹ بھی لکھ دی۔ سو یہ انگوٹھی اون کی

لکھاوٹ سمیت میرے لکھے ہوئے کے ساتھ پہونچی ہے۔ آپ دیکھ لیجیے اور جس میں بیٹے کا جی رو جائے، وہ کیجیے۔"

(iii)

ایک مالن جس کو پھول کلی کر سب پکارتے تھے، اونّے اوس کنور کی چھٹی کسی پھول پنکھڑی میں لپیٹ سپیٹ کے رانی کینتکی تک پہونچادی۔ رانی نے اوس چھٹی سے آنکھیں ملیں اور مالن کو ایک تھال بھر کے موتی دیے اور اوس چھٹی کی پیٹھ پر اپنے مونہ کی پیک سے یہ لکھا:

"اے میرے جی کے گاہک، جو تو مجھے بوٹی بوٹی کر چیل کوؤں کو دے ڈالے تو بھی میری آنکھوں چین کلیجے سوکھ ہو پر یہ بات بھاگ چلنے کی اچھی نہیں، اس میں ایک باپ دادے کی چٹ لگ جاتی ہے۔ اور جب تک ما، باپ جیسا کچھ ہوتا چلا آیا ہے، اوسی ڈول سے بیٹا بیٹی کو کسی پر ٹپک نہ ماریں اور سر سے کسی کے چیک نہ دیں تب تک یہ ایک جی تو کیا جو کروڑ جی جاتے رہیں، کوئی بات تو ہمیں رچتی نہیں۔"

یہ چھٹی پیک بھری جو کنور تک جا پہنچی ہے، وہ ایک سونے کے ہیرے موتی پکھراج کے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھال نچھاور کر کے لٹا دیتا ہے اور چھٹی سے اوس کی بے کلی چوگنی پچگنی ہو جاتی ہے۔ اوس چھٹی کو اپنے گورے ڈنڈ پر باندھ لیتا ہے۔

.....

جگت پرکاش اپنے گرو کو جو کیلاش پہاڑ پر رہتا تھا، یوں لکھ بھیجتا ہے:

"کچھ ہماری سہائے کیجیے۔۔ مہا کٹھن ہم پتاماروں کو پڑی ہے۔ راجہ سورج بھان کو اب یہاں تک باؤ بھک نے لے لیا ہے، جو انہوں نے ہم سے مہاراجوں سے ناتے کا ڈول کیا ہے۔"

کیلاس پہاڑ اک ڈال چاندی کا ہے۔ اوس پر راجہ جگت پرکاش کا گرو مہندر گر، جس کو اندر لوک سب کہتے تھے، دھیان گیان میں کوئی نوے لاکھ اتیتوں کے ساتھ ٹھاکر کے بھجن میں دن رات رہا کرتا۔ سونا، تانبے، رانگے کا بنایا اور گٹکا مونہہ میں لے کے اور ٹا۔ ورے رہے، اوس کو اور باتیں اِس اِس ڈھب کی دھیان میں تھیں جو کچھ کہنے اور سننے سے باہر ہیں۔ مینہ سونے روپے کا پرساد دیتا اور جس روپ میں چاہتا ہو جاتا۔ سب کچھ اوس کے آگے ایک کھیل تھا۔ اور گانے میں اور بین بجانے میں مہادیوی جھٹ، سب اوس کے آگے کان پکڑتے تھے۔ سُرستی جس کو پنڈو کہتے ہیں اون نے بھی اسی سے کچھ گنگنانا سیکھا تھا۔ اوس کے سامنے چھ راگ، چھتیس راگنیاں، آٹھ بہروپ مدھوں کا سادھرے ہوئے، اوس کی سیوا میں ہاتھ جوڑے کھڑی رہتی تھیں۔ وہاں اتیتوں کو یہ کہہ کر پکارتے تھے۔ پھیروں گر، بھبھاس گر، ہنڈولی گر میگھ ناتھ، کدارناتھ، دیپک داس، جوتی سروپ، داس سارنگ روپ اور اتیتاں اس ڈھب سے کہلاتی تھیں۔

(iv)

وہ اوڑن کھٹولے والیاں جو ادھر میں چھت باندھے ہوئے تھرک رہی تھیں، بھر بھر جھولیاں اور مٹھائیاں، ہیرے اور موتیوں سے نچھاور کرنے کے لیے اوتر آئیاں اور اوڑن کھٹولے جیوں کے تیوں ادھر میں چھت باندھے ہوئے کھڑے رہے۔ دولھا دولھن پر سے سات سات واری پھیر ہونے میں پس پس گئیاں اور اون سبھوں کو ایک چکی سی لگ گئی۔

راجا اندر نے دولھن کی مونہ دکھائی میں ایک ہیرے کا اکڈال چھپر کھٹ اور ایک پیڑھی پکھراج کی دی اور ایک پار جات کا پودھا جس سے جو پھل مانگیے سو ہی ملے۔ دولھن کے سامھنے لگا دیا اور ایک کام دھین گائے کی پٹھیا بھی اوس کے نیچے باندھ دی۔ اور اکیس لونڈیاں

انھیں اورں کھٹولے والیوں میں سے چن کے اچھی سے اچھی، ستھری سے ستھری، گاتی بجاتیاں، سیتی پروتیاں، سگھڑ سے سگھڑ سے، سونپیں اور انھیں کہہ دیا"رانی کینتکی چھٹ اون کے دولھا سے کچھ بات چیت نہ رکھیو، تمہارے کان پہلے ہی مروڑ دیتا ہوں۔ نہیں تو سب کی سب پتھر کی مورتیں بن جاؤ گی اور اپنا کیا آپ پاؤ گی۔

اور گسائیں مہندر گر وجی نے باون تولے پاؤرتی جو سنتے ہیں، اوس کے اکیس مٹکے آگے رکھ کے کہا:

"یہ بھی ایک کھیل ہے جب چاہے تو بہت سا تانبا گلا کے ایک اتنی سی چٹکی چھوڑ دیجے کا۔ کنجن ہوئے گا۔"

اور جوگی نے یہ سبھوں سے کہہ دیا:

"جو لوگ اون کے بیاہ میں جاگے ہیں اون کے گھروں میں چالیس دن چالیس رات سونے کی ٹڈیوں کے روپ میں ہن برسیں اور جب تک جئیں کسی بات کو پھر نہ ترسیں۔"

نولاکھ ننادے گائیں سونے روپے کی سنگوٹیوں کی، جڑاؤ گہنا پہنے ہوئے، گھنگرو جھنجھناتیاں باھنوں کے دان ہوئیں اور سات برس کا پیسا سارے راج اک چھوڑ دیا۔ بائیس سے ہاتھی اور چھتیس سے اونٹ لدے ہوئے روپیوں کے لٹا دیے۔ کوئی اوس بھیڑ بھاڑ میں نوراج کا رہنے والا ایسا نہ رہا جس کو گھوڑا جوڑا، روپیوں کا توڑا، سونے کے جڑاؤ کڑوں کی جوڑی نہ ملی ہو۔ اور مدن بان جھٹ دولہ دلہن پاس کسی کا ہواؤ نہ تھا جو بن بلائے چلی جائے، بن بلائے دوڑی آئے تو وہی آئے اور ہنسائے تو وہ ہی ہنسائے۔ رانی کینتکی کے چھیڑنے کو اون کے کنور اودے بھان کو "کنور کنور راجی" کہہ کے پکارتی تھی اور اسی بات کو سو سو روپ سے سنوارتی تھی۔

2.2.4 خلاصہ:

کنور اودے بھان کسی دیس کے راجا سورج بھان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ جب سولہ برس کا ہوا تو ایک دن گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ سیر کے لیے نکلا۔ راستے میں اسے ایک ہرنی دکھائی دی۔ کنور اودے بھان نے اس ہرنی کے پیچھے اپنا گھوڑا دوڑا دیا اور اپنے ساتھیوں سے الگ ہو گیا۔ کنور اودے بھان ہرنی کا پیچھا کرتا رہا اور اسے وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ آخر کار شام ہو گئی۔ کنور اودے بھان بھوکا پیاسا ٹھہرنے کی جگہ تلاش کرنے لگا۔ اچانک اسے ایک باغ نظر آتا ہے۔ وہاں چالیس پچاس لڑکیاں جھول رہی تھیں۔ وہ رانی کینتکی اور اس کی سہیلیاں تھیں۔ کنور کو دیکھتے ہی وہ گھبرا گئیں۔ ہر طرف "تو کون، تو کون" کا شور مچ گیا۔ کنور اودے بھان اور 'رانی کینتکی' کی نگاہیں ملیں اور نگاہیں ملتے ہی دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے، لیکن سہیلیوں کو دکھانے کے لیے رانی کینتکی کنور بھان پر برس پڑتی ہے، "اس لگ چلنے کو بھلا کیا کہتے ہیں؟ یک نہ یک جو تم جھٹ سے ٹپک پڑے یہ نہ جانا جو یہاں رنڈیاں اپنی جھول رہی ہیں۔ اجی تم جو اس روپ کے ساتھ بیدھڑک چلے آئے ہو، ٹھنڈی ٹھنڈی چھانہہ چلے جاؤ۔ تب اودے بھان نے مسوس کے ملولا کھا کے کہا کہ اتنی رکھائیاں نہ دیجیے۔ میں سارے دن کا تھکا ہوا ایک پیڑ کی چھانہہ میں اوس کا بچاؤ کر کے پڑ رہوں گا۔ بڑے تڑکے دھوند لکے اٹھ کر جدھر کو منہ پڑے گا چلا جاؤں گا۔" کنور کی ایسی باتیں سن کر رانی کینتکی اسے سناتے ہوئے اپنی سہیلیوں سے بولی، "ان کو کہہ دو جہاں جی چاہے اپنے پڑ رہیں اور جو کچھ کھانے پینے کو مانگیں سو انھیں پہونچا دو۔ گھر آئے کو کسی نے آج تک مار نہیں ڈالا..... پر ہمارے اور ان کے بیچ میں کچھ اوٹ سی کپڑے لتے کی کر دو۔" اتنا آسرا پا کر کنور بھان نے باغ میں ایک پیڑ کے نیچے ڈیرا ڈال تو دیا، لیکن اس کے دل میں رانی کینتکی اتر چکی تھی اس لیے اسے نیند نہیں آئی۔ ادھر رانی

کینتکی بھی بے چین تھی، اسے بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے اپنی سب سے قریبی سہیلی مدن بان کو جگا کر اپنی حالت بتاتی ہے اور اسے اپنے ساتھ لے کر کنور بھان کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ مدن بان اپنے اور رانی کے بارے میں کنور کو بتاتی ہے اور پھر اس سے اس کے بارے میں پوچھتی ہے۔ کنور اپنے بارے میں بہت تفصیل سے انہیں بتاتا ہے۔ اس کے بعد مدن بان کے مشورے سے دونوں انگوٹھیاں بدل لیتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا وعدہ بھی کرتے ہیں۔ صبح کو رانی کینتکی اپنی سہیلیوں کے ساتھ اپنے محل کی طرف چلی جاتی ہے اور کنور اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں کے پاس چلا جاتا ہے۔

کنور بھان اپنے ساتھیوں کے پاس چلا تو جاتا ہے، لیکن ہر وقت اسے رانی کینتکی کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ نہ تو اسے کھانا پینا یاد رہتا ہے اور نہ ہی اسے چین کی نیند آتی ہے۔ دھیرے دھیرے بات مہاراج اور مہارانی تک پہنچ جاتی ہے۔ انہوں نے کنور بھان سے اس بے چینی کی وجہ جاننی چاہی، لیکن وہ مارے شرم کے کچھ نہیں بتاتا۔ آخر کار اس نے اپنے دل کی بات ایک کاغذ پر لکھ کر ساتھ میں رانی کی دی ہوئی انگوٹھی اور اقرار نامہ راجہ کے پاس بھجوا دیتا ہے۔ جب راجہ سورج بھان کو حقیقت کا علم ہوا تو اس نے رانی کینتکی کے والدین کو شادی کا پیغام بھیجوا دیتا ہے، لیکن رانی کے والدین شادی کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ جب یہ خبر راجہ سورج بھان کو ملتی ہے تو وہ جگت پرکاش پر چڑھائی کر دیتا ہے ،دونوں میں گھمسان لڑائی ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران راجہ جگت پرکاش نے اپنے گروجو گی مہندر گرِ کو، جو کیلاش پربت پر رہتے تھے، اپنی پریشانی لکھ بھیجی۔ وہ اپنے نوے لاکھ سپاہیوں کو لے کر آندھی اور طوفان کی طرح آ پہنچتے ہیں اور آتے ہی نہ صرف راجا سورج بھان، رانی لکشمی اور کنور اودے بھان کو بلکہ ان کی تمام فوج کو بھی ہرن بنا دیتے ہیں۔ جاتے جاتے گروجی کچھ بھبھوت دیتے جاتے ہیں۔ بھبھوت کی خوبی یہ ہے کہ اسے آنکھوں میں لگانے والا سب کو دیکھ سکتا ہے، لیکن خود کسی کو نظر نہیں آتا۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد رانی کینتکی کسی طرح اپنی ماں سے وہ بھبھوت حاصل کر لیتی ہے۔ پھر مدن بان کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہے، لیکن اس کا تیور بدلا ہوا دیکھ کر ایک دن چپکے سے بھبھوت آنکھوں میں لگا کر کنور کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔ ادھر اس کے ماں باپ بہت پریشان ہو جاتے ہیں۔ بالآخر مدن بان بھی بھبھوت لگا کر اپنی سہیلی کو ڈھونڈنے نکل پڑتی ہے۔ دونوں سہیلیوں کی ملاقات ایک جنگل میں ہوتی ہے۔ مدن بان رانی کینتکی کو گھر لے آتی ہے۔ راجہ جگت پرکاش بیٹی کی ضد کے آگے ہار مان جاتا ہے اور پھر اپنے گرو کو یاد کرتا ہے۔ گروجی کے بہت تلاش کرنے کے باوجود بھی کنور بھان اور اس کے والدین اسے نہیں ملتے۔ مہندر گرِ اپنے گرو، راجہ اندر سے امداد طلب کرتے ہیں اور ان کی مدد سے کنور اودے بھان، اس کے والدین اور اس کی تمام فوج کو اپنی اصلی صورت میں لے آتے ہیں۔ اندر کنور کو اپنا بیٹا مان لیتا ہے۔ پھر رانی کینتکی اور کنور اودے بھان دونوں کی شادی کر دیتا ہے۔ آخر کار کہانی اس دعا پر ختم ہوتی ہے کہ جیسے ان لوگوں کے دن پھرے اور بچھڑے ہوئے ملے، ویسے ہی ہمارے تمہارے سب کے دن پھریں۔

2.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- انشا اللہ خاں انشاؔ کے آباو اجداد نجف اشرف (عراق) کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا سید نور اللہ خاں ماہر طبیب تھے، جنہیں

دہلی کے بادشاہ فرخ سیر نے اپنے علاج کے لیے دہلی بلوایا تھا۔

- ماشاالله خاں نے مرشد آباد میں دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی بنگال کے نواب کی بیٹی سے کی، جس کے بطن سے حکیم مسیح الله خاں پیدا ہوئے۔ انشاالله خاں انشاؔ ان کی دوسری بیوی سے مرشد آباد میں 1752 میں پیدا ہوئے۔
- انشا الله خاں شجاع الدولہ کے دورِ حکومت میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے اور جب نواب شجاع الدولہ نے اپنا دارالحکومت فیض آباد منتقل کیا تو وہ بھی اپنے والد میر ماشاالله خاں کے ساتھ فیض آباد آ گئے۔
- انشاالله خاں انشاؔ جس وقت فیض آباد آئے اس وقت ان کی عمر تقریباً نو سال تھی۔ اسی عمر میں صرف نحو، منطق و حکمت اور عربی و فارسی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ سولہ سال کی عمر میں انشاؔ نے اپنا اردو دیوان مرتب کیا، جس میں کچھ عربی اور فارسی کے اشعار بھی شامل تھے۔
- انشا نے تقریباً پینسٹھ (65) سال کی عمر پائی۔ ان کا انتقال 1233ھ مطابق 1817 میں لکھنؤ میں ہوا۔
- "رانی کیتکی کی کہانی" کے زمانۂ تصنیف میں محققین کے درمیان اختلاف ہے۔ چوں کہ اس داستان کو ہندی کی بھی پہلی کہانی کہا جاتا ہے اس لیے یہاں پر ہندی کے محققین کی رائے جاننا بھی ضروری ہے۔
- ہندی کے محققین اس کہانی کا سنہ تصنیف الگ الگ بتاتے ہیں۔ اردو کے محققوں نے بالاتفاق اس داستان کی سنہ تصنیف 1803ء مانا ہے۔
- "رانی کیتکی کی کہانی" ایک طبع زاد داستان ہے۔ یہ اس وقت لکھی گئی جب فورٹ ولیم کالج میں بہت زور و شور سے مختلف زبانوں کی قدیم داستانوں کا ترجمہ کیا جا رہا تھا یا پھر ان داستانوں کو اردو کا جامہ پہنایا جا رہا تھا۔
- رانی کیتکی کی کہانی میں قدیم داستانوں کی طرح عشق و محبت ہے، تہذیب و ثقافت ہے، سماج اور سیاست، جنگ و جدل اور رقص و موسیقی کو موضوع بنایا گیا ہے۔

2.4 مشکل الفاظ

طبع زاد	ایجاد کردہ، اپنا لکھا ہوا	Original, Self-composed
احتراز	اجتناب، پرہیز	Avoidance, Caution
مہند	ہندی کا، ہندی بنایا گیا	Henna
آتیاں، جاتیاں	آتیں، جاتیں	Coming and going
متروک	جسے چھوڑ دیا جائے، ترک کردہ	Obsolete, Abandoned
ظرافت	دل لگی، خوش طبعی، خوش مزاجی	Wit, Humour

مہر صداقت	سچائی کی مہر	Seal of truth, Proof of authenticity
دوبالا	دوگنا، بڑھا چڑھا کر	Double, Increased
طرز معاشرت	زندگی گزارنے کا طریقہ	Way of living, Lifestyle
شیر و شکر	ایک جان دو قالب، نہایت اتحاد و اتفاق	Very close, Harmonious
نسخہ	کسی قلمی یا مطبوعہ کتاب کی ایک جلد	Prescription, Formula
تصحیح	صحیح کرنا، غلطی دور کرنا	Correction, Rectification
مشتبہ	جس کی صحت میں شک ہو، غیر یقینی	Doubtful, Suspicious
کل کا پتلا	انسان، کل کا آدمی	Weak and fragile person
ہندی چھٹ	سوائے ہندی کے	Indian holiday/festival leave
نپٹ	بالکل	Absolutely, Completely
روپ	طرح	Form, Appearance
باہر کی بولی	عربی، فارسی، ترکی کے الفاظ	Foreign language
دھیان میں چڑھا	خیال آیا	Came to mind, Remembered
ڈول	طریقہ، ڈھنگ	Bucket
چاؤ	محبت، چاہ	Desire, Interest
انوپ روپ	منفرد خوبصورتی	Unique beauty, Rare form
کان رکھ کے	غور سے	Listen carefully, Pay attention

2.5 مشقیں

مشق 1: دیے گئے لفظوں کو جملے میں استعمال کیجیے۔

1۔ طبع زاد .....

2۔ احتراز .....

3۔ روپ .....

4۔ دوبالا .....

5۔ نسخہ .....

مشق2: دیے گئے جملوں میں صحیح اور غلط کی نشاندہی کیجیے۔

1۔ انشااللہ خاں انشا کی پیدائش مرشد آباد میں ہوئی۔ ( )

2۔ "رانی کیتکی کی کہانی" ایک طبع زاد داستان ہے۔ ( )

3۔ انشا نے تقریباً اسی(80) سال کی عمر پائی تھی۔ ( )

4۔ سلک گوہر انشااللہ خاں انشا کی تصنیف ہے۔ ( )

5۔ داستان "رانی کیتکی کی کہانی" فورٹ ولیم کالج میں لکھی گئی۔ ( )

مشق3: دیے گئے الفاظ کے معنی لکھیے۔

1۔ ہندی چھٹ .....

2۔ کل کا پتلا .....

3۔ باہر کی بولی .....

4۔ دھیان میں چڑھا .....

5۔ کان رکھ کے .....

2.6 نمونہ امتحانی سوالات

2.6.1 معروضی سوالات:

1۔ انشااللہ خاں انشا کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی؟

(a) 1720 (b) 1732 (c) 1742 (d) 1752

2۔ انشااللہ خاں انشا کے والد کا کیا نام تھا؟

(a) ماشااللہ خاں (b) نوراللہ خاں (c) عباداللہ خاں (d) نصراللہ خاں

3۔ انشااللہ خاں انشا کے آباواجداد کہاں کے رہنے والے تھے؟

(a) ایران (b) عراق (c) پاکستان (d) ہندوستان

4۔ انشا نے تقریباً کتنے سال کی عمر پائی؟

(a) 55 سال (b) 60 سال (c) 65 سال (d) 70 سال

5۔ رانی کیتکی کی کہانی کا سنہ تصنیف کس سنہ کو مانا جاتا ہے؟

(a) 1803 (b) 1805 (c) 1800 (d) 1801

6۔ انشانے اپنا اردو دیوان کتنے سال کی عمر میں مرتب کیا؟

(a) 16 سال (b) 18 سال (c) 20 سال (d) 22 سال

7۔ ذیل میں سے رانی کیتکی کی سہیلی کون ہے؟

(a) لکشمی بان (b) سرسوتی بان (c) مدن بان (d) روپ متی

8۔ رانی کیتکی کس کی بیٹی ہے؟

(a) جگت پرکاش (b) سورج بھان (c) مہندر گر (d) اودے بھان

9۔ سلگ گوہر کس کی تصنیف ہے؟

(b) میر امن (b) رجب علی بیگ سرور (c) انشا اللہ خاں انشا (d) ملا وجہی

10۔ انشا اللہ خاں انشا کا انتقال کہاں ہوا؟

(a) مرشد آباد (b) لکھنؤ (c) دہلی (d) ممبئی

2.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ انشا اللہ خاں انشاؔ کا تعارف پیش کیجیے۔

2۔ "رانی کیتکی کی کہانی" کا تعارف پیش کیجیے۔

3۔ "رانی کیتکی کی کہانی" کے زمانہ تصنیف پر روشنی ڈالیے۔

4۔ "رانی کیتکی کی کہانی" کی خوبی بیان کیجیے۔

5۔ سلگ گوہر کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔

2.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ "رانی کیتکی کی کہانی" کا خلاصہ لکھیے۔

2۔ انشا اللہ خاں انشاؔ کی داستان نگاری پر تبصرہ کیجیے۔

3۔ "رانی کیتکی کی کہانی" کے اپنے پسندیدہ کردار کے بارے میں لکھیے۔

2.6.1 کے جوابات:

A (v)	C (iv)	B (iii)	A (ii)	D (i)
B (x)	C (ix)	A (viii)	C (vii)	A (vi)

اکائی 3: ناول

(امراؤ جان ادا: مرزا ہادی رسوآ

اکائی کے اجزا

3.0		تمہید
3.1		مقاصد
3.2		ناول: امراؤ جان ادا (مرزا ہادی رسوآ)
	3.2.1	مرزا ہادی رسوا کا تعارف
	3.2.2	مرزا ہادی رسوا کی ناول نگاری
	3.2.3	امراؤ جان ادا کا قصہ
	3.2.4	امراؤ جان ادا (اقتباس)
	3.2.5	خلاصہ
3.3		اکتسابی نتائج
3.4		مشکل الفاظ
3.5		مشقیں
3.6		نمونۂ امتحانی سوالات

3.0 تمہید

ناول ایک نثری قصہ ہے جس میں پوری ایک زندگی بیان کی جاتی ہے"۔ ناول کے لیے ضروری ہے کہ واقعات کو ایک خاص ترتیب اور سلیقے سے بیان کیا جائے۔ ناول کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ " ناول زندگی کی وسعتوں کا حامل ہے"۔

ناول کے موضوعات بہت وسیع ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو ناول میں بیان نہ ہوا ہو۔ چاہے وہ گزرے ہوئے زمانے کی بات ہو یا حال اور مستقبل کی۔ وقت اور ضرورت کے حساب سے ناول کی قسمیں بھی بنتی گئیں جنہیں ہم "اصلاحی، سماجی، تاریخی، معاشرتی، رومانی اور تہذیبی ناول کہتے ہیں۔

اس اکائی میں آپ مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کا مطالعہ کریں گے۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ناول کی تعریف بیان کر سکیں۔
- مرزا ہادی رسوا کے حالات زندگی پر روشنی ڈال سکیں۔
- ناول امراؤ جان ادا کی کہانی کو سمجھ سکیں۔
- امراؤ جان ادا کے متن کا تجزیہ کر سکیں۔
- امراؤ جان ادا کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کر سکیں۔

3.2 ناول: امراؤ جان ادا (اقتباس)

3.2.1 مرزا ہادی رسوا کا تعارف:

نام محمد ہادی اور تخلص رسوا تھا۔ ان کے والد کا نام مرزا محمد تقی تھا جو بادشاہ اودھ آصف الدولہ کی فوج میں ممتاز عہدے پر فائز تھے۔ ان کے آباؤاجداد مازندران سے ہندوستان تشریف لے آئے تھے۔ کچھ برس تک دہلی میں قیام رہا۔ اس کے بعد مستقل قیام کے لیے لکھنو کا رخ کیا اور اسی شہر کو اپنا مسکن بنایا۔ رسوا اسی لکھنؤ کے ایک محلہ کوچہ آفریں خان میں 1858 میں پیدا ہوئے۔ رواج زمانہ کے مطابق رسوا کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ انہوں نے اپنے والد محمد تقی، محمد یحیٰ اور کمال الدین سے بھی کسب فیض کیا۔ ان کے والد مرزا محمد تقی علمی شوق رکھتے تھے۔ رسوا کو وراثت میں علم وادب سے دلچسپی ملی۔ رسوا ابھی سن بلوغ کو پہونچے ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ یعنی رسوا صرف سولہ سال کے تھے کہ باپ کے سائے سے محروم ہو گئے۔ ترکے میں بڑی جائداد ملی تھی لیکن ماموں نے ان کی کم عمری سے فائدہ اٹھا کر اسے غصب کر لیا۔ 1880 میں رسوا نے پنجاب یونیورسٹی سے فلسفہ میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اعلی تعلیم کے سلسلے میں امریکہ کا سفر کیا۔ امریکہ کی اورینٹل یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ رسوا نے ریاضی، اقلیدس، نجوم، فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے ذاتی شوق کی بنا پر حاصل کی۔

رسوا نے رڑکی سے اورسیر کا امتحان پاس کر کے سب سے پہلے ریلوے میں بحیثیت سرویئر ملازمت کی تھی۔ دورانِ ملازمت کیمیا کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔ علم کیمیا سے ایسی دلی وابستگی ہو گئی کہ ملازمت سے استعفیٰ دے کر لیبارٹری کھولنے کا ارادہ کر لیا۔ کیمیا کے آلات خریدنے کے لیے رقم نہیں تھی تو اپنی کوٹھی کا سامان نیلام کر کے لندن سے آلات منگوائے اور دن رات کیمیا کے تعلق سے تجربات کرنے لگے۔ رسوا علم کیمیا میں اس درجہ منہمک رہا کرتے تھے کہ وہ اپنے کمرے کے باہر بھی کم ہی نکلتے تھے۔ اس شوق کے ساتھ پڑھنے پڑھانے کا کام بھی جاری رکھا۔ مشن اسکول میں فارسی کے مدرس ہو گئے تھے۔ لیکن علم کیمیا کے حصول کے لیے یہ آمدنی ناکافی ہوا کرتی تھی۔ لوہار کے لڑکے کو اس شرط پر پڑھانے لگے کہ حسب ضرورت انہیں لوہار کی بھٹی استعمال کرنے کی اجازت ہو گی۔ اس کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کا حصول بھی جاری رہا۔ ان علوم کے سیکھنے کے ساتھ مختلف زبانیں سیکھنے میں بھی انہیں بڑی مہارت تھی۔ رسوا شاعر بھی تھے شاعری میں مرزا تخلص

کرتے تھے اور رسوا کے قلمی نام سے ناول لکھتے تھے۔ رسوا ابتدا میں مرزا دبیر سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ رسوا کو موسیقی کا بھی شوق تھا، چنانچہ رسوا نے تین سو کے قریب راگ راگنیوں کے لیے علامات مقرر کیے تھے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے "انتخاب مرزا ہادی رسوا" میں لکھا ہے کہ وہ دو بار حیدرآباد آئے تھے۔ ایک بار "لمبی چھٹی" پر حیدرآباد آئے تھے۔ پھر واپس چلے گئے۔ رسوا نے حکومت آگرہ اور اودھ کی فرمائش پر اردو شارٹ ہینڈ کے بارے میں ایک مفید کتاب مرتب کی تھی جو 1919 میں شائع ہوئی تھی۔ رسوا نے اردو ٹائپ رائٹر کے "کی بورڈ" کے سلسلے میں بھی بہت کام کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق انہوں نے دو رسالے بھی جاری کیے تھے۔ پہلے "الحکم" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اور اس کے بند ہونے کے بعد "جن" کے نام سے بھی ایک رسالہ نکالا۔ 1917ء میں حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی یہ ہندوستان کی پہلی یونیورسٹی تھی جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ اس یونیورسٹی کے لیے ایک دارالترجمہ بھی قایم کیا گیا۔ اس دارالترجمے سے ہندوستان بھر کے چوٹی کے اہل قلم وابستہ ہوئے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں بہ حیثیت مترجم چار سو روپئے پر رسوا کا تقرر 1917 میں ہوا تھا جہاں رسوا نے 12 سال ترجمے کے فرائض انجام دیے۔ انہوں نے کئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ رسوا مستقل طور پر حیدرآباد میں رہنے لگے۔ رسوا کا انتقال یہیں حیدرآباد میں 1931 میں ہوا اور مرلی دھر باغ حیدرآباد کے مشہور قبرستان میں دفن کیے گئے۔

3.2.2 مرزا ہادی رسوا کی ناول نگاری:

اردو ناول نگاری کی تاریخ میں مرزا محمد ہادی رسوا کی شخصیت ایک ایسا سنگ میل ہے جہاں سے ماضی اور مستقبل کی منزلیں متعین ہوتی ہیں۔ رسوا سے پہلے اردو ناول اپنی زندگی کی ابتدائی منازل طے کر رہا تھا۔ رسوا پہلے ناول نگار ہیں جنہوں نے اردو ادب کو فکشن کی ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔ رسوا پہلے ناول نگار ہیں جنہوں نے اردو ناول کو تفکر اور تدبر کی دولت سے مالامال کرنے کے ساتھ ساتھ اسے زندگی کی صحیح ترنہج پر گامزن کیا۔

رسوا بنیادی طور پر ایک فلسفی تھے۔ علم نجوم اور ان کی ریاض دانی دراصل ان کے فلسفے کا شاخسانہ ہے۔ ترتیب، تنوع اور تکمیل رسوا کے فن کا خاصہ ہے۔ کیوں کہ یہ تینوں عناصر فلسفہ اور ریاضی کے ملاپ سے جنم لیتے ہیں۔ ان کے ہاں غزل کی ایمائیت بھی ہے اور نظم کا پھیلاؤ بھی، لیکن ان دونوں کی جڑیں فلسفہ کی سنگلاخ اور کرخت زمین سے پھوٹتی ہیں۔ رسوا کے ہاں منطقی استدلال کا رجحان بڑا غالب ہے۔ ابتدائی دنوں میں رسوا کو ناولیں لکھنے کا شوق تھا۔ ابتدا میں ایک دو افسانوں کو چھوڑ کر باقی کتب فروشوں کے اصرار سے مجبور ہو کر لکھا۔ رسوا ناول نگاری کی طرف کبھی بھی سنجیدگی کے ساتھ متوجہ نہیں ہوئے وہ ناول ہمیشہ مجبوری میں لکھا کرتے تھے یعنی ان کو جب بھی پیسوں کی ضرورت ہوتی وہ ناول لکھ دیا کرتے تھے۔ ان کی زندگی زیادہ تر مفلسی و پریشانی میں گزری۔ اس زمانے میں ناولوں کا بازار گرم تھا۔ عوام میں عام و خواص سبھی ناول کے دلدادہ تھے۔ امین آباد اور چوک کے کتب فروشوں کی فرمائشیں بڑھتی گئیں۔ کتب فروشوں کے اصرار پر رسوا ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ میں کچھ لکھ کر دے دیا کرتے تھے۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں ان کا قلم بغیر رکے نہایت روانی سے چلتا تھا۔ علمی موضوعات پر بھی انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی قوتِ تحریر کا اندازہ ہوتا ہے۔

رسوا بہت ذہین اور عالم آدمی تھے۔ ناول نگاری ان کے لیے صرف روپیہ حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔ اپنے پبلیشر کی فرمائشوں کو پورا

کرنے کے لیے انہوں نے انگریزی کے جاسوسی ناولوں کی طرف توجہ کی اور وہاں سے مواد اخذ کر کے کئی جاسوسی ناول جیسے، بہرام کی رہائی، خونی عاشق، خونی بھید، خونی شہزادہ، خونی جورو لکھے۔ رسوا کی طبع زاد ناولوں کی تعداد چھ ہے۔

"افشائے راز" (1896) یہ مرزا رسوا کی پہلی ادبی اور تخلیقی کوشش ہے۔ اس کے بارے میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ مرزا کی آپ بیتی ہے۔ لیکن اس کا فیصلہ اس وجہ سے نہیں ہو پاتا کہ افشائے راز نامکمل ہے۔ ناول کی کہانی میں رسوا نے ایسا ظاہر کیا ہے رسوا الگ ہیں اور محمد ہادی الگ۔ "افشائے راز" کے واقعات حقیقی ہیں۔ دیباچہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے تین حصے تھے۔ لیکن پہلا حصہ ہی شائع ہو سکا ہے۔ افشائے راز نامکمل ہونے کے باوجود بھی ناول کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ یہ رسوا کے فن کا نہ صرف نقش اول ہے بلکہ ان کے منطقی رجحانات کا پتہ بھی دیتا ہے۔

"شریف زادہ" (1900): شریف زادہ مرزا کا تیسرا ناول ہے۔ اگر اس کو ناول کے بجائے خود ایک فکری تحریک کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ یہ ایک ایسے شخص کی سوانح عمری ہے جس کی زندگی رسوا کے نزدیک آئیڈیل ہے۔ ان کے نزدیک اختلاف کی گنجائش بھی موجود ہے۔ شریف زادہ میں مرزا رسوا نے لکھنؤ کی اس زوال پذیر معاشرت کا نقشہ کھینچا ہے جس کی عیش و نشاط کی محفلیں اجڑ چکی تھیں۔ ناول کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں رسوا نے اپنی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ اس میں عابد حسین نامی ایک شخص کی زندگی کے حالات پیش کیے ہیں جو اپنی ذاتی محنت اور کاوش سے اپنی زندگی کو سنوارتا ہے اور بہت ہی کٹھن اور مشکل حالات سے دوچار ہوتے ہوئے بھی سماج میں اپنی ایک حیثیت بناتا ہے۔ شریف زادہ کی تخلیق در حقیقت ضرورت زمانہ کی رہین منت ہے۔ رسوا نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی وہ انسانی اقدار سے خالی ہو رہا تھا۔ اودھ کی زوال آمادہ تہذیب کے آثار جن کا ذکر امراؤ جان ادا میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے معاشرہ میں پوری طرح سرایت کر چکے تھے۔ شریف زادہ میں رسوا نے تنزل کے اس طوفان کو روکنے کی کوشش کی ہے۔ "شریف زادہ" زیادہ دلچسپ ناول نہیں ہے کیونکہ اس میں ناول کی سی دلچسپی پیدا کرنے میں مرزا کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ایک طرح یہ ناول سے زیادہ سوانح عمری ہی معلوم ہوتی ہے۔

مجموعی طور پر شریف زادہ فنی لحاظ سے خاصا مکمل اور جامع ناول ہے اس لیے اسے سرے سے ناول ہی نہ سمجھنا زیادتی ہے۔

"ذات شریف": مرزا رسوا کا ایک اہم ناول ہے جس کا سن تصنیف 1900 ہے۔ ذات شریف اودھ پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد وہاں کے اعلیٰ طبقے کے خاندان کی کہانی ہے۔ اس کا ماحول غدر کے بعد کا ہے۔ "ذات شریف" میں مرزا رسوا نے لکھنؤ کی تہذیبی زندگی پیش کی ہے۔ وہ اپنے اس ناول کے دیباچے میں یہی بتاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے زمانے کی تصویریں پیش کی ہیں۔

ناول کا موضوع لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیبی زندگی ہے "شریف زادہ" میں ایسی زندگی پیش کی ہے جو اپنی محنت، کوشش اور کاوش سے زندگی میں ترقی کرتا ہے۔ "ذات شریف" میں اس کے برخلاف ایسی زندگی پیش کی ہے جو اپنی کاہلی اور عیش کوشی کی وجہ سے زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ رسوا کے نزدیک وہ شخص ذات شریف ہے جس کو ورثہ میں صرف دولت ملی ہے۔ ظاہر ہے دولت جسم کی آلودگیوں کو دور کر سکتی ہے، روح کی آلائشوں کو نہیں دھو سکتی۔ ذات شریف جسموں کی سرگزشت نہیں، روحوں کی سرگزشت ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ایک نواب زادہ ہے اسے بے انتہا دولت ورثے میں ملی ہے۔ اس دولت میں دوسرے لوگ بھی شریک ہونا چاہتے ہیں۔ بالآخر اسے جادو ٹونے

کے سلسلے میں پھنسا کر لوٹ لیا جاتا ہے۔ جعل ساز اور خوشامدی لوگ تین لاکھ روپئے سے زیادہ کی ٹھگی کرتے ہیں۔ آخر میں سبھی پکڑے جاتے ہیں۔

"اختری بیگم" بھی رسوا کا ناول ہے۔ اس ناول میں مرزا رسوا نے لکھنؤ کے چند شریف اور معزز خاندانوں کی الجھنوں کو پیش کیا ہے۔ اختری بیگم اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اختری بیگم ایک رئیس لڑکی ہے۔ اس کی ماں اس کو ایک رشتہ کے بھائی خورشید مرزا کی تولیت میں چھوڑ کر مر جاتی ہے اور یہ وصیت کر جاتی ہے کہ اس کی جائیداد چھپائی جائے۔ قصہ کا زیادہ تر حصہ اختری کے زیورات کا صندوقچہ گم ہونے اور اس کی تلاش کے بیان میں ہے۔ قصے کی دلچسپی سنسنی خیز یا جاسوسی قسم کی ہے اور کردار سب بے جان ہیں۔ اس ناول میں بحیثیت ناول نگار رسوا کی خوبیاں او خامیاں دونوں ملتی ہیں۔ رسوا کا یہ ناول بہت ہی قابل تعریف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب انہوں نے لکھنؤ کے چالبازوں کو پیش کیا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ''ذات شریف'' میں پیش کی ہوئی باتوں کو دوبارہ پیش کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کے خیال میں امراؤ جان ادا کو چھوڑ کر ان کے کسی بھی ناول میں رسوا کی ناول نگاری اپنے عروج پر نظر نہیں آتی۔ یہ سب ناولیں ایک ہی طرح کے ہیں۔ ان کے زیادہ تر ابواب طویل بیانات سے شروع ہوتے ہیں۔ جو زبان دانی اور انشا پردازی کا اچھا نمونہ ہیں۔ کچھ میں مناظر قدرت کا بیان بھی دکھائی دیتا ہے۔ کچھ میں نفسیات انسانی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور کچھ میں اہم سوشل معاملات واضح کیے گئے ہیں مگر زیادہ تر بیانات قصہ پر بھاری ہو جاتے ہیں اور بلاضرورت معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد اسی طرح سماں باندھنا ہے جیسا کہ غیر ادبی ناولوں میں رسماً ہونا لازمی ہے۔ ان کے واقعات اور کردار کچھ سنسنی تو پیدا کرتے ہیں مگر غور سے دیکھنے پر پھیکے اور بے اثر ہوتے ہیں۔ ان کے ناولوں سب سے بڑی کمی کا جو احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان میں کوئی تخئیلی عنصر نہیں ہے جب کہ ادبی ناول زندگی کا ترجمہ بھی ہوتا ہے اور تخلیق بھی۔ ان کے ناولوں کی جو سب سے بڑی قدر و قیمت ہے وہ یہ ہے کہ ان کی زبان بہت اعلیٰ درجے کی ہے۔ مرزا رسوا کے ناولوں جہاں کچھ کمیاں ہیں وہیں ان میں خوبیاں بھی بے شمار ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی گریز نہیں کہ رسوا نے اردو ناول کے جسم میں نئی روح پھونک دی اور اسے بلندیوں تک پہنچا دیا، جہاں تک ان سے پہلے اور بعد والے شاید ہی کوئی پہنچ سکا ہو۔ ان کا ناول امراؤ جان ادا کو رسوا کا ہی شاہ کار نہیں اردو ادب کا ایک زندہ جاوید معاشرتی دستاویز کہا جاتا ہے۔ رسوا پہلے ناول نگار ہیں جنہوں نے اردو ادب میں حقیقت نگاری کو فروغ دیا اور کہانی کو صرف تفریح کا ذریعہ بنانے کے بجائے سماجی مسائل پر روشنی ڈالنے کا وسیلہ بنایا۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں انسانی جذبات، سماجی و اخلاقی اقدار کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔

"امراؤ جان ادا" مرزا ہادی رسوا کا 1899 میں لکھا ہوا معرکتہ الآرا تہذیبی و معاشرتی ناول ہے جسے اردو کا پہلا کامیاب اور مکمل ناول مانا جاتا ہے۔

3.2.3 امراؤ جان ادا کا قصہ:

امراؤ جان ادا مرزا ہادی رسوا کا لکھا ہوا ایک کلاسیکی ناول ہے، جو پہلی بار 1899 میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس ناول کو اردو کا پہلا کامیاب اور مکمل ناول مانا جاتا ہے۔ اس ناول میں ایک طوائف کی کہانی اسی کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ لیکن یہ صرف ایک طوائف کی زندگی کی کہانی نہیں بلکہ اس دور کی تہذیب و ثقافت اور سماجی رویوں کی عکاس بھی ہے۔ ناول کا آغاز ایک مشاعرے سے ہوتا ہے جس میں امراؤ جان کو

بھی شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ مرزاہادی رسوا اسی مشاعرے میں امراؤ جان سے اپنی آپ بیتی سنانے کے لیے اصرار کرتے ہیں۔ امراؤ جان ادا اپنی آپ بیتی کا آغاز اس شعر سے کرتی ہے:

ہم کو بھی کیا کیا مزے کی داستانیں یاد تھیں　　لیکن اب تمہید ذکر درد و ماتم ہو گئیں

امراؤ جان ادا بنگلہ یعنی فیض آباد کی رہنے والی تھی۔ اس کے والد بہو بیگم کے مقبرے پر جمعدار کی نوکری کرتے تھے۔ جو نہایت شریف اور ایماندار تھے۔ ایک بار انہوں نے ایک نہایت شریر بدمعاش دلاور خان کے خلاف عدالت میں سچی گواہی دے دی جس بنا پر اس بدمعاش کو 12 سال کی سزا ہو گئی۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد دلاور خان امراؤ کے والد سے بدلے کے فراق میں رہتا تھا۔ اور ایک دن موقعہ دیکھ کر اس نے ان کی آٹھ سالہ معصوم اور خوش شکل لڑکی امیرن کو قتل کے ارادے سے اغوا کر لیا، لیکن اپنے دوست پیر بخش کے مشورے سے قتل کرنے سے باز آتا ہے اور اسے لکھنؤ لے جا کر ایک مشہور کوٹھے والی خانم جان کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے۔

خانم نے امیرن کو گانے، ناچنے، شاعری، تہذیب اور آداب کی تربیت دی اور وقت کے ساتھ وہ معصوم لڑکی امیرن "امراؤ جان ادا" کے نام سے مشہور ہو گئی۔ امراؤ جان ادا نہ صرف خوش شکل تھی بلکہ اس کا انداز گفتگو، علم، شاعری اور خودداری بھی قابل ستائش تھی۔ اس کی زندگی میں کئی مرد آئے۔ نواب، شرفا، عاشق لیکن کوئی بھی اسے ایک باعزت مقام نہ دے سکا۔ وہ محبت، عزت اور قبولیت کی تلاش میں رہی مگر معاشرہ اسے صرف ایک طوائف کے طور پر دیکھتا رہا۔ اس کے دل میں سچی محبت کا جذبہ ہمیشہ موجود رہا مگر اسے کبھی حقیقی محبت اور عزت نہ مل سکی۔ سب سے پہلے وہ گوہر مرزا سے محبت کرنے لگتی ہے جو ایک ڈومنی کا بیٹا ہے اور خانم کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے اس سے عزت کی توقع ہی بیکار تھی۔ اس کے بعد اس کی زندگی میں نواب سلطان آتے ہیں۔ وہ نواب سلطان سے محبت کرنے لگی جو ایک رومانوی اور باوقار شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے امراؤ جان سے وعدے تو کیے، لیکن جب شادی یا عزت کی بات آئی تو اس نے پیچھے ہٹ کر دنیا کی روایتوں اور سماج کے ڈر کو اہمیت دی اور رام دئی سے شادی کر لی۔ اس کے بعد امراؤ جان ڈاکو فیض علی کے رابطے میں آتی ہے اور ڈاکو فیضو بھی اس سے بے پناہ محبت کرنے لگتا ہے اور اسے کوٹھے سے لے بھاگتا ہے مگر راستے میں راجا دھیان سنگھ کے آدمیوں سے مڈبھیڑ کے بعد اسے امراؤ کو چھوڑ کر بھاگنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد امراؤ جان کانپور پہنچ جاتی ہے۔ جہاں اس کی ملاقات رام دئی سے ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں رام دئی بھی امراؤ جان کے ساتھ اغوا کر کے لائی گئی تھی۔ امراؤ رام دئی کی حالات زندگی سن کر رشک کرنے لگتی ہے۔ پھر خانم کے لوگ کانپور پہنچتے ہیں اور امراؤ کو واپس لکھنؤ لے آتے ہیں۔

لکھنؤ میں جب غدر ہوا تو امراؤ جان شاہی دربار سے متعلق تھی۔ جب فرنگیوں نے انقلابیوں اور ان کے مددگاروں پر ظلم و جور کرنا شروع کیا تو امراؤ جان بھی لکھنؤ چھوڑ کر فیض آباد چلی گئی۔ یہاں بھی اس نے بہت شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ یہاں تک کہ ایک دن اپنے ہی محلے میں مجرے کے لیے بلائی گئی جہاں ماں بیٹی کی ملاقات ہوتی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر خوب روتی ہیں۔ لیکن اس کا بھائی اس کو قبول نہیں کرتا ہے اور سماجی دباؤ میں اسے قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور اس شرط پر چھوڑتا ہے کہ کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا۔ امراؤ جان پھر لکھنؤ واپس آجاتی ہے۔ اس بار لکھنؤ کے ایک نواب محمود علی نے کورٹ میں یہ دعویٰ کیا کہ امراؤ جان اس کی بیوی ہے۔ ایک وکیل اکبر علی خاں کی وجہ سے اسے محمود علی سے نجات ملی۔ ان دنوں امراؤ اکبر علی خاں کے گھر پر ہی رہی۔ ان کے گھر سے نکلنے کے بعد ایک بار

پھر امراؤ جان نے اپنا کاروبار شروع کیا۔ اسی دوران ایک دن درگاہ میں اس کی ملاقات رام دئی سے ہوتی ہے اور یہ راز کھلتا ہے کہ رام دئی ہی نواب سلطان کی بیگم ہے جس سے امراؤ کسی زمانے میں محبت کرتی تھی۔ بارش کے دنوں میں ایک دن امراؤ اپنے دوستوں کے ساتھ بخشی کے تالاب سیر کرنے جاتی ہے جہاں اس نے دلاور خاں کو کچھ کھودتے ہوئے دیکھا۔ اس نے پولس کو دلاور خان کے کرتوتوں سے آگاہ کیا جس کی وجہ سے دلاور خان گرفتار کر لیا گیا اور کوئی دو مہینے بعد اسے پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد امراؤ جان باقی زندگی یاد الٰہی میں گزارنے لگتی ہے۔

امراؤ جان ادا محض ایک طوائف کی داستان نہیں بلکہ یہ اس معاشرے کی منافقت کو بے نقاب کرتی ہے۔ عورت کی شناخت اور مقام پر سوال اٹھاتی ہے۔ محبت، وفا اور عزت کے حقیقی معنی بیان کرتی ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب، زبان، ادب، موسیقی اور زوال کا عکس پیش کرتی ہے۔

3.2.4 امراؤ جان ادا: متن (اقتباس)

سن چکے حال تباہی کا مری اور سنو
اب تمہیں کچھ مری تقریر مزہ دیتی ہے

بوندی سے بیگم صاحب اور مرزا برجیس قدر نیپال کو روانہ ہوئے۔ سید قطب الدین لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔ میں بہ ہزار مشکل فیض آباد آئی۔ پہلے سرائے میں اتری پھر ترپولیے کے پاس ایک کمرہ کرایہ کو لے لیا تھا۔ میراثی رکھ لیے، گانا بجانا شروع کر دیا۔

فیض آباد میں رہتے ہوئے اب مجھے چھ مہینے گذر چکے ہیں۔ وہاں کی آب وہوا طبیعت کے بہت موافق ہے۔ دل لگا ہوا ہے، آٹھویں، دسویں دن کوئی نہ کوئی مجرا آجاتا ہے۔ اسی پر بسر ہے، تمام شہر میں میرے گانے کی دھوم ہے۔ جہاں مجرا ہوتا ہے، ہزاروں آدمی ٹوٹ پڑتے ہیں، میرے کمرے کے نیچے لوگ تعریفیں کرتے ہوئے نکلتے ہیں، میں دل میں خوش ہوتی ہوں، کبھی کبھی خواب وخیال کی طرح بچپن کی باتیں یاد آجاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی دل میں ایک جوش سا پیدا ہوتا ہے مگر انتزاع سلطنت، غدر، برجیس قدر یہ سب سانحے آنکھوں کے سامنے گذر چکے ہیں۔ کلیجہ پتھر کا ہو گیا ہے۔ ماں باپ کے تصور کے ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے، خدا جانے اب کوئی زندہ بھی ہو یا نہ ہو اور اگر ہو تو ان کو مجھ سے کیا مطلب، وہ اور عالم میں ہوں گے میں اور عالم میں ہوں۔ خون کا جوش سہی مگر کوئی غیرت دار آدمی مجھ سے ملنا گوارا نہ کرے گا۔ اب ان سے ملنے کی کوشش کرنا ان کو رنج دینا ہے۔ گھر کا خیال آتے ہی وہ باتیں یاد آتی تھیں پھر طبیعت اور طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔

لکھنؤ کی یاد اکثر ستاتی تھی مگر جب انقلاب کا خیال آتا تھا۔ دل بھر جاتا تھا اب وہاں کون ہے کس کے لیے جاؤں۔ خانم جیتی ہیں تو کیا ہوا۔ ان سے اب کیوں کر بنے گی وہی اگلی حکومت جتائیں گی۔ مجھے اب ان کی قید میں رہنا کسی طرح منظور نہ تھا جو مال میر صاحب کی بہن کے پاس امانت تھا وہ اب کیا ملے گا۔ تمام لکھنؤ لٹ گیا۔ میر صاحب کا گھر بھی لٹ گیا ہو گا، اس کا اب خیال ہی بے کار ہے۔ اگر نہیں لٹا تو ابھی اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرے ہاتھ گلے جو کچھ موجود ہے وہ کیا کم ہے؟

ایک دن کمرے پر بیٹھی ہوں، ایک صاحب شریفانہ صورت ادھیڑ سے تشریف لائے، میں نے پان بنا کے دیا، حقہ بھروا دیا۔

حالات دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ بہو بیگم صاحبہ کے عزیزوں سے ہیں۔ وثیقہ پاتے ہیں۔ میں نے باتوں باتوں مقبرہ کی روشنی کی تمہید اٹھاکے پرانے ملازموں کا ذکر چھیڑا۔

میں: اگلے نوکروں میں کون کون رہ گیا ہے۔

نواب صاحب: اکثر مر گئے نئے نئے نوکر ہیں۔ اب وہ کارخانہ ہی نہیں رہا۔ بالکل نیا انتظام ہے۔

میں: اگلے نوکروں میں ایک بڈھے جمعدار تھے۔

نواب: ہاں تھے تم انہیں کیا جانو۔

میں: غدر سے پہلے میں ایک مرتبہ محرم میں فیض آباد آئی تھی۔ مقبرے پر روشنی دیکھنے گئی تھی انہوں نے میری بڑی خاطر کی تھی۔

نواب: وہی جمعدار ناجن کی ایک لڑکی نکل گئی تھی۔

میں: مجھے کیا معلوم (دل میں) ہائے افسانہ اب تک مشہور ہے۔

نواب: یوں تو کوئی جمعدار تھے اور اب بھی ہیں مگر روشنی وغیرہ کا انتظار غدر سے پہلے وہی کرتے تھے۔

میں: ایک لڑکا بھی ان کا تھا۔

نواب: تم نے لڑکے کو کہاں دیکھا۔

میں: اس دن ان کے ساتھ ایسی شکل بھی ملتے کم دیکھی ہے، بن کہے میں پہچان گئی تھی۔

نواب: جمعدار غدر سے پہلے ہی مر گئے وہی لڑکا ان کی جگہ نوکر ہے۔

اس کے بعد بات کے ٹالنے کے لیے میں نے اور کچھ حالات ادھر ادھر کے پوچھے۔ نواب صاحب نے سوز پڑھنے کی فرمایش کی۔ میں نے دو سوز سنائے۔ بہت محظوظ ہوئے۔ رات کچھ زیادہ آگئی تھی گھر تشریف لے گئے۔

باپ کے مرنے کا حال سن کے مجھے بہت رنج ہوا۔ اس دن رات بھر رویا کی۔ دوسرے دن بے اختیار جی چاہا بھائی کو جاکے دیکھ آؤں۔ دو دن کے بعد ایک مجرا آگیا اس کی تیاری کرنے لگی، جہاں کا مجرا آیا تھا وہاں گئی، محلے کا نام یاد نہیں، مکان کے پاس ایک بہت بڑا پرانا املی کا درخت تھا اسی کے نیچے تمگیرا تانا گیا تھا۔ گرد قناتیں تھی۔ بہت بڑا مجمع مگر لوگ کچھ ایسے ہی ویسے تھے قناتوں کے پیچھے اور سامنے کھپریلوں میں عورتیں تھیں۔ پہلا مجرا کوئی نو بجے شروع ہوا۔ بارہ بجے تک رہا۔ اس مقام کو دیکھ کے وحشت سی ہوتی تھی۔ دل امڈا چلا آتا تھا کہ یہیں میرا مکان ہے۔ یہ املی کا درخت وہی ہے جس کے نیچے میں کھیلا کرتی تھی۔ جو لوگ محفل میں شریک تھے ان میں سے بعض آدمی ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے میں نے ان کو کہیں دیکھا ہے۔ شبہ مٹانے کے لیے میں قناتوں کے باہر نکلی۔ گھروں کی قطع کچھ اور ہی ہو گئی تھی۔ اس سے خیال ہوا شاید یہ وہ جگہ نہ ہو۔ ایک مکان کے دروازے کو غور سے دیکھا کی۔ دل کو یقین ہو گیا تھا کہ یہی میرا مکان ہے، جی چاہتا ہے کہ مکان میں گھسی چلی جاؤں، ماں کے قدموں پر گروں وہ گلے لگالیں گی۔ مگر جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس لیے کہ میں جانتی ہوں کہ دیہات میں رنڈیوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے باپ بھائی کی عزت کا خیال تھا۔ نواب صاحب کی باتوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ جمعدار کی لڑکی کا نکل

جانالوگوں کو معلوم ہے۔ پھر جی کہتا تھاہائے کیاغضب ہے صرف ایک دیوار کی آڑ ہے۔ ادھر میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں ان کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ ایک نظر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں، کیا مجبوری ہے؟

اسی ادھیڑبن میں تھی کہ ایک عورت نے آکے پوچھا: ''تمہیں لکھنؤ سے آئی ہو؟''

میں: ہاں! اب تو میرا کلیجہ ہاتھوں اچھلنے لگا۔

عورت: اچھاتو ادھر چلی آؤ۔ تمہیں کوئی بلاتا ہے۔

میں: اچھا کہہ کے اس کے ساتھ چلی ایک ایک پاؤں گویاسو سو من کا ہو گیا تھا۔ قدم رکھتی کہیں تھی پڑتا کہیں تھا۔ وہ عورت اس مکان کے دروازہ پر مجھ کو لے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھے ہوئے تھی اس مکان کی ڈیوڑھی میں مجھ کو بٹھادیا اندر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھااس کے پیچھے دو تین عورتیں آکے کھڑی ہوئیں۔

ایک: لکھنؤ سے تمہیں آتی ہو۔

میں: جی ہاں۔

دوسری: تمہارانام کیاہے؟

میں: (جی میں تو آیا کہہ دوں امیرن مگر دل کو تھام کے) امراؤ جان ادا۔

پہلی: تمہاراوطن خاص لکھنؤ ہے۔

میں: (اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آنسو نکل پڑے) اصلی وطن تو یہی ہے جہاں کھڑی ہوں۔

پہلی: تو کیا بنگلے کی رہنے والی ہو؟

میں: (آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے بمشکل جواب دیا) جی ہاں۔

دوسری: کیاتم ذات کی پتریاہو؟

میں: ذات کی پتریاتو نہیں ہوں تقدیر کا لکھاپورا کرتی ہوں۔

پہلی: (خود روکے) اچھاتو روتی کیوں ہو۔ آخر کہو پھر تم کون ہو؟

میں: (آنسو پوچھ کے) کیا بتاؤں کون ہوں، کچھ کہتے بن نہیں پڑتا۔

اتنی باتیں میں نے بہت دل سنبھال کے کی تھیں۔ اب بالکل تاب ضبط نہ تھی، سینے میں دم رکنے لگا تھا۔

اتنے میں دو عورتیں پردے کے باہر نکلیں ایک کے ہاتھ میں چراغ تھااس نے میرے منھ کو ہاتھ سے تھام کے کان کی لو کے پاس غور سے دیکھااور یہ کہہ کے دوسری کو دکھایااور کہا ''کیوں ہم نہ کہتے تھے وہی ہے۔''

دوسری: ہائے میری امیرن۔ کہہ کے لپٹ گئی۔ دونوں ماں بیٹیاں چیخیں مار مار کے رونے لگیں، ہچکیاں بندھ گئیں۔ آخر دو عورتوں نے آکے چھڑایا۔

اس کے بعد میں نے اپنا سارا قصہ دہرایا میری ماں بیٹھی سنا کی اور رویا کی۔ باقی رات ہم دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ صبح ہوتے میں

رخصت ہوئی۔ ماں نے چلتے وقت جس حسرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھا تھا وہ نگاہ مرتے دم تک مجھے نہ بھولے گی۔ مگر مجبوری۔ روز روشن نہ ہونے پایا تھا کہ سوار ہو کر اپنے کمرے پر چلی آئی۔ دوسرا مجرا صبح کو ہوتا مگر میں نے گھر پر آ کے کل روپیہ مجرے کا واپس کر دیا اور بیماری کا بہانہ کہلا بھیجا۔ دولہا کے باپ نے آدھا روپیہ پھیر دیا۔ اس دن، دن بھر جو میرا حال رہا خدا ہی پر خوب روشن ہے، کمرے کے دروازے بند کر کے دن بھر پڑی رویا کی۔

دوسرے دن شام کو کوئی دو گھڑی رات گئے ایک جوان سا آدمی سانولی رنگت کوئی بیس بائیس کا سن، پگڑی باندھے سپاہیوں کی ایسی وردی پہنے، میرے کمرے پر آیا۔ میں نے حقہ بھروا دیا۔ پاندان میں پان نہ تھے ماما کو بلا کے چپکے سے کہا، پان لے آؤ۔ اتفاق سے اور کوئی بھی اس وقت نہ تھا۔ کمرے میں میں ہوں اور وہ ہے۔

جوان: کل تمہیں مجرے کو گئی تھیں؟ یہ اس تیور سے کہا کہ میں جھجک گئی۔

میں: "ہاں" اتنا کہہ کے اس کے چہرے کی طرف جو دیکھا یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔

جوان: (سر نیچا کر کے) خوب گھرانے کا نام روشن کیا۔

میں: (اب سمجھی کہ یہ کون شخص ہے) اس کو تو خدا ہی جانتا ہے۔

جوان: ہم تو سمجھے تھے تم مر گئیں مگر تم اب تک زندہ ہو۔

میں: بے غیرت زندگی تھی نہ مری۔ خدا کہیں جلد موت دے۔

جوان: بے شک اس زندگی سے موت لاکھ درجہ بہتر تھی۔ تمہیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا تھا۔ کچھ کھا کے سو رہی ہوتیں۔

میں: خود اتنی سمجھ نہ تھی نہ آج تک کسی نے یہ نیک صلاح دی۔

جوان: اگر ایسی ہی غیرت دار ہوتیں تو اس شہر میں کبھی نہ آتیں اور آئی بھی تھیں تو تمہیں اس محلہ میں مجرے کو نہ آنا تھا جہاں کی رہنے والی تھیں۔

میں: ہاں اتنی خطا ضرور ہوئی مگر مجھے کیا معلوم تھا؟

جوان: اچھا اب تو معلوم ہو گیا۔

میں: اب کیا ہوتا ہے؟

جوان: (بہت ہی غصہ ہو کے) اب کیا ہوتا ہے۔ اب کیا ہوتا ہے۔ اب (چھری کمر سے نکال کے مجھ پر جھپٹا دونوں ہاتھ پکڑ کے گلے پر چھری رکھ دی) یہ ہوتا ہے۔

اتنے میں ماما بازار سے پان لے کے آئی۔ اس نے جو یہ حال دیکھا لگی چیخنے، "ارے دوڑو بیوی کو کوئی مارے ڈالتا ہے۔"

جوان: (چھری گلے سے ہٹا کے ہاتھ چھوڑ دیئے) عورت کو کیا ماروں اور عورت بھی کون بڑی۔۔۔۔۔۔

اتنا کہہ کے ڈاڑھیں مار مار کے رونے لگا۔

میں پہلے سے رو رہی تھی۔ جب اس نے گلے پر چھری رکھی تھی جان کے خوف سے ایک دھچکا سا کلیجے پر پہنچا تھا اس سے دم بخود ہو گئی تھی۔

جب وہ چھوڑ کر رونے لگا میں بھی رونے لگی۔

ماما نے دو ایک چیخیں ماری تھیں۔ جب اس نے یہ حال دیکھا کچھ چپ سہی ہو رہی ادھر میں نے اشارہ سے منع کیا ایک کنارے کھڑی ہو گئی۔

جب دونوں چپ رو دھو چکے۔

جوان: (ہاتھ جوڑ کے) اچھا تو اس شہر سے کہیں چلی جاؤ۔

میں: کل چلی جاؤں گی مگر ایک مرتبہ ماں کو اور دیکھ لیتی۔

جوان: بس اب دل سے دور رکھو، معاف کرو، کل اماں نے تمہیں گھر پر بلا لیا میں نہ ہوا نہیں تو اسی وقت وارا نیارا ہو جاتا۔ محلہ بھر میں چرچے ہو رہے ہیں۔

میں: تم نے دیکھ لیا جان سے تو میں ڈرتی نہیں۔ مگر ہائے تمہاری جان کا خیال ہے۔ تم اپنے بچوں پر سلامت رہو۔ خیر اگر جیتے رہے تو کبھی نہ کبھی خیر و عافیت سن ہی لیا کریں گے۔

جوان: برائے خدا کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا۔

میں: اچھا۔

وہ جوان تو اٹھ کے چلا گیا میں اپنے غم میں مبتلا تھی۔ ماما نے اور جان کھانا شروع کیا۔

ماما: یہ کون تھے؟

میں: رنڈی کے مکان پر ہزاروں آدمی آتے ہیں۔ کوئی تھے تمہیں کیا۔

بہر طور ماما کو ٹال دیا۔ رات سو رہی صبح کو اٹھ کے لکھنؤ کے چلنے کی تیاری کی شاموں شام شکرم کرایہ کر کے روانہ ہو گئی۔

3.2.5 خلاصہ:

"امراؤ جان ادا" اردو ادب کا وہ عظیم سرمایہ ہے جس کی کہیں دوسری نظیر نہیں ملتی۔ یہ اردو ادب کا لازوال نفسیاتی ناول ہے۔ تقریباً ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اب تک اس کے اثرات ذہنوں اور خیالوں پر حکومت کر رہے ہیں۔

امراؤ جان ادا لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کی عکاس ہے۔ اس کی کہانی بظاہر ایک طوائف کے ارد گرد گھومتی ہے لیکن یہ اودھ کی تہذیب کے زوال کی کہانی ہے۔ اس کا بیانیہ اس دور کے لکھنؤ کی تاریخی و سیاسی حالات کا علامتی اظہار ہے۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام اپنی کتاب "تنقیدیں" میں لکھتے ہیں کہ:

> "امراؤ جان ادا کا موضوع زوال ہے۔ یہ زوال ایک خاص معاشرت کا ہے، جو اودھ کے چند شہروں میں محدود تھی۔ رسوا اس معاشرت کی تصویر دکھانا چاہتے تھے۔ ان کے ذہن میں اس کا ایک تصور بھی تھا۔ ان کے چاروں طرف اس کا مواد بکھرا ہوا تھا اور یہ مواد آسانی سے گرفت میں لانا محال تھا۔"
>
> (خورشید الاسلام، ڈاکٹر، تنقیدیں، صفحہ 99، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ)

امراؤ جان ادا دراصل اپنے زمانے کی اودھ کی تہذیب کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔ یہ ایک ایسی بدنصیب عورت کی کہانی ہے جس کو حالات نے طوائف بننے پر مجبور کر دیا۔ واقعات کو خود نوشت کے طور پر بیان کیا گیا ہے جس سے تاثیر اور بھی بڑھ گئی ہے۔ رسوا نے اس عہد کے زوال آمادہ معاشرے کی روح کو جس طرح گرفت میں لیا ہے، اور انسان کی بے بسی و مجبوری کے ٹکراؤ کو جس فنی خلوص اور درد مندی کے ساتھ ابھارا ہے وہ قابل دید ہے۔

ناول امراؤ جان ادا کی تکنیک بیانیہ ہے۔ تمام کہانی خود امراؤ جان ادا کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ مرزا رسوا کے اسرار پر اپنی آپ بیتی سنانی شروع کرتی ہے۔ یہ ایک طوائف کا سیدھا سادا حال ہے جو اس نے خود بیان کیا ہے۔ وہ ایک غریب مگر شریف النفس مسلمان کی بیٹی تھی جو بنگلہ (فیض آباد) میں بہو بیگم صاحبہ کے مقبرے پر جمعدار کی نوکری کرتے تھے۔ یہ نہایت سچے اور سیدھے تھے۔ ان کے پڑوس میں ایک دلاور خاں نامی ایک بدمعاش رہتا تھا۔ اس کا تعلق ڈکیتوں سے تھا۔ ایک بار تھانیدار نے اس کے بابت کچہری میں گواہی دینے کے لیے کہا تو انہوں نے عدالت میں سچی گواہی دے دی جس کے بنا پر اسے جیل ہو گئی۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ جمعدار سے بدلہ لینے کے فراق میں رہتا تھا۔ ایک دن موقع پا کر جمعدار کی آٹھ سالہ معصوم بچی امیرن کو اغوا کر کے گھر میں بند کیا اور رات میں گاڑی میں ڈال کر مارنے کے ارادے سے لے چلا۔ گاڑی میں اس کے ساتھ اس کا دوست پیر بخش بھی تھا جس نے صلاح دی کہ اس کو مارنے سے اچھا ہے کہ لکھنؤ میں کہیں بیچ ڈالا جائے۔ چنانچہ یہ لوگ امیرن کو لے کر لکھنؤ پہنچے اور پیر بخش کے بھائی کے گھر امیرن کو رکھا گیا جہاں ایک اور ہندو لڑکی رام دئی بھی اغوا کر کے لائی گئی تھی۔ امیرن لکھنؤ کی مشہور طوائف خانم جان کے یہاں سوا سو روپے میں بیچی گئی اور رام دئی ایک بیگم صاحبہ کے یہاں بکی۔

خانم نے امیرن کا نام بدل کر امراؤ کر دیا اور اس کو رقص و موسیقی کی تعلیم دی، آداب محفل سکھائے اور دل ربائی اور فن عشوہ گری میں ماہر کر دیا۔ اس کی طبیعت موسیقی سے بہت مناسب پائی گئی اور اس نے ادبی مذاق بھی پیدا کر لیا۔ دوران تعلیم ایک ڈومنی کا لڑکا گوہر مرزا اس کے ساتھ پڑھتا تھا۔ پہلے تو دونوں لڑتے جھگڑتے تھے، پھر محبت کرنے لگے۔ خانم کو خبر ہوتی ہے تو اس نے امراؤ کی مسی کی رسم کروائی اور اسے پوری طوائف بنا دیا۔ اور طوائفوں کی طرح اس کا بھی الگ عملہ ہو گیا۔ اس طرح امیرن امراؤ جان ادا بن گئی۔ خانم کی لڑکی بسم اللہ بھی بڑھ گئی تھی۔ اس کا بھی طوائفوں میں شمار ہونے لگا تھا۔ یہ خانم کی اکلوتی بیٹی ہے جسے اپنی ماں کی دولت پر گھمنڈ ہے۔ غرض یہ پیدائشی طوائف ہے۔ امراؤ کے پاس ایک طرف اور دوسری طرف بسم اللہ کے پاس مختلف قسم کے لوگ آتے رہتے تھے۔ اس کوٹھے پر آنے والے جتنے تھے سب بگڑے ہوئے نواب اور رئیس زادے تھے۔ امراؤ جان کے آشناؤں میں سب سے زیادہ نمایاں نواب سلطان ہوئے جن کو وہ دل سے چاہتی تھی۔ مگر ان کی شادی رام دئی سے ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد ایک ڈاکو فیضو اسے خانم کے کوٹھے سے بھگا لے جاتا ہے۔ راستے میں فیضو اور اس کے ساتھیوں کو راجا دھیان سنگھ کے آدمی گھیر لیتے ہیں فیضو امراؤ جان کو چھوڑ کر بھاگنا نکلتا ہے۔ امراؤ جان آخر کانپور پہنچ جاتی ہے جہاں ایک کمرہ کرایہ پر لے کر اپنا پیشہ شروع کرتی ہے۔ اتفاق سے وہ نواب سلطان کی کوٹھی پر پہنچتی ہے جہاں اس کی ملاقات رام دئی سے ہوتی ہے جو نواب سلطان کی بیگم ہے۔ یہ وہی رام دئی تھی جو امراؤ جان کے ساتھ بکنے کو لائی گئی تھی۔ قسمت کا کھیل دیکھیے ایک کو کوٹھی نصیب ہوئی اور ایک کو کوٹھا۔ امراؤ جان ادا رام دئی نواب سلطان کی بیگم کو رشک اور حسرت کی نگاہوں سے دیکھتی

ہے۔ پھر خانم کے لوگ کانپور پہنچتے ہیں اور امراؤ کو منا کر لکھنؤ واپس لے آتے ہیں۔

غدر کے زمانے میں وہ شاہی دربار سے متعلق تھی اور جب انگریزوں نے انقلاب کو دبانے کے لیے انقلابیوں کی اور ان کا ساتھ دینے والوں کی دھر پکڑ شروع کی تو امراؤ جان ادا بھی فیض آباد چلی گئی۔ یہاں بھی اس کا پیشہ خوب چلا اور بہت جلد پورے شہر میں اس کے گانے کی دھوم ہو گئی۔

یہاں ناول کے اس حصے کا اقتباس درج کیا گیا ہے جہاں انقلاب 1857 کے بعد حالات کے تھپیڑے کھاتی ہوئی امراؤ جان ادا فیض آباد واپس پہنچتی ہے۔ فیض آباد میں رہتے ہوئے اسے نصف سال گزرنے کو ہے آٹھ دس دن میں کوئی نہ کوئی مجرا آ ہی جاتا ہے۔ جہاں مجرا ہوتا ہے ایک جم غفیر امڈ آتا ہے۔ لوگ راستہ چلتے ہوئے امراؤ کی تعریفیں کرتے ہیں۔ امراؤ اپنی تعریف سن کر خوش ہوتی ہیں مگر دل کے ایک کونے میں اپنے اصل گھر، خاندان، ماں باپ اور بھائی کی یاد ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ ماں باپ کا خیال کر کے افسردہ ہو جاتی ہے کہ نہ جانے کس حال میں ہوں گے ؟۔ گھر کا خیال آتے ہی وہ ساری باتیں اسے یاد آجاتی ہیں۔ محبت ہے مگر وہ جانتی ہے کہ وہ ایک داغ بن چکی ہے۔ کوئی شریف آدمی اس سے ملنا گوارا نہ کرے گا۔ کیوں کہ طوائف بننے کے بعد عورت اپنے خاندان سے کٹ جاتی ہے، چاہے اس کا قصور ہو یا نہ ہو۔

لکھنؤ کی یاد بھی اسے ستاتی ہے مگر انقلاب کا خیال آتے ہی دل بھر جاتا ہے۔ زندگی کی سختیوں نے دل کو بے حس بنا دیا ہے۔ ایک دن بہو بیگم کے عزیزوں میں سے ایک نواب صاحب تشریف لے آئے۔ امراؤ جان نے باتوں باتوں میں مقبرے کی روشنی کا ذکر چھیڑ کر اپنے باپ بھائی کی خیریت دریافت کی تو پتہ چلا کہ اس کے والد غدر سے پہلے انتقال کر گئے ہیں اور چھوٹا بھائی ان کی جگہ پر نوکری کر رہا ہے۔

باپ کے مرنے کی خبر سن کر امراؤ جان ادا کو بہت صدمہ پہنچا۔ اس دن پوری رات رویا کی۔ دوسرے دن بھائی سے ملنے کو اس کا دل بہت چاہا مگر جا نہ سکی۔ دو دن بعد امراؤ کو ایک مجرا آ گیا اور وہ اس کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ اتفاق سے اسی محلے میں مجرا کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے جہاں اس کے ماں باپ کا گھر تھا۔ وہی بڑا پرانا املی کا درخت جس کے نیچے اس کا بچپن گزرا تھا اور آج اسی درخت کے نیچے وہ مجرا کرنے آئی تھی۔ مقامات کو دیکھ کر اس کا بچپن یاد آرہا تھا اس کا دل امڈ اچلا آتا تھا۔ قنات سے باہر نکل کر وہ محلے کا جائزہ لیتی ہے کچھ مکان نئے بن چکے تھے کچھ ابھی اسی حال میں تھے اسی اثنا میں اپنے مکان کے پاس پہنچتی ہے اور دروازے کو دیکھ کر پہچان جاتی ہے مگر اندر جانے کی ہمت نہیں کر پاتی ہے کیوں کہ دیہاتوں میں لوگ طوائفوں سے پرہیز کرتے ہیں اور دوسری چیز کہ اسے اپنے گھر والوں کی عزت کا خیال بھی تھا۔ مگر تقدیر کا کھیل ایسا ہوتا ہے کہ ماں کی طرف سے ہی اسے بلاوا آجاتا ہے۔ ایک عورت اس کے پاس آتی ہے اور اسے اپنے ساتھ اسی مکان میں لے جاتی ہے۔ جہاں دو تین عورتیں پہلے سے موجود تھیں۔ تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد جب امراؤ کی پہچان عیاں ہوتی ہے تو ماں بیٹی ایک دوسرے سے لپٹ کر گھنٹوں رویا کیں، اتنا روئیں کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ امراؤ جان ادا نے سارا واقعہ اپنی ماں کو سنایا اس کی ماں بیٹھی رویا کی۔ رات بھر ماں بیٹی ایک دوسرے سے لپٹی بیٹھی رہیں۔ ماں اور بیٹی کی پہچان، رونا دھونا اور گلے ملنا۔ ایک ایسا لمحہ ہے جو ادب کی دنیا میں ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے۔ محبت اور مجبوری کا تصادم دیکھئے کہ ماں کی محبت ہے مگر بیٹی کو اپنانا ممکن نہیں۔ بیٹی کے لیے وہ لمحہ آخری دیدار کا تھا۔

صبح ماں سے رخصت ہو کر امراؤ جان اپنے کمرے پر آگئی اور بیماری کا بہانہ بنا کر مجرے کا پیسہ واپس کر دیا وہ کمرے کا دروازہ بند

کر کے دن بھر رویا کی۔ دوسرے دن شام کو اس کا بھائی اس کے کمرے پر آتا ہے۔ وہ غصے اور غیرت کے مارے اسے قتل کرنے کے درپے ہوتا ہے مگر آخر میں رونے لگتا ہے۔ وہ بہن سے کہتا ہے کہ اس شہر کو چھوڑ دو اور کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا۔ سماجی شرمندگی کا دباؤ بھائی کے اوپر اتنا شدید ہے کہ وہ اپنی بہن کو قتل کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔

امراؤ جان سمجھتی ہے کہ اب اس کا اپنے گھر سے کوئی تعلق نہیں رہا، وہ خود کو سماج کے لیے ناقابل قبول سمجھتی ہے اور دل شکستہ ہو کر فیض آباد سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہو جاتی ہے۔

یہ اقتباس عورت کی شناخت، سماجی مقام، محبت، گناہ، سزا، خاندان اور غیرت جیسے موضوعات کو انتہائی طاقت ور، دردناک اور حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ ایک اغوا شدہ معصوم بچی کو سماج نہ معاف کرتا ہے، نہ واپس قبول کرتا ہے، چاہے وہ کتنی ہی باکمال کیوں نہ ہو۔ یہی عورت کا مقدر ہے۔

3.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- رسوا کا نام محمد ہادی اور تخلص رسوا تھا۔ ان کے والد کا نام مرزا محمد تقی تھا جو بادشاہ اودھ آصف الدولہ کی فوج میں ممتاز عہدے پر فائز تھے۔
- رسوا 1858ء میں لکھنؤ محلہ کوچہ آفریں خان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم رواج زمانہ کے مطابق پائی۔ 1880 میں رسوا نے پنجاب یونیورسٹی سے فلسفہ میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں امریکہ کا سفر کیا۔
- امریکہ کی اورینٹل یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ رسوا نے ریاضی، اقلیدس، نجوم، فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے ذاتی شوق کی بنا پر حاصل کی۔
- رسوا شاعر بھی تھے شاعری میں مرزا تخلص کرتے تھے اور رسوا کے قلمی نام سے ناول لکھتے تھے۔ رسوا ابتدا میں مرزا دبیر سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ رسوا کو موسیقی کا بھی شوق تھا، چنانچہ رسوا نے تین سو کے قریب راگ راگنیوں کے لیے علامات مقرر کیے تھے۔
- 1917ء میں حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورستی قائم ہوئی یہ ہندوستان کی پہلی یونیورسٹی تھی جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ اس یونیورسٹی کے لیے ایک دارالترجمہ بھی قایم کیا گیا۔ اس دارالترجمے سے ہندوستان بھر کے چوٹی کے اہل قلم وابستہ ہوئے۔
- دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں بہ حیثیت مترجم چار سو روپئے پر رسوا کا تقرر 1917 میں ہوا تھا جہاں رسوا نے 12 سال ترجمے کے فرائض انجام دیے تھے۔ انہوں نے کئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔
- رسوا مستقل طور پر حیدرآباد میں رہنے لگے۔ رسوا کا انتقال یہیں حیدرآباد میں 1931 میں ہوا اور مرلی دھر باغ حیدرآباد کے مشہور قبرستان میں دفن کیے گئے۔

- "امراؤ جان ادا" اردو ادب کا لازوال نفسیاتی ناول ہے۔ امراؤ جان ادا لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کا عکاس ہے۔
- اس کی کہانی بظاہر ایک طوائف کے ارد گرد گھومتی ہے لیکن یہ اودھ کی تہذیب کے زوال کی کہانی ہے۔ اس کا بیانیہ اس دور کے لکھنؤ کی تاریخی و سیاسی حالات کا علامتی اظہار ہے۔

3.4 مشکل الفاظ

برجیس قدر	نواب واجد علی شاہ اور بیگم حضرت محل کے صاحب زادے جنہوں نے پہلی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی تھی	Name of a person (Barjis Qadr)
سرائے	مسافر خانہ	Inn, Rest house
مجرا	ناچ گانا	Salutation, Gesture of respect (esp. by courtesans)
انتزاع	نکل جانا / چھن جانا	Extraction, Derivation
غدر	1857 کی پہلی جنگ عظیم	Treachery, Mutiny
سانحہ	غیر متوقعہ حادثہ	Tragedy, Mishap
بہو بیگم	اودھ کے نواب شجاع الدولہ کی بیوی تھیں	Daughter-in-law (respected lady)
وثیقہ	وہ رقم جو انگریز حکومت وظیفے کی شکل میں اودھ کے بادشاہوں کے نامزد لوگوں کو دیتی تھی	Deed, Document
جمعدار	علاقوں میں پولیس کا نچلا افسر (پرانے وقتوں میں رئیسوں، زمینداروں یا نوابوں کے درباروں میں جمعدار وہ شخص ہوتا تھا جو خادموں، چوکیداروں یا دربانوں کا نگران ہوتا	Jamadar (rank in police/army), Sergeant
سوز	وہ اشعار جو مرثیہ خواں اصل مرثیہ شروع کرنے سے پہلے پڑھتے ہیں	Pain, Pathos, Melancholy

3.5 مشقیں

مشق 1: نیچے دیے گئے مرزا ہادی رسوا کے ناولوں کا تعارف اپنے الفاظ میں لکھیے۔

ذات شریف: .....

.....

.....

شریف زادہ: .....

.....

.....

مشق 2: دیے گئے جملوں میں صحیح اور غلط کی نشاندہی کیجیے۔

1. ناول ایک نثری قصہ ہے۔ ( )
2. مرزا ہادی رسوا لکھنؤ کے محلہ کوچہ آفرین خان میں 1858 میں پیدا ہوئے۔ ( )
3. رسوا کا انتقال حیدرآباد میں 1931 میں ہوا۔ ( )
4. "خونی شہزادہ" رسوا کا جاسوسی ناول ہے۔ ( )
5. امراؤ جان ادا کا نام امیرن تھا۔ ( )

3.6 نمونہ امتحانی سوالات

3.6.1 معروضی سوالات:

1۔ امراؤ جان ادا کس کی تصنیف ہے؟

(a) نذیر احمد (b) مرزا ہادی رسوا (c) پریم چند (d) سرشار

2۔ مرزا ہادی رسوا نے امراؤ جان ادا کے علاوہ اور کون سا ناول لکھا؟

(a) بنت الوقت (b) گئودان (c) شریف زادہ (d) میدان عمل

3۔ ناول امراؤ جان ادا میں کس شہر کی عکاسی ہے؟

(a) حیدرآباد (b) فیض آباد (c) لکھنؤ (d) بنارس

4۔ خانم کس ناول کا کردار ہے؟

(a) گئودان (b) آگ کا دریا (c) شریف زادہ (d) امراؤ جان ادا

5۔ ناول امراؤ جان میں شہر فیض آباد کے لیے کون سا نام آیا ہے؟

(a) حویلی (b) بنگلہ (c) محل (d) سرائے

6۔ امراؤ جان ادا میں کس طبقہ کے کلچر کی نمائندگی ہے؟

(a) مزدور طبقہ (b) طوائف کلچر (c) نوابین اودھ (d) نظام کلچر

7۔ مرزا ہادی رسوا کی ولادت کس شہر میں ہوئی؟

(a) حیدرآباد (b) عظیم آباد (c) لکھنؤ (d) رام پور

8۔ مشہور ناول نگار مرزا ہادی رسوا کا انتقال کس شہر میں ہوا؟

(a) لکھنؤ (b) حیدرآباد (c) بنارس (d) فیض آباد

9۔ مرزا ہادی رسوا کس ادارے سے وابستہ تھے؟

(a) دلی کالج (b) فورٹ ولیم کالج (c) دارالترجمہ عثمانیہ (d) لکھنؤ یونیورسٹی

10۔ رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کا موضوع کیا ہے؟

(a) لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب (b) دلی کی تاریخ (c) مغلیہ عہد (d) قطب شاہی عہد

3.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. مرزا ہادی رسوا کی ناول نگاری کے بارے میں لکھیے۔
2. امراؤ جان کا قصہ تحریر کیجیے۔
3. ناول شریف زادہ کے بارے میں لکھیے۔
4. ناول اختری بیگم پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. رسوا کی ناولوں کا تعارف کروایئے۔

3.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. مرزا ہادی رسوا کے حالات زندگی بیان کیجیے۔
2. امراؤ جان ادا ناول پر اپنی رائے کا اظہار کیجیے۔
3. امراؤ جان ادا کا خلاصہ بیان کیجیے۔

3.6.1 کے جوابات:

A (i)	B (ii)	A (iii)	C (iv)	D (v)
C (vi)	A (vii)	A (viii)	D (ix)	A (x)

اکائی4:ناول

(شکست: کرشن چندر)

اکائی کے اجزا

4.0		تمہید
4.1		مقاصد
4.2		ناول "شکست"
	4.2.1	کرشن چندر کا تعارف
	4.2.2	کرشن چندر کی ناول نگاری
	4.2.3	ناول "شکست" متن (اقتباس)
	4.2.4	خلاصہ
4.3		اکتسابی نتائج
4.4		مشکل الفاظ
4.5		مشقیں
4.6		نمونہ امتحانی سوالات

4.0 تمہید

کرشن چندر اردو افسانوی ادب میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں اپنے زمانے کے محنت کش افراد کی زندگی اوران کے مختلف مسائل کی حقیقی عکاسی کی۔ان کے ناول اور افسانے موضوع کے ساتھ ساتھ پلاٹ، کردار نگاری، اسلوب اور دیگر فنی خوبیوں کے لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہیں۔ انھوں نے ڈرامے اور مضامین بھی لکھے اور فلموں سے بھی وابستہ رہے۔ وہ اپنے ناولوں اور افسانوں کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں مشہور ہوئے۔ ان کے ناولوں کے ترجمے ہندوستان کی تقریباً تمام بڑی زبانوں کے علاوہ دنیا کی کئی زبانوں میں ہوئے۔ کرشن چندر ان ادیبوں میں سے ہیں جو ترقی پسند تحریک کے آغاز کے زمانے سے ہی اس سے وابستہ رہے۔ کرشن چندر نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں عوام کے مختلف سماجی، معاشی، اخلاقی اور نفسیاتی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔

اس اکائی میں آپ کو کرشن چندر کی حیات اور ناول نگاری سے واقف کرایا جارہا ہے ۔ اس میں کرشن چندر کے مشہور ناول

"شکست" سے اقتباس بھی پیش کیا جارہا ہے۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- کرشن چندر کے حالاتِ زندگی بیان کر سکیں۔
- کرشن چندر کی شخصیت کی نمایاں خصوصیات پر روشنی ڈال سکیں۔
- کرشن چندر کی ادبی خدمات پر گفتگو کر سکیں۔
- کرشن چندر کے ناول "شکست" کی نمایاں خصوصیات واضح کر سکیں۔

4.2 ناول "شکست" (اقتباس)

4.2.1 کرشن چندر کا تعارف:

کرشن چندر وزیر آباد (ضلع گوجرانوالہ، پاکستان) میں 23 نومبر 1914ء کو پیدا ہوئے۔ کرشن چندر کے والد گوری شنکر پیشے سے ڈاکٹر تھے اور والدہ پر میشوری دیوی ایک گھریلو خاتون تھیں۔ ان کے والد جہاں خاموش، سنجیدہ مزاج، اعتدال پسند اور انسانیت پرست تھے وہیں ان کی والدہ تیز مزاج خاتون تھیں۔ وہ ذات پات میں یقین رکھتی تھیں اور کرشن چندر کو غیر برادری کے ساتھ گھلنے ملنے اور کھیلنے سے منع کرتی تھیں۔ ڈاکٹر گوری شنکر آریہ سماجی تھے اور مورتی پوجا اور اوہام پرستی کے سخت مخالف، جبکہ پر میشوری دیوی پرانے خیالات کی خاتون تھیں۔ اس کی وجہ سے دونوں میں اکثر تو تو میں میں ہوتی رہتی تھی۔ کرشن چندر جو بچپن سے ہی حساس واقع ہوئے تھے، ان پر اس کا گہرا اثر پڑا اور وہ آہستہ آہستہ ذات پات اور مذہب سے دور ہوتے گئے۔

کرشن چندر پانچ سال کی عمر میں ہنڈر (پونچھ، کشمیر کا ایک علاقہ) کے پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔ آٹھویں جماعت سے انھوں نے وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول پونچھ میں تعلیم حاصل کی۔ وہاں سابق مرکزی وزیر گلزاری لال نندہ کے والد بلاقی رام نندہ ان کے استاد تھے جنھیں اردو، فارسی، انگریزی، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ تمام مضامین پر یکساں عبور حاصل تھا۔ ماسٹر بلاقی رام بہت سخت گیر تھے۔ وہ کرشن چندر کی فارسی کی استعداد اچھی نہ ہونے کی وجہ سے اکثر پٹائی کرتے رہتے تھے۔ ان کی مسلسل ڈانٹ پھٹکار سے تنگ آکر کرشن چندر نے "پروفیسر بلیکی" کے عنوان سے ان پر ایک طنزیہ مضمون لکھا جو ہفتہ وار "ریاست" دہلی میں شائع ہوا۔ پورے علاقے میں وہ مضمون مشہور ہو گیا۔ کرشن چندر کے والد اس پر بے حد ناراض ہوئے۔ ان کے خوف سے بہت دنوں تک کرشن چندر کو کچھ لکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

کرشن چندر کو درسی کتابوں سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ امتحان قریب آتا تو ایک ماہ دل لگا کر پڑھ لیتے اور اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جاتے۔ ان کا زیادہ تر وقت غیر درسی کتابیں پڑھنے خصوصاً افسانوی ادب کے مطالعہ میں گزرتا تھا۔ اسکول کے زمانے میں وہ کرکٹ کے اچھے کھلاڑی تھے۔ اس کے علاوہ ہاکی، فٹ بال، گھڑ سواری، موسیقی اور مصوری سے بھی انہیں دلچسپی تھی۔ انھیں ڈرامے سے بھی رغبت تھی۔ اور ایک بار انھوں نے مہابھارت کے ڈرامے میں ارجن کا کردار ادا کیا تھا۔

1927ء میں کرشن چندر نے میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن سے کامیاب کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے ان کے والد نے انھیں اپنے بڑے بھائی کے پاس لاہور بھیج دیا۔ لاہور جانے کے بعد بھی کرشن چندر کا پونچھ سے رشتہ قائم رہا اور تعطیلات میں وہ اکثر پونچھ آتے رہے۔ وہاں کی دلفریب فضا اور قدرتی مناظر ان کے شعور اور لاشعور میں اس قدر رچ بس گئے تھے کہ ابتدائی دور کی تخلیقات میں ان کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ ان کی ابتدائی چار کہانیوں یرقان، جہلم میں ناؤ پر، آنگی، اور مصوری کی محبت اور پہلے ناول "شکست" کا پس منظر پونچھ کا علاقہ مہنڈر ہی رہا ہے۔

1931 میں کرشن چندر نے فارمن کرسچن کالج، لاہور سے ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ بی اے میں انھوں نے سیاسیات، معاشیات، تاریخ اور ادب کے مضامین لیے اور 1933ء میں امتحان پاس کیا۔ 1935ء میں انھوں نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ والدہ کے اصرار پر انھوں نے لا کالج لاہور میں داخلہ لیا اور 1937ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ اس زمانے میں کنھیالال کپور اور اوپندر ناتھ اشک سے ان کی دوستی ہوئی۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد کرشن چندر نے فیصلہ کیا کہ وہ وکالت کا پیشہ اختیار نہیں کریں گے۔ کنھیالال کپور کے توسط سے انھیں ایک پبلشر کے یہاں نوکری مل گئی۔ لیکن وہاں دس دس گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا اور ڈیڑھ سو روپیہ تنخواہ ملتی تھی۔ وہ بہت جلد ہی اس کام سے اوب گئے اور نوکری چھوڑ دی۔ انھوں نے علامہ اقبال کی شاعری پر پی ایچ ڈی کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن بعض وجوہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔

اسی زمانے میں کرشن چندر نے افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ ان کا اولین افسانہ "یرقان" ہے جو مولانا صلاح الدین احمد نے اپنے رسالے "ادبی دنیا" میں تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے بعد سے کرشن چندر کے افسانے اس زمانے کے مشہور ادبی رسائل ہمایوں، ادبی دنیا، شاہکار، ادب لطیف، نیرنگ خیال، اور عالمگیر وغیرہ میں مسلسل شائع ہوتے رہے۔ بہت جلد ان کا شمار صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہونے لگا۔ یہی وہ دور ہے جب وہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہوئے۔ 1938 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کلکتہ میں ہوئی تو انھیں انجمن کی پنجاب شاخ کا سکریٹری بنایا گیا۔ نومبر 1939 میں کرشن چندر نے آل انڈیا ریڈیو، لاہور میں بحیثیت پروگرام اسٹنٹ جوائن کیا۔ ایک سال بعد ان کا تبادلہ آل انڈیا ریڈیو، دہلی میں ہو گیا۔

جہاں اس وقت سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، ن م راشد اور دیویندر ستیار تھی جیسے بہترین قلم کار جمع تھے۔ ان سب ہی کے ساتھ کرشن چندر کے اچھے مراسم رہے۔ کرشن چندر نے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے زمانے میں کئی اچھے ڈرامے لکھے۔ دروازہ، قاہرہ کی ایک شام، نیل کنٹھ، سرائے کے باہر وغیرہ ڈرامے دہلی اسٹیشن سے نشر ہوئے اور بے حد مقبول ہوئے۔ منٹو کی رفاقت میں ان کی توجہ فلمی کہانیوں کی طرف مبذول ہوئی۔

1941ء میں کرشن چندر کا تبادلہ آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ میں ہو گیا۔ جہاں انھوں نے بطور ڈراما انچارج ملازمت کی۔ وہاں ابھی سوا سال کا عرصہ ہی گزرا تھا کہ انھیں شالیمار پکچرس، پونا کی جانب سے ملازمت کی پیش کش ہوئی جو انھوں نے قبول کر لی اور ریڈیو کی نوکری کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ پونا میں وہ کوئی چار سال رہے لیکن تمام مصروفیات کے باوجود ان کی ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔ 1946ء میں انھیں پندرہ سو روپے ماہانہ تنخواہ پر بمبئی ٹاکیز، ممبئی میں انچارج اسٹوری ڈپارٹمنٹ کے طور پر ملازمت ملی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہ

چل سکا۔ پھر انھوں نے ماڈرن تھیئٹرز کے نام سے اپنی فلم کمپنی بنائی اور دو فلمیں "سرائے کے باہر" اور "راکھ" بنائیں جو باکس آفس پر چل نہیں پائیں۔ 1960ء کے اواخر میں کرشن چندر مستقل قیام کی غرض سے دہلی پہنچے لیکن حالات کی ناسازگاری نے انھیں 1962 کی ابتدا میں ممبئی واپس جانے پر مجبور کر دیا۔

کرشن چندر کی پہلی شادی غالباً 1939 یا 1940 میں ودیاوتی سے ہوئی جن سے ایک بیٹا رنجن اور دو بیٹیاں کپلا اور الکا ہوئیں۔ پہلی بیوی سے ان کے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ انھوں نے دوسری شادی افسانہ نگار سلمیٰ صدیقی (رشید احمد صدیقی کی بیٹی) سے 7 جولائی 1961ء کو اسلامی رسوم کے مطابق کی۔ دوسری شادی کے بعد انھوں نے پہلی بیوی سے ازدواجی تعلقات منقطع کر لیے۔ لیکن بچوں اور ودیاوتی کے اخراجات کی کفالت عمر بھر کرتے رہے۔ سلمیٰ صدیقی کے ساتھ انھوں نے بھرپور اور کامیاب ازدواجی زندگی گزاری اور مثالی شوہر ثابت ہوئے۔ سلمیٰ صدیقی اور ان کے پہلے شوہر خورشید عادل منیر کے بیٹے راشد خورشید منیر کو انھوں نے اپنے بیٹے کی طرح چاہا اور اپنے ساتھ رکھا۔ راشد نے بھی اطاعت اور فرماں برداری میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جب کرشن چندر کو دل کا دورہ پڑا اور اسپتال میں داخل کیے گئے تو وہ رات رات بھر ان کے سرہانے بیٹھا رہتا۔ 8 مارچ 1977 کو طویل علالت کے بعد کرشن چندر کی وفات ہو گئی۔

کرشن چندر نے اپنی 63 سالہ زندگی کے تقریباً چالیس سال ادب کی خدمت میں گزارے۔ ان کے 22 افسانوی مجموعے، 45 ناول، 30 مختلف موضوعات پر کتابیں اور تین رپورتاژ شائع ہوئے۔ مختلف ہندوستانی زبانوں کے علاوہ انگریزی، روسی، ڈچ، فرانسیسی، جرمن، ناروین، چیک، پولستانی، ہنگرین اور سلواک وغیرہ زبانوں میں ان کی تخلیقات کے تراجم ہوئے۔ کرشن چندر نے کئی بیرونی ممالک کی سیاحت کی۔ حکومت ہند نے انھیں پدم شری کا خطاب عطا کیا۔ نومبر 1956ء میں انھیں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ دیا گیا۔ 1959ء میں ممبئی میں بڑے پیمانے پر جشن کرشن چندر کا انعقاد کیا گیا۔ کرشن چندر اس معاملے میں خوش نصیب تھے کہ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی میں ہی کھلے دل سے کیا گیا۔

کرشن چندر پوری زندگی ظلم و استحصال کے خلاف جنگ کرتے رہے اور ہر قسم کی تنگ نظری سے بالاتر ہو کر ضرورت مندوں اور مجبوروں کی مدد کی۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہونے والی ناانصافی کے خلاف آواز اٹھنی چاہیے۔ ان کی تمام تخلیقات اس بات کی گواہ ہیں۔ طلسم خیال، نظارے، ہوائی قلعے، گھونگھٹ میں گوری جلے، زندگی کے موڑ پر، نئے افسانے، نغمے کی موت، پرانے خدا، ان داتا، ہم وحشی ہیں، اجنتا سے آگے، ایک گرجا ایک خندق، ایک روپیہ ایک پھول، ہائیڈروجن بم کے بعد، کتاب کا کفن، مسکرانے والیاں وغیرہ کرشن چندر کے مشہور افسانوی مجموعے ہیں۔ "مہالکشمی کا پل"، "گرجن کی ایک شام"، "کالو بھنگی"، "پورے چاند کی رات"، "جامن کا پیڑ"، "پشاور ایکسپریس"، "آدھے گھنٹے کا خدا"، "دو فرلانگ لمبی سڑک"، "تائی ایسری"، "غالیچہ" اور "ان داتا" وغیرہ کرشن چندر کے اہم افسانے ہیں۔ "شکست"، "جب کھیت جاگے"، "دل کی وادیاں سو گئیں"، "ایک گدھے کی سرگزشت"، "ایک عورت ہزار دیوانے"، "غدار"، "دادر پل کے بچے" وغیرہ ان کے اہم ناول ہیں۔ ان کے ڈراموں کا مجموعہ "دروازے کھول دو" کے نام سے شائع ہوا۔ ظرافت نگاری سے انھیں خاص شغف تھا۔ ان کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں کا مجموعہ "ہوائی قلعے" کے نام سے شائع ہوا۔ انھوں نے ادبِ اطفال پر بھی توجہ دی اور بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں لکھیں۔

4.2.2 کرشن چندر کی ناول نگاری:

کرشن چندر اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ترقی پسند ادیب تھے۔ ان کے تمام ناولوں اور افسانوں میں اس تحریک کے آدرشوں کا احترام ملتا ہے۔ کرشن چندر نے اردو فکشن کو نیا لب ولہجہ عطا کیا، اسلوب اور ہیئت کے نئے نئے تجربے کیے اور کردار نگاری کے ضمن میں بھی جدت طبع کا ثبوت پیش کیا۔ ان کے ناولوں کے مواد، موضوع، پلاٹ، کردار نگاری، منظر نگاری غرض ہر جگہ انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ کرشن چندر نے اپنے ناولوں میں ملک و معاشرے کے تمام سیاسی، سماجی، معاشی، اخلاقی اور نفسیاتی مسائل سے نبرد آزما ہونے والے افراد کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ ایک درد مند دل رکھتے تھے اور ہر کسی کا درد محسوس کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے انسانی سماج کا خواب دیکھتے تھے جس میں کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ناانصافی نہ ہو۔ ہر انسان کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی ہو۔ چنانچہ وہ پوری دنیا کے مظلوم طبقے کے ساتھ تھے۔ انھوں نے دنیا میں ہونے والی ہر ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا خواہ وہ طاقت کی بنیاد پر ہو یا ذات اور نسلی امتیاز کی بنیاد پر سامراجیت کی بنیاد پر ہو یا مذہبی فرقہ پرستی کی بنیاد پر۔ ایک سچے فنکار کی حیثیت سے انہوں نے تمام مظلوموں کا درد محسوس کیا اور اس کے خلاف لکھا۔

کرشن چندر کے ناولوں کے موضوعات متنوع ہیں۔ انھوں نے دیہی زندگی کے ساتھ ساتھ شہری زندگی سے بھی اپنے موضوعات منتخب کیے ہیں۔ دیہی زندگی کے ضمن میں کشمیر کے دیہات کی جتنی خوبصورت تصویر کشی انھوں نے کی ہے، کوئی اور ناول نگار نہیں کر سکا۔ انھوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے دن چونکہ کشمیر کے دلفریب وادیوں میں گزارے اسی لیے وہ وہاں کے ماحول اور زندگی سے پوری طرح آشنا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں کشمیری ماحول اور معاشرت کی عکاسی میں حقیقی انداز ملتا ہے۔ انھوں نے ایک طویل عرصہ ممبئی میں گزارا۔ چنانچہ وہاں کی زندگی سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے ممبئی کے صنعتی اور فلمی ماحول پر کئی ناول لکھے۔ ان میں ممبئی کا دولت مند طبقہ، فلمی دنیا کا ماحول، فٹ پاتھ اور جھونپڑپٹیوں میں رہنے والوں کی زندگی، غرض ممبئی کی زندگی کے تمام پہلو نظر آتے ہیں۔ ان ناولوں میں انھوں نے انفرادی اور سماجی استحصال اور انسانی فطرت کے فکری اور جذباتی تضادات کے مختلف زاویوں کو فنکاری سے ابھارا ہے۔

کرشن چندر نے اپنے ناول "شکست" میں امیر غریب اور اونچ نیچ کے فرق کو موضوع بنایا ہے۔ ذات پات کی پابندیاں، مذہب و تہذیب کا فرق، نوجوانوں، عورتوں اور مردوں کی جذباتیت، ان کی نفسیاتی پیچیدگی، دولت مندوں کی خود غرضی، غریبوں کی مجبوری، ان کے اندر دبا ہوا باغیانہ جذبہ، مذہبی رہنماؤں کا ڈھکوسلہ اور ان کی ریاکاری، سیاست کے ہاتھوں عوام کا استحصال اور دوسری طرف محنت کی طاقت اور فتح مندی، نوعِ انسانی کی روحانی خوبصورتی اور فطرت کے حسن کا فیض عام، اس ناول میں سب کچھ موجود ہے۔ "شکست" میں کشمیر کے قدرتی حسن کی عکاسی بے حد فنکاری سے کی گئی ہے۔ اس کا اسلوب بھی سحر انگیز ہے۔ خوبصورت تشبیہات، بلیغ استعارات، مختصر فقروں اور کرداروں کی نفسیات کے پیچ و خم کو آشکار کرنے والے مکالموں کے سحر میں قاری کھو جاتا ہے۔ کردار نگاری کے لحاظ سے بھی یہ ناول اہم ہے اس کے کردار مختلف طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ شیام، ونتی، موہن سنگھ، چندرا، علی جو، پنڈت سوروپ کشن، چھایا اور غلام حسین، یہ سبھی جیتے جاگتے کردار ہیں۔ ان میں کوئی تصنع یا بناوٹ نہیں۔ ان کی دوستی، ان کی دشمنی، ان کی سوچ و فکر، ان کا عمل ان کے طبقے کے احساسات، خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کرتا ہے۔

ناول کی کہانی یہ ہے کہ شیام اور ونتی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ شیام متوسط طبقے کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جو سماجی انقلاب کا خواب دیکھتا ہے لیکن اس میں سماج کے ٹھیکے داروں اور رسوم ورواجات سے ٹکرانے اور اپنے خوابوں کو سچ بنانے کی ہمت نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی مرضی کے خلاف اس کی منگنی کر دی جاتی ہے اور وہ خاموش رہتا ہے۔ ونتی کی بھی زبردستی شادی کر دی جاتی ہے وہ محبت میں ناکامی کی وجہ سے خودکشی کر لیتی ہے۔ دوسری طرف چندرا اور موہن سنگھ کی محبت ہے۔ موہن سنگھ راجپوت ہے اور چندرا ایک اچھوت۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور اپنی محبت کی راہ میں آنے والے ہر پتھر کو ہٹانے کا حوصلہ اور ہمت رکھتے ہیں۔ چندرا ہر قسم کے ظلم وجبر کے خلاف آواز اٹھاتی ہے لیکن شکست اس کا بھی مقدر بنتی ہے۔ پنڈت سروپ کشن کا چھوٹا بھائی بسنت کشن چندرا پر بری نظر رکھتا ہے۔ ایک دن موقع پاکر وہ اس کے ساتھ دست درازی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بات جب موہن سنگھ کو معلوم ہوتی ہے تو وہ اس پر حملہ کر دیتا ہے۔ وہ خود بھی زخمی ہوتا ہے اور بہتر علاج نہ ہونے کی وجہ سے موہن سنگھ کی موت ہو جاتی ہے اور اس صدمے کی تاب نہ لاکر چندرا اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہے۔

"جب کھیت جاگے "کا موضوع آزادی ہند کے کچھ عرصہ بعد تلنگانہ علاقے میں شروع ہونے والی طبقاتی جدوجہد ہے۔ اس میں جاگیرداروں کے ذریعے کسانوں اور مزدوروں کے استحصال کے خلاف ہونے والے احتجاج کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ناول میں دونوں طبقوں کے کردار اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے آپس میں ٹکراتے ہیں۔ اس ناول میں راگھوراؤ مزدور طبقے کی بے بسی اور استحصال کے خلاف پیدا ہونے والی نفرت اور غم وغصہ کا نمائندہ ہے۔ جگن ناتھ ریڈی اور پرتاپ ریڈی جاگیردار طبقے کے نمائندہ ہیں۔

"ایک عورت ہزار دیوانے" میں مظلوم عورت کے جذبۂ بغاوت کا بیان خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ اس ناول کی مرکزی کردار ایک خوبصورت خانہ بدوش لڑکی لاچی ہے۔ وہ گل سے محبت کرتی ہے لیکن اس کے والدین اس کی شادی ایک بوڑھے سردار دماروسے کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس کا قرض ادا ہو سکے۔ وہ قرض ادا کرنے کی بہت کوشش کرتی ہے لیکن وہ جہاں جاتی ہے، مدد کے بدلے لوگ اس سے اپنی ہوس پوری کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سخت محنت اور مشقت کے باوجود پوری رقم نہیں جمع کر پاتی۔ وہ شادی سے انکار کرتی ہے اور شادی کی رات وہ وحشت میں سردار کو ہلاک کر دیتی ہے۔ اس پر قتل کا مقدمہ چلتا ہے اور اس جرم میں سزا ہو جاتی ہے۔ جیل میں بھی سب اہلکار اس پر بری نظر رکھتے ہیں لیکن وہ کسی کو پاس پھٹکنے نہیں دیتی۔ جیل میں چیچک کی وجہ سے نہ صرف اس کا چہرہ بدنما ہو جاتا ہے بلکہ بینائی بھی جاتی رہتی ہے۔ اسے جیل سے رہا کر دیا جاتا ہے۔ اس کی بدصورتی کی وجہ سے گل بھی اس سے منہ موڑ لیتا ہے۔ البتہ وہ کچھ روپے منی آڈر سے اس کے پاس بھیجتا ہے جس پر بھیجنے والے کا نام اور پتہ درج نہیں ہے۔ لاچی اپنی غربت کے باوجود وہ رقم قبول نہیں کرتی اور اسے حقارت سے ٹھکرا دیتی ہے۔

"طوفان کی کلیاں" میں کشمیر کی ڈوگرہ شاہی حکومت اور اس کے اہل کاروں کے خلاف کشمیری عوام کے جذبات اور احساسات کی تصویر کشی تاریخی وسماجی حقائق کی روشنی میں کی گئی ہے۔ اس ناول میں جاگیرداروں کے ظلم واستحصال کو اس قدر فنکاری سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری کا دل ودماغ ان کے خلاف نفرت سے بھر جاتا ہے۔ کرشن چندر نے ایسے ملاؤں اور پنڈتوں کی بھی قلعی کھولی ہے جو مذہب کے نام پر کسانوں کو اپنی حالت پر صبر کرنے اور ہر ظلم وزیادتی کو چپ چاپ برداشت کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں وہ ان مظلوموں کے جذبۂ احتجاج اور بغاوت کو بھی دبا دیتے ہیں۔ یہ دراصل جاگیرداروں کے آلہ کار ہیں۔

"دل کی وادیاں سو گئیں" میں کرشن چندر نے طبقاتی کشمکش اور اقتصادی عدم مساوات سے پیدا ہونے والی صورت حال کی عکاسی کی ہے۔ اس میں انھوں نے استحصال کرنے والے، استحصال سہنے والے اور استحصال کے خلاف آواز اٹھانے والے تینوں طبقوں کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ "آسمان روشن ہے" میں کرشن چندر نے جنگ کی ہولناکیوں سے واقف کرایا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح مٹھی بھر لوگ اپنے ذاتی مفاد کے لیے پوری انسانیت کا قتل کرنے پر آمادہ ہیں۔ ایک ادیب اسحاق اپنی محبوبہ کی بے وفائی کی تاب نہ کر اپنا سارا مال و متاع سمیٹ کر ممبئی سے کھنڈالہ جاتا ہے تاکہ وہ کسی ہوٹل میں کچھ دن عیش کی زندگی گزارے اور اس کے بعد خودکشی کر لے۔ ہوٹل میں قیام کے دوران ایک جرمن خاتون ایلیسا سے اس کی ملاقات ہوتی ہے جو اس کا رخ موت کی جانب سے موڑ کر ایک نئی زندگی کے ولولے سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ وہ اسے دوسری عالمی جنگ کی ہولناکیوں کے بارے میں بتاتی ہے جس میں اس کے خاوند کے ماں باپ مارے گئے تھے اور وہ خود دونوں جرمنی سے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ گزیں ہو گئے تھے تاکہ سکون سے زندگی گزار سکیں۔ اس کے بعد اسحاق خودکشی کا ارادہ ترک کر دیتا ہے اور نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔

"غدار" میں تقسیمِ ملک کے دوران بھڑک اٹھنے والے فرقہ وارانہ فسادات اور اس کے پس منظر میں ایک ہندو لڑکے اور مسلمان لڑکی اور ایک ہندو لڑکی اور مسلمان لڑکے کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ ناول کا ہیرو بیچ ناتھ پیار کی علامت بن گیا ہے جو ثابت کرتا ہے کہ مذہبی منافرت اور فرقہ پرستی کا جنون پیار اور محبت پر غالب نہیں آسکتا۔ "ایک گدھے کی سرگزشت" میں عام آدمی کی مجبوری اور بے بسی اور اعلیٰ اور حکمراں طبقہ کی مفاد پرستی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ گدھے کے حوالے سے سیاسی بدنظمی، افسر شاہی، دفتری نظام کی نااہلی، لوٹ کھسوٹ، بدعنوانی اور رشوت خوری پر کرشن چندر نے تیکھے انداز میں طنز کیا ہے۔ "دادر پل کے بچے" میں ممبئی کی زندگی کے گھناؤنے پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ کس طرح غربت کی وجہ سے چھوٹے بچے یا تو کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں یا جرائم کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ اس پہلو پر کرشن چندر نے بڑے ٹھنڈے دل سے اور ہمدردانہ انداز میں غور کیا ہے۔ "زرگاؤں کی رانی" میں ایک پہاڑی ریاست کے شاہی ماحول کے پس منظر میں ایک گزرے ہوئے عہد، سماج اور اس کے اقدار کو مجسم کیا گیا ہے۔ "میری یادوں کے چنار" اور "مٹی کے صنم" کرشن چندر کے سوانحی ناول ہیں۔ "آدھے سفر کی پوری کہانی" میں انھوں نے اپنی زندگی کے منتخب واقعات اور ان کے ذہن و فکر پر غیر معمولی اثر ڈالنے والے افراد کا احاطہ کیا ہے۔

کرشن چندر کے بعض ناولوں میں پلاٹ اور کردار سازی کے بجائے مسائل اور فضا آفرینی پر زور ملتا ہے۔ برف کے پھول، سڑک واپس جاتی ہے، جب کھیت جاگے، ایک وائلن سمندر کے کنارے، کاغذ کی ناؤ، پانچ لوفر وغیرہ کا مطالعہ کرتے وقت پلاٹ کے ارتقا کا اتنا احساس نہیں ہوتا، جتنا مسائل اور فضا کا۔ کرشن چندر کو فضا سازی میں کمال حاصل ہے اور اس سے انہوں نے اپنے ناولوں میں خوب کام لیا ہے۔ منظر نگاری اور جزئیات نگاری کی مدد سے وہ اسے دلکش بناتے ہیں اور اس میں حقیقت کا رنگ بھرتے ہیں۔

کرشن چندر کے ناولوں میں رومانیت اور حقیقت کی آمیزش ملتی ہے۔ ان کے زیادہ تر ناولوں میں رومانی فضا ملتی ہے۔ وہ زندگی سے متعلق رجائی نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ ان کو انسانیت پر پورا اعتماد تھا۔ ان نظریات و خیالات کا اظہار ان کے ناولوں کے موضوعات، واقعات اور کرداروں کے ذریعے بہ خوبی ہوا ہے۔ ان کے ناول طویل نہیں ہیں، نہ ہی ان میں زیادہ کردار نظر آتے ہیں لیکن وہ اس قدر دلچسپ ہیں کہ

پڑھنے والے کو متاثر کرتے ہیں۔ وہ اپنے ناولوں میں فضابندی پر پوری توجہ دیتے ہیں تا کہ موضوع اپنی پوری شدت کے ساتھ واضح ہو سکے۔ ان کے کردار موضوع اور فضا سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔ ان کے ناولوں کی زبان پر رومانیت کا گہرا اثر ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ نرم ،سبک اور دلکش الفاظ کے ذریعے جب مناظر کی تصویر کشی کرتے ہیں تو پڑھنے والا ان کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اپنے ناولوں کے موضوعات، کردار اور فنی خوبیوں کی وجہ سے کرشن چندر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

4.2.3 ناول "شکست" متن: (اقتباس)

"میلے سے واپس آکر شیام کی والدہ نے اپنے پتی سے مشورہ کیا۔

"میرے خیال میں منگنی کے تلک موقع پر اپنے چند ایک رشتہ داروں کو بھی بلا بھیجنا چاہیے۔ میں اپنی بہن اور اس کے لڑکے کو خط لکھ دیتی ہوں۔ آپ شیام کی پھوپھی اور پھوپھا کو خط لکھ کر بلا لیجئے۔"

"ایسی بھی کیا ضرورت ہے۔" تحصیلدار نے پس وپیش کرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے رشتہ داروں سے ملتے ہوئے گھبراتے تھے۔

"جی نہیں ہمارے گھر میں پہلا شگون ہے۔ اس موقع پر اپنی برادری کا ہونا ضروری ہے۔ یہاں برادری کا کون ہے۔"

شام کے والد نے سر ہلا کر پھر اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور اس کی والدہ نے پھر اصرار کیا۔ آخر وہ راضی ہو گئے۔

شام کی والدہ بولیں۔ "ایک بات اور ہے۔" اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئیں۔

"ہوں" تحصیلدار صاحب نے اپنے لب سکیڑ لیے۔ یہ ان کی پرانی عادت تھی۔ شیام کی والدہ ہچکچاتے ہوئے بولیں۔ "میں چھایا اور اس کی لڑکی کا یہاں زیادہ آنا جانا پسند نہیں کرتی۔"

تحصیلدار صاحب نے حیران ہو کر کہا۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

شیام کی والدہ نے رک کر کہا۔ "کچھ نہیں۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔ میں ان کی آمد و رفت کو پسند نہیں کرتی۔"

تحصیلدار صاحب نے حیرانی سے سر ہلایا۔ ان عورتوں کا مزاج بھی عجیب ہوتا ہے۔ ابھی دونوں سہیلیوں میں ایسی، اور ایک دم یہ قلب ماہیت۔ بولے۔۔۔۔۔ "بھئی تم جانو۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئے۔

اس گفتگو کے پانچ چھ روز بعد شیام کی والدہ نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "تمھارے شگون پر تمھارے پھوپھا جی، پھوپھی جی، چچا، چچی، موسی اور اس کا لڑکا آئیں گے۔ ہم نے ان سب کو خط لکھ دیا ہے۔ میں نے سوچا ہے اپنے گھر میں پہلا شگون ہے، اگر اس موقع پر بھی اپنی برادری نہ ہو تو دل میں کسک ہی رہتی ہے۔"

جی میں کسک؟ شیام کے جی میں کئی دنوں سے ایک مدھم میٹھی چبھتی سی کسک موجود تھی۔ اتنے دنوں سے ونتی ان کے ہاں نہ آئی تھی نہ چھایا، پتہ نہیں کیا بات تھی۔ شیام نے اداس لہجے میں کہا۔ "ماں تم اپنی ضد کرتی ہو۔ مجھے یہ منگنی مطلق پسند نہیں۔"

"تم پاگل ہو؟"

"میں پاگل صحیح۔ لیکن میں بیاہ نہ کروں گا۔" شیام نے ذرا جرأت آمیز لہجے میں کہا۔

"کیوں کیا چھایا کی لڑکی سے بیاہ کرنے کا ارداہ رکھتے ہو؟" اس کی ماں نے تلخ لہجے میں کہا۔ اس نے ایک تیز نگاہ اپنے بیٹے پر ڈالی، اور وہ اس چبھتی ہوئی نگاہ کی تاب نہ لا سکا۔

اس کی ماں نے اسی تلخ لہجے میں کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ ان کا آنا جانا یہ رنگ لائے گا۔ میں تمھیں بڑا شریف سمجھتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ دوسری عورتوں کے بیٹے برے ہوں میرے لال میں کوئی عیب نہیں۔"

"ماں۔"

"چپ رہو، میں سمجھتی ہوں۔ تم بالکل بھولے ہو۔ ان دونوں ماں بیٹیوں نے تم پر جادو کر دیا۔ ذرا سوچا تو ہوتا۔ نہ ہماری ذات، نہ برادری، نہ گوت نہ خاندان اچھا، نہ وہ روپے پیسے والے ہیں، نہ عزت والے۔ کوئی بات بھی تو ملتی نہیں۔ ہمارا ان کا نباہ کیسے ہو گا۔ گاؤں برادری بھی ان سے خفا ہے۔ سارے زمانے میں بدنام اور رسوا ہیں۔"

"ماں۔"

"اپنے ماں باپ کو اس زمانے میں کلنک کا ٹیکا لگوانا چاہتے ہو۔ لوگ کیا کہیں گے کہ تحصیل کا حاکم اپنے بیٹے کا ناطہ کہاں کیا۔ انھیں کوئی اور پاک صاف بے لاگ گھر نہ ملتا تھا جو ان چچوڑی ہوئی ہڈیوں پر جا گرے۔"

"ماں۔" شیام نے گرج کر کہا۔ اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔

"چچوڑی ہوئی ہڈی، کمینی، کم ذات، کتیا۔" اس کی ماں نے چلا کر کہا اور پھر وہ بستر پر جا گری اور دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ "میرے بیٹے، میرے لال کو ہتیائے لیے جاتی ہے۔"

اور وہ ان آنسوؤں کو ان سسکیوں کو برداشت نہ کر سکا۔ جیسے اس کا سارا عزم، ان آنسوؤں کی گرمی میں پگھل گیا تھا۔ جیسے وہ ایک اونچی، کائی سے ڈھکی ہوئی چٹان سے پھسل رہا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں کسی سہارے کو نہ پا کر گرتے جا رہے تھے۔ اس کے سارے جسم میں سنسنی سی پیدا ہو رہی تھی۔ ایک عجیب سا احساس جیسے وہ برسوں کو پیچھے پھلانگتا ہوا جا رہا تھا۔ اور اپنی جوانی اور لڑکپن کی منزلوں سے گزر کر پھر بچہ بن گیا تھا۔ جیسے وہ بچہ اپنی ماں کی چھاتی میں دودھ ٹٹولنا چاہتا تھا۔ جیسے اس کے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں پھر اپنی ماں کی آغوش میں مچلنے کے لیے بے قرار ہو اٹھے۔ اس کا سارا جسم ایک عجیب احساس سے کانپ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو روکنا چاہتا تھا لیکن نہ روک سکا۔ وہ اپنی ماں کے پاس چلا گیا اور اس نے اس کے گلے میں بازو ڈال دیے اور اس کے آنسوؤں کو پونچھ دیا اور اس کی چھاتی سے لگ کر بولا۔ "ماں مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو ماں۔"

اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

اور ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ "میرے لال، میرے لال۔۔۔۔۔"

اور اب اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو امڈ آئے تھے اور اس نے انھیں روکنے کی کوشش نہ کی اور وہ اس کے خشک بھورے رخساروں پر بہتے گئے اور وہ کہنے لگی۔

"بیٹا۔ کل گنگو مشر کے لڑکے کا بیاہ ہے، تمھیں بھی بلاوا آیا ہے۔ کل گنگو مشر کے ہاں بیاہ ہے۔ ڈھول بجیں گے، شہنائیوں کی آواز گونجے گی۔ آج گنگو مشر کی بیوی ہمارے ہاں نیوتا دینے آئی تھی۔ وہ کتنی خوش تھی۔ میرا بھی جی چاہتا ہے میرے گھر بھی خوشی ہو۔۔۔۔ تم میرے لال ہونا۔۔۔۔"

اور اب وہ احساس کہیں غائب ہو گیا تھا اور اس کی جگہ ایک تیز تلخی، ایک درشت یاسیت نے لے لی تھی۔ اور وہ بستر پر لیٹے لیٹے اپنی کمزوری پر اپنے اپ کو نفریں کرنے لگا۔ تم نرے پاجی ہو، گدھے ہو، حلوائی کے پِلّے کی طرح بزدل ہو۔ بزدل ہو۔ تم سن رہے ہو جی۔ تمھاری اس بزدلی نے کئی بار تمھیں زندگی کے صحیح راستے پر چلنے سے روک دیا اور تم اس مسرت، اس بے پایاں، لازوال مسرت کو حاصل کرنے سے ہمیشہ قاصر رہے جو اس تکلیف دہ خاردار راستے پر چلنے سے حاصل ہوتی ہے۔ تم ہمیشہ حلوائی کے پلے کی طرح اپنے اندھے جذبات کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے ٹیاؤں ٹیاؤں کرتے رہو گے۔ اور تمھاری زندگی اسی کتے کی خارش زدہ کھال کی طرح ہو جائے گی اور اس میں نہ چمک ہو گی نہ خوبصورتی، نہ بالوں کی ملائمت بلکہ خون اور پیپ بہتی ہوئی۔۔۔۔

گدھے، اُلّو، پاجی، بزدل، سن رہے ہو تم جی۔ اب بھی وقت ہے۔ اپنے آپ کو بچالو۔ ایک بار ہمت سے کام لو۔ میں کہتا ہوں، ایک بار۔ آخر کیا ہو جائے گا۔ تمھارے ماں باپ اس غم سے مر تو نہ جائیں گے۔ کیوں ڈر رہے ہو۔ صرف ایک بار، میں کہتا ہوں ایک بار ہمت سے کام لیں۔ تمھاری ٹیڑھی میڑھی پژمردہ زندگی اس نغمے کو چھیڑے گی جس کی تلاش میں وہ صدیوں سے حیران و پریشان ہے۔ ہمت سے کام لو۔ بزدل، نکمے، تخیلی، جنونی، جذباتی، نسائیت پسند۔

اور وہ اپنی لغت میں سے اپنے تئیں نئی نئی گالیاں تلاش کرنے لگا۔ لیکن اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اسے نیند نہ آتی تھی۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور آسمان پر بکھرے ہوئے ستارے چھوٹی چھوٹی چنگاریوں کی طرح اس کی آنکھوں میں کھبے جا رہے تھے۔۔۔۔ اور وہ اس اذیت ناک جلن کے احساس سے مجروح ہو کر اپنے بستر پر لوٹنے لگا۔۔۔۔

4.2.3 خلاصہ:

مندرجہ بالا اقتباس "شکست" کا بے حد اہم حصہ ہے۔ اس حصے میں ہمارے سماج میں موجود اونچ نیچ اور امیر غریب کے بھید بھاؤ کو بڑی خوبی کے ساتھ کرشن چندر نے پیش کیا ہے۔ مختلف کرداروں کی نفسیات سے بھی ہمیں اس حصے میں آگاہی ہوتی ہے۔ شیام، اس کے والد، اس کی ماں کی سوچ کے ساتھ ساتھ ان کے کردار سے ہمیں بھرپور آگاہی ہوتی ہے۔ شیام یہاں ہمیں ایک شکست خوردہ، مجبور اور بے بس نوجوان کی شکل میں نظر آتا ہے جس کے سارے ارمان مٹی میں ملتے نظر آرہے ہیں۔ وہ ونتی سے بے پناہ محبت کرتا ہے لیکن اس کی ماں کسی غریب گھر کی لڑکی کو اپنی بہو بنانے کے لیے تیار نہیں۔ وہ کسی دولت مند گھرانے میں اپنے بیٹے کی شادی کر کے اپنی امارت کا اظہار کرنا چاہتی ہے۔ اسے اپنے بیٹے کی خوشی سے زیادہ نمود و نمائش پسند ہے۔ شیام چاہ کر بھی ونتی سے شادی کے لیے اپنی ماں کو رضامند نہیں کر پاتا۔ وہ ماں کی ضد کے آگے ہار جاتا ہے۔ دولت جیت جاتی ہے اور محبت کی شکست ہو جاتی ہے۔ ناول کا عنوان اسی لیے "شکست" رکھا گیا ہے۔ یہ شکست

شیام کے اندر ہیجانی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ شیام کی خود کلامی سے اس کی ذہنی حالت، اضطراب، شدید غصہ، جھلاہٹ اور بے بسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"اور وہ بستر پر لیٹے لیٹے اپنی کمزوری پر اپنے آپ کو نفریں کرنے لگا۔ تم نرے پاجی ہو، گدھے ہو، حلوائی کے پلّے کی طرح بزدل ہو۔ بزدل ہو۔ تم سن رہے ہو جی۔ تمھاری اس بزدلی نے کئی بار تمھیں زندگی کے صحیح راستے پر چلنے سے روک دیا اور تم اس مسرت، اس بے پایاں، لازوال مسرت کو حاصل کرنے سے ہمیشہ قاصر رہے جو اس تکلیف دہ خاردار راستے پر چلنے سے حاصل ہوتی ہے۔"

شیام کی ماں کا رویہ، چھایا اور ونتی کے بارے میں اس کی سوچ، بیٹے سے محبت اور اس کی شادی کسی اعلیٰ خاندان میں دھوم دھام سے کرنے کی خواہش، سماج میں اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی خواہش وغیرہ کو ناول نگار نے بالکل فطری انداز میں اجاگر کیا ہے۔ یہاں عورت کی نفسیات سے بھی اچھی طرح واقف کرایا گیا ہے۔ شیام کی ماں اور ونتی کی ماں چھایا آپس میں گہری دوست ہیں۔ دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہے۔ لیکن جیسے ہی شیام کی ماں کو احساس ہوتا ہے کہ شیام ونتی کو چاہتا ہے وہ ان دونوں ماں بیٹی کی دشمن بن جاتی ہے اور اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ مجھے ان دونوں کا یہاں آنا جانا پسند نہیں۔

"شیام کی والدہ ہچکچاتے ہوئے بولیں۔ "میں چھایا اور اس کی لڑکی کا یہاں زیادہ آنا جانا پسند نہیں کرتی۔

تحصیلدار صاحب نے حیران ہو کر کہا۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

شیام کی والدہ نے رک کر کہا۔ "کچھ نہیں۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔ میں ان کی آمد و رفت کو پسند نہیں کرتی۔"

تحصیلدار صاحب نے حیرانی سے سر ہلایا۔ ان عورتوں کا مزاج بھی عجیب ہوتا ہے۔ ابھی دونوں سہیلیوں میں ایسی، اور ایک دم یہ قلب ماہیت۔ بولے۔ بھئی تم جانو۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئے۔"

شیام کے والد ایک ایسے شخص کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں جو گھر کے معاملات میں بیوی سے زیادہ بحث و تکرار پسند نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات اپنی وہ بیوی کی بات پسند نہ آنے کے باوجود مان لیتے ہیں۔

4.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- کرشن چندر وزیر آباد (ضلع گوجرانوالہ، پاکستان) میں 23 نومبر 1914ء کو پیدا ہوئے۔
- کرشن چندر نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں اپنے عہد کے محنت کشوں کی زندگی اور ان کے مسائل کی حقیقی عکاسی کی۔
- کرشن چندر کے ناولوں اور افسانوں میں موضوع، پلاٹ، کردار نگاری اور اسلوب کی ہم آہنگی ملتی ہے۔
- "شکست"، "جب کھیت جاگے"، "غدار"، "ایک گدھے کی سرگزشت" وغیرہ کرشن چندر کے مشہور ناول ہیں۔

- "مہالکشمی کا پل"، "گرجن کی ایک شام"، "کالو بھنگی"، "پورے چاند کی رات"، "جامن کا پیڑ"، "پشاور ایکسپریس"، "آدھے گھنٹے کا خدا"، "دو فرلانگ لمبی سڑک"، "تائی ایسری"، "غالیچہ" اور "ان داتا" وغیرہ کرشن چندر کے مشہور افسانے ہیں۔
- نمایاں ادبی خدمات کے لیے حکومت ہند نے کرشن چندر کو پدم شری کا خطاب عطا کیا۔
- کرشن چندر کو نومبر 1956ء میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ دیا گیا۔
- کرشن چندر کے والد گوری شنکر پیشے سے ڈاکٹر تھے اور والدہ پرمیشوری دیوی ایک گھریلو خاتون تھیں۔
- 1938 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کلکتہ میں ہوئی تو انھیں انجمن کی پنجاب شاخ کا سکریٹری بنایا گیا۔
- کرشن چندر کے 22 افسانوی مجموعے، 45 ناول، 30 مختلف موضوعات پر کتابیں اور تین رپورتاژ شائع ہوئے۔
- 8 مارچ 1977 کو طویل علالت کے بعد کرشن چندر کی وفات ہو گئی۔
- کرشن چندر کی شخصیت سادگی، خلوص، ایمانداری اور انسانی ہمدردی سے عبارت تھی۔
- "شکست" فنی اعتبار سے کرشن چندر کا شاہکار ناول ہے۔
- کرشن چندر نے اپنے ناول "شکست" میں امیر غریب اور اونچ نیچ کے فرق کو موضوع بنایا ہے۔
- "شکست" میں کشمیر کے قدرتی حسن کی عکاسی بے حد فنکاری سے کی گئی ہے۔
- "شکست" کا اسلوب نہایت دلکش ہے۔ خوبصورت تشبیہات، بلیغ استعارات، مختصر فقروں اور کرداروں کی نفسیات کے پیچ و خم کو آشکار کرنے والے مکالموں کے سحر میں قاری کھو جاتا ہے۔
- "شکست" کردار نگاری کے لحاظ سے بھی اہم ہے۔ اس کے کردار مختلف طبقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ شیام، ونتی، موہن سنگھ، چندرا، علی جو، پنڈت سوروپ کشن، چھایا اور غلام حسین، یہ سبھی جیتے جاگتے کردار ہیں۔

4.4 مشکل الفاظ

پس و پیش	اندیشہ، تشویش، شش و پنج، آگا پیچھا	Hesitation, Reluctance
شگون	مبارک گھڑی، نیک انجام، نسبت یا منگنی کی رسم ادا ہونا	Omen, Augury
رضامندی	منظوری	Consent, Approval
آمد و رفت	آنا جانا	Coming and going, Interaction
قلب ماہیئت	اصلیت بدل جانا، غیر معمولی بدلاو	Transformation, Change of nature
کسک	ٹیس، ہلکا درد	Pain, Twinge

مطلق	بالکل، قطعی، آزاد	Absolute, Unconditional
جرأت آمیز	دلیرانہ، بہادری کے ساتھ	Daring, Courageous
آغوش	گود	Lap, Embrace
رخسار	گال	Cheek, Face
تلخی	کڑواہٹ، ترشی، دشمنی	Bitterness, Harshness
درشت	سخت، کھردرا	Harsh, Rough
یاسیت	مایوسی، دکھی ہونا	Pessimism, Despair
نفریں	پھٹکار، لعنت ملامت	Curse, Malediction
لازوال مسرت	وہ خوشی جو کبھی ختم نہ ہو	Eternal happiness, Everlasting joy
خارش زدہ	کھجلی والا، جسے کھجلی کی بیماری ہو	Itchy, Affected by itch
پاجی	کمینہ، رذیل، شریر، بدمعاش	Mean, Wicked, Lowly
پژمردہ	افسردہ، مایوس، کمھلایا ہوا، مرجھایا ہوا	Withered, Faded
بزدل	ڈرپوک، کم ہمت، کم حوصلہ	Coward, Timid

4.5 مشقیں

مشق 1: نیچے دیے گئے کرشن چندر کے ناولوں کا تعارف اپنے الفاظ میں کیجیے۔

(1) شکست : .....

.....

.....

(2) جب کھیت جاگے: .....

.....

.....

(3) طوفان کی کلیاں: .....

.....

.....

(4) غدار: .....

.....

.....

4.6 نمونہ امتحانی سوالات

4.6.1 معروضی سوالات:

1۔ کرشن چندر کی ولادت کب ہوئی؟

(a) نومبر 1914 (b) دسمبر 1925 (c) اکتوبر 1911 (d) جنوری 1909

2۔ کرشن چندر کے پہلے افسانے کا نام کیا ہے؟

(a) میلہ گھومنی (b) یرقان (c) مہالکشمی کا پل (d) کالو بھنگی

3۔ کرشن چندر نے ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

(b) مہنڈر پونچھ کشمیر (b) دہلی (c) بمبئی (d) جالندھر

4۔ کرشن چندر نے کون سی فلم کمپنی قائم کی؟

(a) شالیمار (b) کتھاساگر (c) ماڈرن تھیئٹرز (d) راج کمل

5۔ "شکست" کس کا ناول ہے؟

(b) پریم چند (b) عصمت چغتائی (c) نذیر احمد (d) کرشن چندر

6۔ کرشن چندر کس ادبی تحریک سے وابستہ تھے؟

(b) رومانوی تحریک (b) علی گڑھ تحریک (c) ترقی پسند تحریک (d) جدیدیت

7۔ شیام کا کردار کرشن چندر کے کس ناول میں ملتا ہے؟

(b) شکست (b) جب کھیت جاگے (c) طوفان کی کلیاں (d) غدار

8۔ ناول "شکست" کا موضوع کیا ہے؟

(b) اونچ نیچ کا فرق (b) فرقہ واریت (c) تقسیم ہند (d) جنگ آزادی

9۔ آغوش کے کیا معنی ہیں؟

(b) ہاتھ (b) جھولا (c) گہوارہ (d) گود

10۔ کرشن چندر کی وفات کب ہوئی؟

1977 (a) 1980(b) 1960(c) 1972 (d)

4.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ کرشن چندر کے چند ناولوں کا تعارف پیش کیجیے۔

2۔ ناول "شکست" کے بارے میں لکھیے۔

3۔ محنت کش طبقے سے متعلق کرشن چندر کے خیالات ان کے ناولوں کی روشنی میں بیان کیجیے۔

4۔ کرشن چندر کا ناول "ایک عورت ہزار دیوانے" پر ایک نوٹ لکھیے۔

5 کرشن چندر کی شخصیت کی نمایاں خوبیاں کیا تھیں؟

4.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ کرشن چندر کے حالاتِ زندگی پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

2۔ کرشن چندر کی ناول نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

3۔ ناول "شکست" کا خلاصہ اپنے لفظوں میں پیش کیجیے۔

4.6.1 کے جوابات:

A (i) B (ii) A (iii) C (iv) D (v)

C (vi) A (vii) A (viii) D (ix) A (x)

بلاک II

اکائی 5: افسانہ

(نجات: پریم چند)

اکائی کے اجزا

5.0		تمہید
5.1		مقاصد
5.2		افسانہ: نجات
	5.2.1	پریم چند کا تعارف
	5.2.2	پریم چند کی افسانہ نگاری
	5.2.3	افسانہ نجات: متن
	5.2.4	خلاصہ
5.3		اکتسابی نتائج
5.4		مشکل الفاظ
5.5		مشقیں
5.6		نمونہ امتحانی سوالات

5.0 تمہید

پچھلی اکائی میں آپ نے پریم چند کے ناول "شکست" کے منتخب متن کا مطالعہ کیا۔ اردو فکشن میں ناول کی اگلی کڑی افسانہ ہے۔ اردو میں اس صنف کا باقاعدہ آغاز پریم چند سے ہوتا ہے۔ پریم چند نہ صرف اردو افسانے کے موجد ہیں بلکہ انہوں نے ہی اردو افسانے کو اس کی بلندی تک پہنچایا۔ اس اکائی میں ہم پریم چند کی افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ان کے ایک مشہور افسانے "نجات" کے متن کی قرات کریں گے اور اس کے خلاصے کا بھی مطالعہ کریں گے۔

5.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- پریم چند کا تعارف پیش کر سکیں۔
- پریم چند کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کر سکیں۔
- پریم چند کے افسانے "نجات" کی قرات کر سکیں۔
- افسانہ "نجات" کا خلاصہ بیان کر سکیں۔

5.2 افسانہ: نجات

5.2.1 پریم چند کا تعارف:

پریم چند اردو اور ہندی کے ایک عظیم افسانہ نگار، ناول نویس اور اصلاحی ادیب تھے۔ ان کا اصل نام دھنپت رائے تھا، لیکن ادبی دنیا میں وہ "پریم چند" کے نام سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں عام انسان کی زندگی، دکھ درد، سماجی ناانصافی اور طبقاتی فرق کو سچائی سے پیش کیا۔ پریم چند ایک متوسط طبقے کے کایستھ گھرانے میں 1880 میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی عجائب لال محکمہ ڈاک میں کلرک تھے۔ والدہ مذہبی، حساس اور نرم دل خاتون تھیں، جن کا اثر پریم چند کی شخصیت اور ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ پریم چند کا بچپن مشکلات سے بھرا ہوا تھا۔ وہ صرف 7 سال کے تھے جب ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور 14 سال کی عمر میں والد کا بھی سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ ان کا بچپن غربت، تنگی اور محرومی میں گزرا، جس کا گہرا اثر ان کی تحریروں میں جھلکتا ہے۔

پریم چند نے فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم مدرسے سے حاصل کی۔ بعد میں انہوں نے انگریزی میں بھی تعلیم حاصل کی۔ انگریزی ادب، خاص طور پر شیکسپیئر، ٹالسٹائی اور گوگول سے بھی متاثر ہوئے۔ پریم چند نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسکول میں استاد کے طور پر ملازمت کی۔ لیکن دل سے وہ ہمیشہ ایک ادیب تھے۔ 1930 کے بعد انہوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ دی اور مکمل طور پر ادب و صحافت کی طرف آ گئے۔

پریم چند نے ابتدا میں اردو زبان میں لکھنا شروع کیا اور "نواب رائے" کے قلمی نام سے کہانیاں لکھیں۔ 1908 میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "سوزِ وطن" شائع ہوا، جو آزادی اور حب الوطنی کے موضوع پر تھا، لیکن برطانوی حکومت نے اس پر پابندی لگا دی۔ بعد میں وہ ہندی میں بھی لکھنے لگے اور اس طرح وہ اردو و ہندی دونوں زبانوں کے عظیم ادیب کہلائے۔ پریم چند طویل علالت کے بعد 1936ء میں انتقال کر گئے۔

5.2.2 پریم چند کی افسانہ نگاری:

پریم چند اردو افسانہ نگاری کے بنیاد گزار اور روح رواں مانے جاتے ہیں، جنھوں نے اردو فکشن کو نئی سمت، نئی فکری جہت اور نئی تہذیبی بصیرت عطا کی۔ ان کے افسانے نہ صرف ادبی سطح پر اعلیٰ معیار رکھتے ہیں بلکہ سماجی شعور، انسانی ہمدردی اور اخلاقی اقدار کا آئینہ بھی

ہیں۔ وہ ایک ایسے افسانہ نگار تھے جنہوں نے افسانے کو شاعری کی طرح محض تفریح کا ذریعہ نہ رہنے دیا بلکہ اسے انسانی مسائل، سماجی تضادات، طبقاتی کشمکش اور اصلاحی پیغام کا وسیلہ بنا دیا۔

پریم چند کی افسانہ نگاری کی سب سے نمایاں خصوصیت حقیقت پسندی ہے۔ ان کے افسانوں میں ہمارے گرد و پیش کی حقیقی دنیا، خاص طور پر دیہی ہندوستان کی تصویر ملتی ہے۔ انہوں نے جاگیر داری نظام، کسانوں کی زبوں حالی، سماجی ناہمواری، ذات پات کے امتیازات، عورتوں کی محکومی، مزدوروں کی محرومی اور سامراجی استبداد جیسے موضوعات کو گہرائی سے محسوس کیا اور ان کی عکاسی اپنے افسانوں میں انتہائی سادگی مگر شدت کے ساتھ کی۔

پریم چند کی تحریریں صرف کہانی سنانے کے لیے نہیں بلکہ معاشرتی اصلاح کے جذبے سے سرشار ہوتی ہیں۔ وہ ادب کو سماج کی اصلاح کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کے افسانے ہمیں بتاتے ہیں کہ ظلم، ناانصافی، جہالت، فرقہ پرستی اور ناقدری کا خاتمہ ضروری ہے۔ ان کے افسانے نہ تو خطیبانہ ہوتے ہیں اور نہ ہی مصنوعی طور پر وعظ کرتے ہیں، بلکہ انسانی حالات و جذبات کی سچی تصویر دکھا کر قاری کو غور و فکر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

پریم چند نے عام انسان کو اپنی کہانی کا ہیرو بنایا۔ ان کے کردار کوئی غیر معمولی یا خیالی نہیں ہوتے بلکہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں ہم روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں یا جن کے دکھ درد ہمارے اپنے ہوتے ہیں۔ ان کے کردار نہایت حقیقت پسند، قابلِ ہمدردی اور جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔

پریم چند کی زبان سادہ، شفاف اور بے تکلف ہے۔ ان کی زبان وہی ہے جو عام انسان بولتا ہے، اس میں دیہی لہجے، مقامی الفاظ اور عوامی محاورے شامل ہوتے ہیں، جو تحریر کو زیادہ فطری، دلنشین اور اثر انگیز بناتے ہیں۔ ان کا انداز بیان نہایت رواں، فطری اور بے ساختہ ہے، جو قاری کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

پریم چند کے افسانے صرف ذہن کو نہیں، دل کو بھی چھو جاتے ہیں۔ وہ قاری کے جذبات سے ہم آہنگ ہو کر ایسی فضا پیدا کرتے ہیں جو نہ صرف قاری کو متاثر کرتی ہے بلکہ اخلاقی سطح پر ایک بیداری بھی پیدا کرتی ہے۔ ان کے افسانوں کے اختتام اکثر کسی چونکا دینے والی یا پُر معنویت بات پر ہوتے ہیں، جو دیرپا تاثر چھوڑتی ہے۔ اگرچہ پریم چند کے افسانے عمومی طور پر سنجیدہ ہوتے ہیں، لیکن بعض جگہوں پر وہ ہلکے طنز و مزاح کے ذریعے سماجی ناہمواریوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ یہ طنز تلخ نہیں بلکہ فکر انگیز ہوتا ہے، جو قاری کو بغیر براہِ راست کہے بہت کچھ سمجھا جاتا ہے۔

پریم چند نے ہندو مسلم اتحاد، چھوت چھات اور ذات پات کے نظام کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان کے افسانوں میں انسانیت کو مذہب یا ذات سے بالاتر سمجھا گیا ہے۔ ان کے نزدیک اصل انسان وہ ہے، جو دوسرے انسان کے دکھ درد کو سمجھے، چاہے وہ کسی بھی مذہب یا طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔

مختصر یہ کہ پریم چند کی افسانہ نگاری اردو ادب کی تاریخ میں ایک عہد ساز باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے افسانے اپنے زمانے کے ساتھ ساتھ آج کے دور میں بھی اتنے ہی موثر اور معنی خیز ہیں۔ پریم چند وہ افسانہ نگار تھے جنہوں نے اپنی کہانیوں کے ذریعے انسانیت،

مساوات اور سچائی کے چراغ جلائے۔ ان کی تحریریں نہ صرف فنی حسن رکھتی ہیں بلکہ ایک زندہ سماجی ضمیر کی گواہی بھی دیتی ہیں۔ ان کے افسانے اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

5.2.2 افسانہ نجات: متن

دکھی چمار دروازے پر جھاڑ رہا تھا اور اس کی بیوی جھُریا گھر کو لیپ رہی تھی۔ دونوں اپنے اپنے کام سے فراغت پا چکے تو چمارِن نے کہا۔ "تو جا کر پنڈت بابا سے کہہ آؤ۔ ایسا نہ ہو کہیں چلے جائیں"۔

دُکھی: ہاں جاتا ہوں لیکن یہ تو سوچ کہ بیٹھیں گے کس چیز پر؟"

جُھریا: کہیں سے کوئی کھٹیا نہ مل جائے گی۔ ٹھکرانی سے مانگ لانا"۔

دُکھی: تو تو کبھی کبھی ایسی بات کہہ دیتی ہے کہ بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ بھلا ٹھکرانے والے مجھے کھٹیا دیں گے؟ جا کر ایک لوٹا پانی مانگو تو نہ ملے۔ بھلا کھٹیا کون دے گا۔ ہمارے اوپلے، ایندھن، بھوسا لکڑی تھوڑے ہی ہیں کہ جو چاہے اٹھالے جائے اپنی کھٹولی دھو کر رکھ دے۔ گرمی کے تو دن ہیں۔ ان کے آتے آتے سوکھ جائے گی۔

جُھریا: ہماری کھٹولی پر وہ نہ بیٹھیں گے۔ دیکھتے نہیں کتنے دھرم سے رہتے ہیں۔

دُکھی نے کسی قدر مغموم لہجے میں کہا۔ "ہاں یہ بات تو ہے۔ مہوے کے پتے توڑ کر ایک پتل بنالوں، تو ٹھیک ہو جائے۔ پتل میں بڑے آدمی کھاتے ہیں۔ وہ پاک ہے۔ لا تو لاٹھی، پتے توڑ لوں"۔

جُھریا: پتّل میں بنالوں گی۔ تم جاؤ لیکن ہاں انہیں سیدھا بھی تو دینا ہو گا۔ اپنی تھالی میں رکھ دوں؛

دکھی: کہیں ایسا گجب نہ کرنا نہیں سیدھا بھی جائے اور تھالی بھی۔ چھوٹے بابا تھالی اٹھا کر پٹک دیں گے۔ وہ بہت جلد غصہ میں آجاتے ہیں۔ غصّہ میں پنڈتانی تک کو نہیں چھوڑتے۔ لڑکے کو ایسا پیٹا کہ آج تک ٹوٹا ہاتھ لیے پھرتا ہے۔ پتّل میں سیدھا بھی دے دینا مگر چھونا مت۔ بھوری گونڈکی لڑکی کو لے کر شاہ کی دکان سے چیزیں لے آنا۔ سیدھا بھرپور، سیر بھر آٹا، آدھ سیر چاول، پاؤ بھر دال، آدھ پاؤ گھی، نمک، ہلدی اور تیل میں ایک کنارے چار آنہ کے پیسے رکھ دینا۔

گونڈکی کی لڑکی نہ ملے تو پھر مہاجن کے ہاتھ پیر جوڑ کر لے آنا۔ تم کچھ نہ چھونا ورنہ گجب ہو جائے گا۔ ان باتوں کی تاکید کر کے دکھی نے لکڑی اٹھالی اور گھاس کا ایک بڑا سا گٹھا لے کر پنڈت جی سے عرض کرنے چلا۔ خالی ہاتھ باباجی کی خدمت میں کس طرح جاتا۔ نذرانے کے لیے اس کے پاس گھاس کے سوا اور کیا تھا۔ اسے خالی ہاتھ دیکھ کر تو باباجی دور ہی سے دھتکار دیتے۔

پنڈت گھاسی رام ایشور کے پرم بھگت تھے۔ نیند کھلتے ہی ایشور اپاسنا میں لگ جاتے، منہ ہاتھ دھوتے آٹھ بجے، تب اصلی پوجا شروع ہوتی۔ جس کا پہلا حصہ بھنگ کی تیاری تھی۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ تک چندن رگڑتے۔ پھر آئینے کے سامنے ایک تنکے سے پیشانی پر تلک لگاتے۔ چندن کے متوازی خطوط کے درمیان لال روئی کا ٹیکہ ہوتا۔ پھر سینہ پر، دونوں بازوؤں پر چندن کے گول گول دائرے بناتے اور ٹھاکر جی کی مورتی نکال کر اسے نہلاتے۔ چندن لگاتے، پھول چڑھاتے، آرتی کرتے اور گھنٹی بجاتے۔ دس بجتے بجتے وہ پوجن سے اٹھتے اور بھنگ چھان کر باہر آتے۔ اس وقت دو چار دروازے پر آجاتے۔

ایشور اپاسنا کافی الفور پھل مل جاتا۔ یہی ان کی کھیتی تھی۔ آج وہ عبادت خانے سے نکلے تو دیکھا دکھی چمار گھاس کا ایک گٹھا لیے بیٹھا ہے۔ انہیں دیکھتے ہی کھڑا ہو اور نہایت ادب سے ڈنڈوت کر کے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا پُر جلال چہرہ دیکھ کر اس کا دل عقیدت سے پر ہو گیا۔ کتنی تقدس مآب صورت تھی۔ چھوٹا سا گول مول آدمی۔ چکنا سر، بھولے ہوئے رکسار، روحانی جلال سے منور آنکھیں اس پر روئی اور چندن نے دیوتاؤں کی تقدس عطا کر دی تھی۔ دکھی کو دیکھ کر شیریں لہجہ میں بولے۔

"آج کیسے چلا آیارے دُکھیا؟" دُکھی نے سر جھکا کر کہا۔

بٹیا کی سگائی کر رہا ہوں مہاراج! ساعت شگن بچارنا ہے۔ کب مرجی ہو گی؟" گھاسی۔ "آج تو مجھے چھٹی نہیں۔ شام تک آجاؤں گا"۔

دکھی: نہیں مہاراج! جلدی مرجی ہو جائے۔ سب سامان ٹھیک کر کے آیا ہوں۔ یہ گھاس کہاں رکھ دوں؟"

گھاسی: اس گائے کے سامنے ڈال دے۔ اور ذرا جھاڑ ودے کر دروازہ تو صاف کر دے۔ یہ بیٹھک بھی کئی دن سے لیپی نہیں گئی۔ اسے بھی گوبر سے لیپ دے۔ تب تک میں بھوجن کر لوں۔ پھر ذرا آرام کر کے چلوں گا۔ ہاں یہ لکڑی بھی چیر دینا۔ کھلیان میں چار کھانچی بھوسہ پڑا ہے اسے بھی اٹھالانا اور بھوسیلے میں رکھ دینا۔ دکھی فوراً حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ دروازے پر جھاڑو لگائی۔ بیٹھک گور سے لیپا۔ اس وقت بارہ بج چکے تھے۔ پنڈت جی بھوجن کرنے چلے۔ دکھی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اسے بھی زور کی بھوک لگی۔ لیکن وہاں کھانے کو دھرا ہی کیا تھا۔ گھر یہاں سے میل بھر تھا۔ وہاں کھانے چلا جائے تو پنڈت جی بگڑ جائیں۔ بے چارے نے بھوک دبائی اور لکڑی پھاڑنے لگا۔ لکڑی کی موٹی سی گرہ تھی جس پر کتنے ہی بھگتوں نے اپنا زور آزما لیا تھا۔ وہ اسی دم خم کے ساتھ لوہے سے لوہا لینے کے لیے تیار تھی۔ دکھی گھاس چھیل کر بازار لے جاتا۔ لکڑی چیرنے کا اسے محاورہ نہ تھا۔ گھاس اس کے کھرپے کے سامنے سر جھکا دیتی تھی۔ یہاں کس کس کر کلہاری کا بھرپور ہاتھ جماتا لیکن اس گرہ پر نشان تک نہ پڑتا۔ کلہاڑی اچٹ جاتی۔ پسینہ سے تر تھا۔ ہانپتا تھا۔ تھک کر بیٹھ جاتا تھا۔ پھر اٹھتا تھا۔ ہاتھ اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ پاؤں کانپ رہے تھے۔

ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ پھر بھی اپنا کام کیے جاتا تھا۔ اگر ایک چلم تمباکو پینے کو مل جاتا تو شاید کچھ طاقت آجاتی۔ اس نے سوچا۔ یہاں چلم اور تمباکو کہاں ملے گا۔ برہمنوں کا گاؤں ہے۔ برہمن ہم سب بنچ جاتوں کی طرح تمباکو تھوڑا ہی پیتے ہیں۔ یکایک اسے یاد آیا کہ گاؤں میں ایک گونڈ بھی رہتا ہے۔ اس کے یہاں ضرور چلم تمباکو ہو گی۔ فوراً اس کے گھر دوڑا۔

خیر محنت سپھل ہوئی۔ اس نے تمباکو اور چلم دی۔ لیکن آگ وہاں نہ تھی۔

دکھی نے کہا آگ کی فکر نہ کرو بھائی، پنڈت جی کے گھر سے آگ مانگ لوں گا۔ وہاں تو ابھی رسوئی بن رہی تھی"۔

یہ کہتا ہوا وہ دونوں چیزیں لے کر چلا اور پنڈت جی کے گھر میں دالان کے دروازہ پر کھڑا ہو کر بولا۔ "مالک ذرا سی آگ مل جائے تو چلم پی لیں۔ پنڈت جی بھوجن کر رہے تھے۔ پنڈتانی نے پوچھا۔ "یہ کون آدمی آگ مانگ رہا ہے؟"

"تو دے دو۔"

پنڈتانی نے بھنویں چڑھا کر کہا۔ تمہیں تو جیسے پوڑی پیڑے کے پھیر میں دھرم کرم کی سدھ بھی نہ رہی۔

چمار ہوا، دھوبی ہوا، پاسی ہوا۔ منہ اٹھائے گھر میں چلے آئے۔ پنڈت کا گھر نہ ہوا، کوئی سرائے ہوئی۔ کہہ دو ڈیوڑھی سے چلا جائے ورنہ اسی آگ سے منہ جھلسادوں گی۔ بڑے آگ مانگنے چلے ہیں"۔

پنڈت جی نے انہیں سمجھا کر کہا اندر آ گیا تو کیا ہوا۔ تمہاری کوئی چیز تو نہیں چھوئی، زمین پاک ہے۔ ذرا سی آگ کیوں نہیں دے دیتیں۔ کام تو ہمارا کر رہا ہے۔ کوئی لکڑہارا یہی لکڑی پھاڑ تا تو کم از کم چار آنے لیتا۔ پنڈ تانی نے گرج کر کہا۔

"وہ گھر میں آیا ہی کیوں؟ پنڈت نے ہار کر کہا ۔"سسرے کی بد قسمتی"۔ پنڈ تانی: اچھا اس وقت تو آگ تو دے دیتی ہوں لیکن پھر جو اس گھر میں آئے گا تو منہ جھلس دو گی۔ دکھی کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک پڑ رہی تھی۔ بیچارہ پچھتا رہا تھا۔ ناحق چلا آیا۔ سچ تو کہتی ہیں پنڈت کے گھر چمار کیسے آئے۔ یہ لوگ پاک صاف ہوتے ہیں۔ تب ہی تو اتنا مان ہے۔ چہ چمار تھوڑے ہی ہیں۔ اسی گاؤں میں بوڑھا ہو گیا۔ مگر مجھے اتنی عقل بھی نہ آئی۔ اسی لیے جب پنڈ تانی جی آگ لے کر نکلیں تو جیسے اسے جنت مل گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر زمین پر سر جھکا تا ہوا بولا۔ پنڈ تانی ماتا! مجھ سے بڑی بھول ہوئی کہ گھر میں چلا آیا۔ چمار کی عقل ہی تو ٹھہری۔ اتنے مورکھ نہ ہوتے تو سب کی لات کیوں کھاتے؟ پنڈ تانی چمٹے سے پکڑ کر آگ لائی تھی۔ انہوں نے پانچ ہاتھ کے فاصلہ پر گھونگھٹ کی آڑ سے دکھی کی طرف آگ پھینکی۔ ایک بڑی سی چنگاری اس کے سر پر پڑ گئی۔ جلدی سے ہٹ کر جھاڑے لگا۔ اس کے دل نے کہا۔ یہ ایک پاک برہمن کے گھر کو ناپاک کرنے کا نتیجہ ہے بھگوان نے کتنی جلدی سزا دے دی۔ اسی لیے تو دنیا پنڈتوں سے ڈرتی ہے۔ اور سب کے روپے مارے جاتے ہیں۔ برہمن کے روپے بھلا کوئی مار تو لے۔ گھر بھر کا ستیاناس ہو جائے۔ ہاتھ پاؤں گل گل گرنے لگیں۔

باہر آکر اس نے چلم پی اور کلہاڑی لے کر مستعد ہو گیا۔ کھٹ کھٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ سر پر آگ پڑ گئی تو پنڈ تانی کو کچھ رحم آ گیا۔ پنڈت جی کھانا کھا کر اٹھے تو بولیں۔ "اس چمرا کو بھی کھانے کو دے دو۔ بے چارا کب سے کام کر رہا ہے۔ بھوکا ہو گا"۔ پنڈت نے اس تجویز کو فنا کر دینے کے ارادے سے پوچھا۔ "روٹیاں ہیں"۔

پنڈ تانی: دو چار بچ جائیں گی۔ پنڈت: دو چار روٹیوں سے کیا ہو گا؟ یہ چمار ہے۔ کم از کم سیر چڑھا جائے گا۔ پنڈ تانی کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ "ارے باپ رے۔ سیر بھر، تو پھر رہنے دو"۔ پنڈت جی نے اب تیر بن کر کہا۔ "کچھ بھوسی چوکر ہو تو آٹے میں ملا کر موٹی موٹی روٹیاں توے پر ڈال دو۔ سالے کا پیٹ بھر جائے گا۔ پتلی روٹیوں سے ان کمینوں کا پیٹ نہیں بھرتا۔ انہیں تو جوار کا ٹکڑا چاہیے"۔ پنڈ تانی نے کہا۔ "اب جانے بھی دو، دھوپ میں مرے"۔

دکھی نے چلم پی کر کلہاڑی سنبھالی۔ دم لینے سے ذرا ہاتھوں میں طاقت آ گئی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک پھر کلہاڑی چلاتا رہا۔ پھر بے دم ہو کر وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں وہی گونڈ آ گیا۔ بولا "بوڑھے دادا جان کیوں دم دیتے ہو۔ تمہارے پھاڑے یہ گانٹھ نہ پھٹے گی۔ ناحق ہلکان ہوتے ہو"۔

دکھی نے پیشانی کا پسینہ صاف کر کے کہا۔

"بھائی ابھی گاڑی بھر بھوسہ ڈھونا ہے"۔

گونڈ: کچھ کھانے کو بھی دیا یا کام ہی کرونا جانتے ہیں۔ جا کے مانگتے کیوں نہیں؟"

دکھی: تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ بھلا برہمن کی روٹی ہم کو پچے گی؟

گونڈ: پچنے کو تو پچ جائے گی۔ مگر ملے تو۔ خود تو مونچھوں پر تاؤ دے کر کھانا کھایا اور آرم سے سو رہے ہیں۔ تمہارے لیے لکڑی پھاڑنے کا حکم لگا دیا۔ زمیندار بھی کچھ کھانے کو دیتا ہے۔ یہ ان سے بھی بڑھ گئے۔ اس پر دھرماتما بنتے ہیں۔

دکھی نے کہا۔ "بھائی آہستہ بولو۔ کہیں سن لیں گے تو بس!" یہ کہہ کر دکھی پھر سنبھل پڑا اور کلہاڑی چلانے لگا۔ گونڈ کو اس پر رحم آ گیا۔ کلہاڑی ہاتھ سے چھین کر تقریباً نصف گھنٹہ تک جی توڑ کر چلاتا رہا لیکن گانٹھ پر ذرا بھی نشان نہ ہو۔

بالآخر اس نے کلہاڑی پھینک دی اور یہ کہہ کر چلا گیا۔

"یہ تمہارے پھاڑے نہ پھٹے گی۔ خواہ تمہاری جان ہی کیوں نہ نکل جائے"۔

دکھی سوچنے لگا۔ یہ گانٹھ انہوں کہاں سے رکھ چھوڑی تھی کہ پھاڑے نہیں پھٹتی۔ میں کب تک اپنا خون پسینہ ایک کروں گا۔ ابھی گھر پر سو کام پڑے ہیں۔ کام کاج والا گھر ہے۔ ایک نہ ایک چیز گھٹتی رہتی ہے۔ مگر انہیں اس کی کیا فکر؟ چلوں جب تک بھوسہ ہی اٹھالاؤں۔ کہہ دوں گا آج تو لکڑی نہیں پھٹی۔ کل آ کر پھاڑ دوں گا۔

اس نے ٹوکرا اٹھایا اور بھوسہ ڈھونے لگا۔ کھلیان یہاں سے دو فرلانگ سے کم نہ تھا۔ اگر ٹوکرا خوب بھر بھر کر لاتا تو کام جلد ہو جاتا مگر سر پر اٹھاتا کون؟ خود اس سے نہ اٹھ سکتا۔

اس لیے تھوڑا تھوڑا لاتا تھا۔ چار بجے بھوسہ ختم ہوا۔ پنڈت کی نیند بھی کھلی، منہ ہاتھ دھو کے پان کھایا اور باہر نکلے۔ دیکھا تو دکھی ٹوکرے پر سر رکھے سو رہا ہے۔ زور سے بولے۔ "ارے دکھیا! تو سو رہا ہے۔ لکڑی تو ابھی جوں کی توں پڑی ہے۔ اتنی دیر تو کیا کر رہا تھا؟ مٹھی بھر بھوسہ اٹھانے میں شام کر دی۔ اس پر سو رہا ہے۔ کلہاڑی اٹھالے اور لکڑی پھاڑ ڈال۔ تجھ سے ذرا بھر لکڑی نہیں پھٹتی۔ پھر ساعت بھی ویسی ہی نکلے گی۔ مجھے دوش مت دینا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں جہاں بیچ کے گھر کھانے کو ہوا اس کی آنکھ بدل جاتی ہے"۔

دکھی نے پھر کلہاڑی اٹھائی۔ جو باتیں اس نے پہلے سوچ رکھی تھیں، وہ سب بھول گیا۔ پیٹ پیٹھ میں دھنسا جاتا تھا۔ دل ڈوبا جاتا تھا۔ پر دل کو سمجھا کر اٹھا۔ پنڈت ہیں۔ کہیں ساعت ٹھیک نہ بچاریں تو پھر سفینہ ناس ہو جائے۔ تب ہی تو ان کا دنیا میں اتنا مان ہے۔ ساعت ہی کا تو سب کھیل ہے۔ جسے چاہیں بنا دیں، جسے چاہیں بگاڑ دیں گے۔ پنڈت جی گانٹھ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ ہاں مار کس کے۔ اور کس کے مار۔ ایسے زور سے مار، تیرے ہاتھوں میں جیسے دم ہی نہیں۔ لگا کس کے۔ کھڑا کھڑا سوچنے کیا لگتا ہے۔

ہاں بس پھٹا ہی چاہتی ہے، اس سوراخ میں"۔ دکھی اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ نہ معلوم کوئی غیبی طاقت اس کے ہاتھوں کو چلا رہی تھی۔ تھکان، بھوک، پیاس، کمزوری سب کے سب جیسے ہوا ہو گئی تھیں۔ اسے اپنے قوت بازو پر خود تعجب ہو رہا تھا۔ ایک ایک چوٹ پہاڑ کی مانند پڑتی تھی۔ آدھ گھنٹے تک وہ اسی طرح بے خبری کی حالت میں ہاتھ چلاتا رہا۔ حتیٰ کہ لکڑی بیچ سے پھٹ گئی اور دکھی کے ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹ کر گر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی چکر کھا کر گر پڑا۔ بھوکا پیاسا تکان خوردہ جسم جواب دے گیا۔ پنڈت جی نے پکارا۔ اٹھ کر دو چار ہاتھ اور لگا دے۔ پتلی پتلی ہو جائیں"۔

پنڈت جی نے اب اسے دق کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اندر جا کر بوٹی چھانی۔ حاجات ضروری سے فارغ ہوئے، نہایا اور پنڈتوں کا لباس

پہن کر باہر نکلے۔ دکھی ابھی تک وہیں پڑا تھا۔ زور سے پکارا۔ "ارے دکھی! کیا پڑے ہی رہو گے۔ چلو تمہارے ہی گھر چل رہا ہوں سب سامان ٹھیک ہے نا؟" دکھی پھر بھی نہ اٹھا۔

اب پنڈت جی کو کچھ فکر ہوئی۔ پاس جا کر دیکھا تو دکھی اکڑا ہوا پڑا تھا۔ بدحواس ہو کر بھاگے اور پنڈتانی سے بولے۔ "دکھیا تو جیسے مر گیا"۔ پنڈتانی جی تعجب انگیز لہجے میں بولیں۔ "ابھی تو لکڑی چیر رہا تھا!؟"

ہاں لکڑی چیرتے چیرتے مر گیا۔ اب کیا ہو گا؟"

پنڈتانی نے مطمئن ہو کر کہا۔ "چمروٹے میں کہلا بھیجو مردہ اٹھالے جائیں"۔ دم کے دم میں یہ خبر گاؤں بھر میں پھیل گئی۔ گاؤں میں زیادہ تر برہمن ہی تھے۔ صرف ایک گھر گونڈ کا تھا۔ لوگوں نے ادھر کا راستہ چھوڑ دیا۔ کنویں کا راستہ ادھر ہی سے تھا۔ پانی کیونکر بھرا جائے؟ چمار کی لاش پاس ہو کر پانی بھرنے کون جائے۔ ایک بڑھیا نے پنڈت جی سے کہا۔ "مردہ کیوں نہیں اٹھواتے۔ کوئی گاؤں میں پانی پیے گا یا نہیں؟" ادھر گونڈ نے چمرونے میں جا کر سب سے کہہ دیا۔ "خبردار مردہ اٹھانے مت جانا۔ ابھی پولیس کی تحقیقات ہو گی۔ دل لگی ہے کہ ایک غریب کی جان لے لی۔ پنڈت ہوں گے تو اپنے گھر ہوں گے۔ لاش اٹھاؤ گے تو تم بھی پکڑے جاؤ گے۔

اس کے بعد ہی پنڈت جی پہنچے۔ پر چمرونے میں کوئی آدمی لاش اٹھانے کو تیار نہ ہوا۔ ہاں دکھی کی بیوی اور لڑکی دونوں ہائے ہائے کرتی وہاں سے چلیں اور پنڈت جی کے دروازے پر آ کر سر پیٹ کر رونے لگیں۔ ان کے ساتھ دس پانچ اور چمارنیں تھیں۔ کوئی روتی تھی، کوئی سمجھاتی تھی، پر چمار ایک بھی نہ تھا۔ پنڈت جی نے ان سب کو بہت دھمکایا، سمجھایا، منت کی۔ پر چماروں کے دل پر پولیس کا ایسا رعب چھایا کہ ایک بھی مان نہ سکا۔ آخر ناامید ہو کر لوٹ آئے۔

آدھی رات تک رونا پیٹنا جاری رہا۔ دیوتاؤں کا سونا مشکل ہو گیا۔ مگر لاش اٹھانے کوئی نہ آیا۔ اور برہمن چمار کی لاش کیسے اٹھاتے؟ بھلا ایسا کسی شاستر پوران میں لکھا ہو، کہیں کوئی دکھا دے۔

پنڈتانی نے جھنجھلا کر کہا۔ "ان ڈائنوں نے تو کھوپڑی چاٹ ڈالی۔ ان سبھوں کا گلا بھی نہیں تھکتا"۔ پنڈت نے کہا۔ "چڑیلوں کو رونے دو۔ کب تک روئیں گی۔ جیتا تھا تو کوئی بات نہ پوچھتا تھا۔ مر گیا تو شور و غل مچانے کے لیے سب آ پہنچیں"۔

پنڈتانی: چماروں کا رونا منحوس ہوتا ہے؟

پنڈت: ہاں بہت منحوس۔

پنڈتانی: ابھی سے بو آنے لگی۔

پنڈت: چمار تھا سسرا کہیں کا۔ ان سبھوں کو کھانے پینے میں کوئی بچار نہیں ہوتا۔

پنڈتانی: ان لوگوں کو نفرت بھی معلوم نہیں ہوتی۔

پنڈت: سب کے سب بھرشٹ ہیں۔

رات تو کسی طرح کٹی مگر صبح بھی کوئی چمار نہ آیا۔ چمارنی بھی رو پیٹ کر چلی گئی۔ بدبو پھیلنے لگی۔ پنڈت جی نے ایک رسی نکالی۔ اس کا پھندہ بنا کر مردے کے پیر میں ڈالا اور پھندے کو کھینچ کر کس دیا۔ ابھی کچھ کچھ اندھیرا تھا۔ پنڈت جی نے رسی پکڑ کر لاش کو گھسیٹنا شروع کیا

اور گھسیٹ کر گاؤں سے باہر لے گئے۔

وہاں سے آکر نہائے، در گا پاٹھ پڑھا اور سر میں گنگا جل چھڑکا۔ ادھر دکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ، گدھ اور کوے نوچ رہے تھے۔ یہی اس کی تمام زندگی کی بھگتی، خدمت اور اعتقاد کا انعام تھا۔

5.2.3 خلاصہ:

پریم چند کا افسانہ "نجات" ہمیں ہندوستانی دیہی سماج کی ایک سخت سچائی کا پتہ دیتا ہے۔ یعنی وہ نظام، جس میں انسان کی عزت یا بے عزتی اس کی ذات (کاسٹ) پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ کہانی دُکھی چمار نامی ایک غریب اور نچلی ذات کے آدمی کی ہے، جو نہایت محنتی، ایماندار اور نیک دل ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ پنڈت گھاسی رام، جو گاؤں کے برہمن ہیں، اس کی بیٹی کی شادی کے لیے ایک اچھا دن (شُبھ ساعت) نکال دیں، جس سے اس کی بیٹی کی شادی ہو سکے اور گھاسی رام اپنی اس ذمے داری سے نجات پا سکے۔

اس مقصد کے لیے دُکھی صبح سے شام تک پنڈت کے گھر کام کرتا ہے۔ جھاڑو دیتا ہے، زمین لیپتا ہے، لکڑیاں چیرتا ہے اور بھوسہ ڈھوتا ہے، وہ بھی بغیر کچھ کھائے یا آرام کیے۔ وہ پنڈت کو دیوتا کی طرح مانتا ہے اور ان کی ہر بات کو حکم سمجھ کر کام کرتا ہے۔ لیکن پنڈت اور ان کی بیوی اس کے ساتھ نہایت برا سلوک کرتے ہیں۔ اسے کھانے کو نہیں دیتے، آگ بھی نہیں دیتے، جس کہ وہ چلم پی سکے۔ یہ سب اس لیے کہ وہ نیچی ذات کا ہے۔ وہ لوگ اسے گندہ سمجھتے ہیں۔

جب دُکھی لکڑی چیرتے چیرتے بھوک، پیاس اور تھکن سے وہیں مر جاتا ہے، تب نہ تو دلت سماج کے لوگ پولیس کے ڈر سے اس کی لاش اٹھاتے ہیں اور نہ تو برہمن اس کی ناپاکی کی وجہ سے اس کی لاش کو چھوتا ہے۔ آخر میں پنڈت جی مجبور ہو کر اس کی لاش کو رسی سے باندھ کر گھسیٹتے ہوئے گاؤں سے باہر لے جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اطمینان سے غسل کر کے پوجا پاٹھ کرتے ہیں، جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

افسانہ "نجات" ایک فرد کی نہیں، ایک طبقے کی کہانی ہے۔ دُکھی کی شخصیت دلتوں کی اس پوری نسل کی نمائندگی کرتی ہے، جنہیں صرف اس لیے انسان نہیں مانا جاتا کہ ان کی پیدائش کسی چھوٹی ذات میں ہوئی ہے۔ وہ اپنی زندگی کی نجات مذہب، دھرم اور برہمن کی کرپا میں ڈھونڈتا ہے، مگر آخر کار وہی مذہب اور برہمن اسے "نجات" کے بجائے موت اور ذلت عطا کرتے ہیں۔

افسانے کا عنوان "نجات" علامتی اور طنزیہ ہے۔ دُکھی چمار کو اس دنیا میں کہیں نجات نہیں ملتی۔ نہ اپنے کام سے، نہ عقیدت سے، نہ خدمت سے۔ اگر کوئی نجات ہے تو صرف موت اور وہ بھی ایسی موت، جس کے بعد اس کی لاش کو بھی عزت نصیب نہیں ہوتی۔

افسانہ "نجات" پریم چند کی حقیقت نگاری اور سماجی بیداری کا ایک درخشاں نمونہ ہے۔ یہ افسانہ نہ صرف ظلم کی ایک تصویر پیش کرتا ہے بلکہ قاری کہ ذہن میں سوال بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ افسانہ قاری کو اس بات پر غور و فکر کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے کہ ہم مذہب، ذات پات اور سماجی تفریق کے نام پر ہونے والے اس ظلم پر غور کریں، جو صدیوں سے انسانوں کو دباتا، کچلتا اور مارتا آرہا ہے، جس کا شکار صرف دُکھی چمار نہیں بلکہ پورا دلت سماج ہے۔

5.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- پریم چند اردو اور ہندی کے ایک عظیم افسانہ نگار، ناول نویس اور اصلاحی ادیب تھے۔ ان کا اصل نام دھنپت رائے تھا، لیکن ادبی دنیا میں وہ "پریم چند" کے نام سے مشہور ہوئے۔
- پریم چند ایک متوسط طبقے کے کایستھ گھرانے میں 1880 میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی عجائب لال محکمہ ڈاک میں کلرک تھے۔ والدہ مذہبی، حساس اور نرم دل خاتون تھیں۔
- پریم چند نے فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم مدرسے سے حاصل کی۔ بعد میں انہوں نے انگریزی میں بھی تعلیم حاصل کی۔ انگریزی ادب، خاص طور پر شیکسپیئر، ٹالسٹائی اور گوگول سے بھی متاثر ہوئے۔
- پریم چند اردو افسانہ نگاری کے بنیاد گزار اور روح رواں مانے جاتے ہیں، جنہوں نے اردو فکشن کو نئی سمت، نئی فکری جہت اور نئی تہذیبی بصیرت عطا کی۔
- پریم چند نے ابتدا میں اردو زبان میں لکھنا شروع کیا اور "نواب رائے" کے قلمی نام سے کہانیاں لکھیں۔ 1908 میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "سوزِ وطن" شائع ہوا، جو وطن کی آزادی اور حب الوطنی کے موضوع پر ہے، لیکن برطانوی حکومت نے اس پر پابندی لگادی۔
- پریم چند کا افسانہ "نجات" ہمیں ہندوستانی دیہی سماج کی ایک سخت سچائی کا پتہ دیتا ہے۔ یعنی وہ نظام، جس میں انسان کی عزت یا بے عزتی اس کی ذات (کاسٹ) پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ کہانی دُکھی چمار نامی ایک غریب اور نچلی ذات کے آدمی کی ہے، جو نہایت محنتی، ایماندار اور نیک دل ہے۔
- افسانہ "نجات" ایک فرد کی نہیں، ایک طبقے کی کہانی ہے۔ دُکھی کی شخصیت دلتوں کی اس پوری نسل کی نمائندگی کرتی ہے، جنہیں صرف اس لیے انسان نہیں مانا جاتا کہ ان کی پیدائش کسی چھوٹی ذات میں ہوئی ہے۔
- افسانہ "نجات" قاری کو اس بات پر غور و فکر کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے کہ ہم مذہب، ذات پات اور سماجی تفریق کے نام پر ہونے والے اس ظلم پر غور کریں، جو صدیوں سے انسانوں کو دباتا، کچلتا اور مارتا آرہا ہے، جس کا شکار صرف دُکھی چمار نہیں بلکہ پورا دلت سماج ہے۔

5.4 مشکل الفاظ

تخلیقی شعور	نئی چیزیں سوچنے اور پیدا کرنے کی صلاحیت	Creative consciousness
فکری بصیرت	گہری بات سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت	Intellectual insight
مشعل راہ	راستہ دکھانے والی روشنی، رہنما	Guiding light

اخلاقی اقدار	اچھے برے کی پہچان، اچھے اصول	Moral values
استبداد	زبردستی کی حکومت، ظلم و جبر	Tyranny, Despotism
کھٹولی	چھوٹا پلنگ، آرام کرنے کی چارپائی	Cot, Small bed
پتّل	پتوں کی بنی ہوئی پلیٹ یا دو پہری تھالی	Idol, Effigy
اُپاسنا	پوجا، عبادت، خدا کی پرستش	Worship, Devotion
فی الفور	فوراً، اسی وقت	Immediately, Instantly
سیدھا	آٹا، دال، چاول، نقدی وغیرہ جو دلہن شوہر کے گھر جاتی ہوئی لے جاتی ہے	Straight, Direct
ڈنڈوت	سجدہ کرنا، ادب سے جھکنا	Salutation, Obeisance
تقدس	پاکیزگی، بزرگی، احترام والی حالت	Sanctity, Holiness
تعجب انگیز	حیرت میں ڈالنے والی چیز	Amazing, Astonishing
غیبی طاقت	نظر نہ آنے والی طاقت، خدا یا ماورائی قوت	Supernatural power
تکان خوردہ	بہت تھکا ہوا، جسمانی یا ذہنی طور پر تھکن سے چور	Weary, Exhausted

5.5 مشقیں

مشق 1: دیے گئے الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

1۔ پتّل .....

2۔ کھٹولی .....

3۔ اُپاسنا .....

4۔ گانٹھ .....

5۔ بھوسی .....

مشق 2: دیے گئے جملوں میں صحیح اور غلط کی نشاندہی کیجیے۔

1۔ پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ ( )

2۔ پریم چند کی پیدائش 1936 میں ہوئی۔ ( )

3۔ افسانہ "نجات" راجندر سنگھ بیدی نے لکھا ہے۔ ( )

4۔ دکھی چمار افسانہ نجات کا مرکزی کردار ہے۔ ( )

5۔ پریم چند ابتدا میں نواب رائے کے نام سے افسانے لکھتے تھے۔ ( )

مشق 3: دیے گئے الفاظ کے معنی لکھیے۔

1۔ مشعل راہ .....

2۔ تقدس .....

3۔ فکری بصیرت .....

4۔ فی الفور .....

5۔ غیبی طاقت .....

5.6 نمونہ امتحانی سوالات

5.6.1 معروضی سوالات:

1۔ پریم چند کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی؟

1830 (a) 1840(b) 1860(c) 1880(d)

2۔ پریم چند کے والد کا نام کیا تھا؟

(a) عجائب لال (b) دھنپت رائے (c) نواب رائے (d) ان میں سے کوئی نہیں

3۔ پریم چند کا اصل نام کیا تھا؟

(a) پریم چند (b) دھنپت رائے (c) نواب رائے (d) بھگت رائے

4۔ پریم چند ابتدا میں کس نام سے افسانے لکھتے تھے؟

(a) گلاب رائے (b) منشی لال رائے (c) نواب رائے (d) پریم چند

5۔ پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ کون سا ہے؟

(a) سوز وطن (b) پریم پچیسی (c) پریم بتیسی (d) کفن

6۔ پریم چند کا پہلا افسانوی مجموعہ کس سنہ میں شائع ہوا؟

1908(a) 1906(b) 1904(c) 1901(d)

7۔ افسانہ "نجات" کس نے لکھا ہے؟

(a) راشد الخیری (b) غلام عباس (c) پریم چند (d) کرشن چندر

8۔ افسانہ "نجات" کا مرکزی کردار کون ہے؟

(a) دکھی چمار (b) پنڈت گھاسی رام (c) گونڈ (d) ان میں سے کوئی نہیں

9۔ "کھٹولی" کے معنی کیا ہیں؟

(a) جھولا (b) اڑن کھٹولا (c) چھوٹی چارپائی (d) بڑی چارپائی

10۔ پریم چند کا انتقال کس سنہ میں ہوا؟

(a) 1938 (b) 1936 (c) 1932 (d) 1880

5.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ پریم چند کے ابتدائی حالات بیان کیجیے۔

2۔ دکھی چمار کے کردار پر تبصرہ کیجیے۔

3۔ پریم چند کے زبان و بیان پر سیر حاصل گفتگو کیجیے۔

4۔ پنڈت گھاسی رام کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

5۔ افسانہ "نجات" کی خوبی بیان کیجیے۔

5.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ پریم چند کا تعارف پیش کیجیے۔

2۔ پریم چند کی افسانہ نگاری پر روشنی ڈالیے۔

3۔ افسانہ "نجات" کا خلاصہ لکھیے۔

5.6.1 کے جوابات:

A (v)	C (iv)	B (iii)	A (ii)	D (i)
B (x)	C (ix)	A (viii)	C (vii)	A (vi)

اکائی6: افسانہ

(بھولا: راجندر سنگھ بیدی)

اکائی کے اجزا

6.0		تمہید
6.1		مقاصد
6.2		افسانہ: بھولا
	6.2.1	راجندر سنگھ بیدی کا تعارف
	6.2.2	6.2.2 راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری
	6.2.3	افسانہ بھولا: متن
	6.2.4	خلاصہ
6.3		اکتسابی نتائج
6.4		مشکل الفاظ
6.5		مشقیں
6.6		نمونہ امتحانی سوالات

6.0 تمہید

پچھلی اکائی میں آپ نے پریم چند کی افسانہ نگاری اور ان کے ایک مشہور افسانے "نجات" کا مطالعہ کیا۔ پریم چند کی افسانوی روایت کو آگے بڑھانے میں ایک اہم نام راجندر سنگھ بیدی کا بھی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری کی سب سے نمایاں خصوصیت نفسیاتی حقیقت نگاری ہے۔ وہ انسان کے باطن، جذبات اور داخلی کشمکش کو بڑی سادگی اور گہرائی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ مگر علامتی ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار جیتے جاگتے، تضاد سے بھرپور اور عام زندگی سے جڑے ہوتے ہیں۔ بیدی نے خاص طور پر عورتوں، غریبوں اور مظلوم طبقات کے جذبات اور مسائل کو مؤثر انداز میں اجاگر کیا۔ ان کے افسانوں میں سماجی شعور، انسانی ہمدردی اور جذباتی لطافت کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس اکائی میں ہم راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری کے ساتھ ان کے ایک اہم افسانے "بھولا" کے

متن کی قرات کریں گے اور ساتھ ہی اس افسانے کے خلاصے کا بھی مطالعہ کریں گے۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- راجندر سنگھ بیدی کا تعارف پیش کر سکیں۔
- راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کر سکیں۔
- راجندر سنگھ بیدی کے افسانے "بھولا" کی قرات کر سکیں۔
- افسانہ "بھولا" کا خلاصہ بیان کر سکیں۔

6.2 افسانہ: بھولا

6.2.1 راجندر سنگھ بیدی کا تعارف:

راجندر سنگھ بیدی یکم ستمبر 1915ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ بیدی کے والد کا نام ہیرا سنگھ بیدی اور والدہ کا نام سیوا دیوی تھا۔ والد کھتری سکھ اور والدہ برہمن تھے۔ بیدی نے ابتدائی تعلیم لاہور چھاؤنی کے صدر بازار کے ایک اسکول میں حاصل کی۔ اس اسکول سے پانچویں جماعت پاس کر کے انہوں نے ایس۔بی۔ ایس خالصہ اسکول' لاہور میں داخلہ لے لیا۔ یہیں سے 1931ء میں میٹر کولیشن کیا۔ پھر 1933ء میں ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج۔ لاہور سے انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ دوران تعلیم بیدی نے لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کی پہلی تخلیق ایک انگریزی نظم کی صورت میں کالج کی میگزین میں شائع ہوئی۔ 1934ء میں بیدی ڈاک خانے میں ملازم ہو گئے۔ ادبی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ ابتدا میں بیدی نے محسن لاہوری کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ ان کی پہلی کہانی پنجابی زبان میں تھی جس کا عنوان "دکھ سکھ" تھا اور یہ لاہور سے نکلنے والے رسالے "سارنگ" میں شائع ہوئی تھی۔ سارنگ اردو حروف اور پنجابی زبان میں شائع ہوتا تھا۔ جیجا بائی کی بسنت اور گڑھی کا سردار ان کی ابتدائی کہانیاں ہیں جو شائع نہیں ہو سکیں اور اب ان کا سراغ نہیں ملتا۔ 1934ء میں ان کی شادی ہو گئی۔ بیدی کی اہلیہ کا نام ستونت کور تھا۔ بیدی کے یہاں چار اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔ ایک طرف ازدواجی زندگی اور ملازمت کی مصروفیتیں تھیں اور دوسری طرف بیدی کا جنون تخلیق۔ دفتر میں کبھی سترہ تو کبھی اٹھارہ گھنٹے تک کام کرنا پڑتا۔ تھکے ہارے گھر واپس آتے تو گھر کے مسائل' پھر بھی رات کے دو بجے تک پڑھنا یا لکھنا جاری رہتا۔ دفتر کے اوقات میں بھی اگر ذرا سی فرصت ملتی تو قلم اٹھا لیتے۔ "ہمدوش"، "گرم کوٹ" اور "پان شاپ" جیسی کہانیاں ایسے ہی لکھی گئیں۔ بیدی کا پہلا اردو افسانہ جس کا عنوان "مہارانی کا تحفہ" تھا، جو رسالہ "ادبی دنیا" لاہور کے سالنامہ 1937ء میں شائع ہوا اور اسے "ادبی دنیا" میں گزشتہ برس شائع ہونے والے سبھی افسانوں میں بہترین افسانہ قرار دیا گیا۔ رسالے کے مدیر کی جانب سے اس افسانے پر دس روپے کا انعام بھی دیا گیا جس کو حاصل کرنے کے لیے انہیں "ادبی دنیا" کے دفتر کے کئی چکر لگانے پڑے۔ بیدی نے اس افسانے کو اپنے کسی بھی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں کیا۔ بقول خود ان کے اس افسانے پر ٹیگور کا اثر تھا اور وہ اس کی زبان سے بھی زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ بیدی اس دوران پریم چند' ترگنیف' چیخوف اور ٹالسٹائی وغیرہ کو پڑھتے

رہے تھے اور ان عظیم افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا مطالعہ انہیں فن افسانہ نگاری کے رموز سے خاطر خواہ واقف کرا چکا تھا۔ ان کے افسانے "ادبی دنیا" لاہور اور "ادب لطیف" لاہور۔ جیسے اہم ادبی جریدوں میں شائع ہو رہے تھے۔

ڈاک خانے کی ملازمت بیدی کے تخلیقی مزاج سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ معاشی ضرورتوں کی وجہ سے وہ یہ ملازمت کر رہے تھے۔ جب اس سے نباہ بالکل ہی ناممکن ہو گیا تو انہوں نے 1943ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ چھ ماہ تک دہلی میں مرکزی حکومت کے پبلسٹی ڈپارٹمنٹ میں کام کیا۔ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو' لاہور میں بحیثیت آرٹسٹ ملازم ہو گئے۔ 1946ء میں انہوں نے سنگم پبلشر لمیٹڈ کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ 1946ء میں وہ آل انڈیا ریڈیو جموں کے ڈائرکٹر ہو گئے۔ کشمیر میں بیدی کا قیام 1949ء تک رہا۔ اس کے بعد وہ دہلی لوٹ آئے۔ 1949ء میں بیدی بمبئی آ گئے۔ اب انہوں نے فلمی دنیا میں قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد پھر وہ بمبئی کے ہی ہو کر رہ گئے۔

اردو فکشن کی دنیا میں ان کے ممتاز مقام و مرتبے اور فلموں کے تعلق سے ان کے گراں قدر تعاون کے اعتراف کے طور پر انہیں مختلف اعزازات سے نوازا گیا۔ 1965ء میں انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ' 1972ء میں پدم شری' 1978ء میں غالب ایوارڈ اور فلم فیئر ایوارڈ بھی دیے گئے۔

فروری 1977ء میں ان کی اہلیہ ستونت کور کا انتقال ہو گیا۔ 5 نومبر 1978ء کو بیدی کے جسم کے داہنے حصے پر فالج ہوا اور وہ عرصے تک صاحب فراش رہے۔ مختلف بیماریوں نے انہیں آگھیرا تھا۔ انہیں دنوں ان کو ایک اور صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ 21 اکتوبر 1982 کو ان کے بڑے بیٹے فلم ساز اور ہدایت کار نریندر بیدی کا انتقال ہو گیا۔ اس صدمے نے بیدی کو توڑ کر رکھ دیا۔ آخر کار طویل بیماری کے بعد 11 نومبر 1984ء کو بمبئی میں بیدی کا انتقال ہو گیا۔

6.2.2 راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری:

راجندر سنگھ بیدی اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری نے بیسویں صدی کے وسط میں اردو فکشن کو ایک نئی نفسیاتی گہرائی، فکری وسعت اور فنی لطافت عطا کی۔ انہوں نے انسان کے باطن، اس کی پیچیدہ نفسیات، معاشرتی الجھنوں اور جذباتی کشمکش کو نہایت باریک بینی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔

بیدی کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان کی داخلی دنیا، اس کے جذبوں، لاشعوری میلانات اور نفسیاتی کشمکش کو بڑی سچائی اور باریکی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے کرداروں کے باطن میں جھانکنا ممکن ہوتا ہے۔ ان کے افسانے لاجونتی میں ایک شخص کی نفسیاتی الجھن اور احساسِ جرم کو بڑی شدت سے پیش کیا گیا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی انسانی جذبات، خصوصاً محبت، دکھ، تنہائی، احساسِ محرومی، اور بیوگی جیسے موضوعات کو بہت نرم، گہرے اور اثر انگیز انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے افسانے قاری کے دل کو چھو جاتے ہیں۔ یہ کیفیت ان کے افسانے گرم کوٹ میں دکھائی دیتی ہے۔ اس افسانے میں ایک غریب ملازم کی خواہش، وقار اور سردی کے احساس کو جس نرمی سے پیش کیا گیا ہے، وہ بے مثال ہے۔

بیدی کی زبان نہایت سادہ، صاف اور بے ساختہ ہوتی ہے، مگر اس میں علامتی قوت بھی پائی جاتی ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات اور سادہ جملوں میں گہرے مفاہیم چھپا دیتے ہیں۔ بیدی کے کردار مکمل طور پر سماجی شعور سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں کوئی کردار مکمل نیکی یا بدی کا نمائندہ نہیں ہوتا بلکہ ہر کردار ایک داخلی کشمکش کا شکار ہوتا ہے، جیسا کہ اصل زندگی میں ہوتا ہے۔

اگرچہ بیدی نے اپنے افسانوں میں نفسیاتی پہلوؤں پر زور دیا، لیکن ان کے یہاں سماجی شعور بھی نمایاں ہے۔ وہ خاص طور پر عورتوں، غریبوں، نچلے طبقے، مزدوروں اور بیواؤں کی زندگی کو موضوع بناتے ہیں اور ان کے استحصال کو بے نقاب کرتے ہیں۔

بیدی کے افسانوں کی عورتیں روایت سے ہٹ کر پیش کی جاتی ہیں۔ وہ جذبات رکھتی ہیں، فیصلے کرتی ہیں اور کبھی کبھی زندگی کے خلاف بغاوت بھی کرتی ہیں۔ ان کرداروں میں گہرائی، نفسیاتی پیچیدگی اور انسانی رنگ ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں اکثر داخلی خود کلامی یعنی "اندر کی آواز" کا عنصر ہوتا ہے، جو کردار کی نفسیاتی کیفیت کو واضح کرتا ہے۔ بیدی مکالمے لکھنے میں بھی بہت ماہر ہیں، جو کردار کی شخصیت کو اجاگر کرتے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی نے اردو افسانہ نگاری میں انسانی نفسیات، جذبات اور باطن کی سچائی کو ایک نیا افق عطا کیا۔ ان کی تحریروں میں سادگی کے پردے میں چھپی گہرائی، لطافت اور فنکارانہ چابک دستی انہیں ممتاز بناتی ہے۔ ان کے افسانے محض کہانیاں نہیں بلکہ انسان کی داخلی زندگی کا آئینہ ہیں۔ بیدی نے اردو افسانے کو "دل کی بات" بنا دیا اور یہی ان کی افسانہ نگاری کا سب سے بڑا کمال ہے۔

6.2.3 افسانہ بھولا: متن

میں نے مایا کو پتھر کے ایک کوزے میں مکھّن رکھتے دیکھا۔ چھاچھ کی کھٹاس کو دور کرنے کے لیے مایا نے کوزے میں پڑے ہوئے مکھن کو کنویں کے صاف پانی سے کئی بار دھویا۔ اس طرح مکھن کے جمع کرنے کی کوئی خاص وجہ تھی۔ ایسی بات عموماً مایا کے کسی عزیز کی آمد کا پتا دیتی تھی۔ ہاں! اب مجھے یاد آیا۔ دو دن کے بعد مایا کا بھائی اپنی بیوہ بہن سے راکھی بندھوانے کے لیے آنے والا تھا۔ یوں تو اکثر بہنیں بھائیوں کے ہاں جا کر انھیں راکھی باندھتی ہیں مگر مایا کا بھائی اپنی بہن اور بھانجے سے ملنے کے لیے خود ہی آ جایا کرتا تھا اور راکھی بندھوا لیا کرتا تھا۔ راکھی بندھوا کر وہ اپنی بیوہ بہن کو یہی یقین دلاتا تھا کہ اگرچہ اس کا سہاگ لٹ گیا ہے مگر جب تک اس کا بھائی زندہ ہے، اس کی رکھشا، اس کی حفاظت کی ذمے داری اپنے کندھوں پر لیتا ہے۔ ننھے بھولے نے میرے اس خیال کی تصدیق کر دی۔ گنّا چوستے ہوئے اس نے کہا، "بابا! پرسوں ماموں جی آئیں گے نا۔۔۔؟"

میں نے اپنے پوتے کو پیار سے گود میں اٹھا لیا۔ بھولے کا جسم بہت نرم و نازک تھا اور اس کی آواز بہت سُریلی تھی۔ جیسے کنول کی پتیوں کی نزاکت اور سفیدی، گلاب کی سرخی اور بلبل کی خوش الحانی کو اکٹھا کر دیا ہو۔ اگرچہ بھولا میری لمبی اور گھنی داڑھی سے گھبرا کر مجھے اپنا منھ چومنے کی اجازت نہ دیتا تھا تاہم میں نے زبردستی اس کے سرخ گالوں پر پیار کی مہر ثبت کر دی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا، "بھولے تیرے ماموں جی تیری ماتا جی کے کیا ہوتے ہیں؟" بھولے نے کچھ وقت کے بعد جواب دیا، "ماموں جی!"

مایا نے استوتر پڑھنا چھوڑ دیا اور ہنسنے لگی۔ میں اپنی بہو کے اس طرح کھل کر ہنسنے پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ مایا بیوہ تھی اور سماج اسے اچھے کپڑے پہننے اور خوشی کی بات میں حصہ لینے سے بھی روکتا تھا۔ میں نے بارہا مایا کو اچھے کپڑے پہننے ہنسنے کھیلنے کی تلقین کرتے

ہوئے سماج کی پروانہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ مگر مایا نے خود اپنے آپ کو سماج کے روح فرسا احکام کے تابع کر لیا تھا۔ اس نے اپنے تمام اچھے کپڑے اور زیورات کی پٹاری ایک صندوق میں مقفّل کر کے چابی ایک جوہڑ میں پھینک دی تھی۔ مایا نے ہنستے ہوئے اپنا پاٹھ جاری رکھا۔

ہری ہری ہری ہر، ہری ہر، ہری

میری بار دیر کیوں اتنی کری

پھر اس نے اپنے لال کو پیار سے بلاتے ہوئے کہ "بھولے۔۔۔! تم ننھی کے کیا ہوتے ہو؟"

"بھائی!" بھولے نے جواب دیا۔

"اسی طرح تیرے ماموں جی میرے بھائی ہیں۔"

بھولا یہ بات نہ سمجھ سکا کہ ایک ہی شخص کس طرح ایک ہی وقت میں کسی کا بھائی اور کسی کا ماموں ہو سکتا ہے۔ وہ تو اب تک یہی سمجھتا آیا تھا کہ اس کے ماموں جان اس کے باباجی کے بھی ماموں جی ہیں۔ بھولے نے اس مخمصے میں پڑنے کی کوشش نہ کی اور اچک کر ماں کی گود میں جا بیٹھا اور اپنی ماں سے گیتا سننے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ وہ گیتا محض اس وجہ سے سنتا تھا کہ وہ کہانیوں کا شوقین تھا اور گیتا کے ادھیائے کے آخر میں مہاتم سن کر وہ بہت خوش ہوتا اور پھر جوہڑ کے کنارے پھیلی ہوئی دوب کی مخملی تلواروں میں بیٹھ کر گھنٹوں ان مہاتموں پر غور کیا کرتا۔

مجھے دوپہر کو اپنے گھر سے چھے میل دور اپنے مزارعوں کو ہل پہنچانے تھے۔ بوڑھا جسم، اس پر مصیبتوں کا مارا ہوا، جوانی کے عالم میں تین تین من بوجھ اٹھا کر دوڑا کیا۔ مگر اب بیس سیر بوجھ کے نیچے گردن لچکنے لگتی ہے۔ بیٹے کی موت نے امید کو یاس میں تبدیل کر کے کمر توڑ دی تھی۔ اب میں بھولے کے سہارے ہی جیتا تھا ورنہ دراصل تو مر چکا تھا۔

رات کو میں تکان کی وجہ سے بستر پر لیٹتے ہی اونگھنے لگا۔ ذرا توقف کے بعد مایا نے مجھے دودھ پینے کے لیے آواز دی۔ میں اپنی بہو کی سعادت مندی پر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا اور اسے سینکڑوں دعائیں دیتے ہوئے میں نے کہا، "مجھ بوڑھے کی اتنی پروانہ کیا کرو بٹیا۔" بھولا ابھی تک نہ سویا تھا اس نے ایک چھلانگ لگائی اور میرے پیٹ پر چڑھ گیا۔ بولا، "باباجی! آپ آج کہانی نہیں سنائیں گے کیا؟" "نہیں بیٹا! میں نے آسمان پر نکلے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہوئے کہا، میں آج بہت تھک گیا ہوں۔ کل دوپہر کو تمھیں سناؤں گا۔" بھولے نے روٹھتے ہوئے جواب دیا، "میں تمھارا بھولا نہیں بابا۔ میں ماتاجی کا بھولا ہوں۔"

بھولا بھی جانتا تھا کہ میں نے اس کی ایسی بات کبھی برداشت نہیں کی۔ میں ہمیشہ اس سے یہی سننے کا عادی تھا کہ "بھولا باباجی کا ہے اور ماتاجی کا نہیں" مگر اس دن ہلوں کا کندھے پر اٹھا کر چھے میل تک لے جانے اور پیدل ہی واپس آنے کی وجہ سے میں بہت تھک گیا تھا۔ شاید میں اتنا نہ تھکتا، اگر میرا نیا جوتا ایڑی کو نہ دباتا اور اس وجہ سے میرے پاؤں میں ٹیسیں نہ اٹھتیں۔ اس غیر معمولی تھکن کے باعث میں نے بھولے کی وہ بات بھی برداشت کی۔ میں آسمان پر ستاروں کو دیکھنے لگا۔ آسمان کے جنوبی گوشے میں ایک ستارہ مشعل کی طرح روشن تھا۔ غور سے دیکھنے پر وہ مدھم سا ہونے لگا۔ میں اونگھتے اونگھتے سو گیا۔

صبح ہوتے ہی میرے دل میں خیال آیا کہ بھولا سوچتا ہو گا کہ کل رات بابا نے میری بات کس طرح برداشت کی؟ میں اس خیال سے لرز گیا کہ بھولے کے دل میں کہیں یہ خیال نہ آیا ہو کہ اب بابا میری پروا نہیں کرتے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ صبح کے وقت اس نے میری گود میں آنے سے انکار کر دیا اور بولا، "میں نہیں آؤں گا۔ تیرے پاس بابا؟"

"کیوں بھولے؟"

"بھولا بابا جی کا نہیں۔ بھولا ماتا جی کا ہے۔"

میں نے بھولا کو مٹھائی کے لالچ سے منا لیا اور چند ہی لمحات میں بھولا بابا جی کا بن گیا اور میری گود میں آ گیا اور اپنی ننھی ٹانگوں کے گرد میرے جسم سے لپٹے ہوئے کمبل کو لپیٹنے لگا۔ مایا ہری ہر استوتر پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے پاؤ بھر مکھّن نکالا اور اسے کوزے میں ڈال کر کنویں کے صاف پانی سے چھاچھ کی کھٹاس کو دھو ڈالا۔ اب مایا نے اپنے بھائی کے لیے سیر کے قریب مکھّن تیار کر لیا۔ میں بہن بھائی کے اس پیار کے جذبے پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ اتنا خوش کہ میری آنکھوں میں آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے دل میں کہا، عورت کا دل محبت کا ایک سمندر ہوتا ہے کہ ماں، باپ، بھائی بہن، خاوند بچے سب سے وہ بہت ہی پیار کرتی ہے اور اتنا کرنے پر بھی وہ ختم نہیں ہوتا۔ ایک دل کے ہوتے ہوئے بھی وہ سب کو اپنا دل دے دیتی ہے۔ بھولے نے دونوں ہاتھ میرے گالوں کی جھریوں پر رکھے۔ مایا کی طرف سے چہرے کو ہٹا کر اپنی طرف کر لیا اور بولا، "بابا تمھیں اپنا وعدہ یاد ہے نا۔۔۔؟"

"کس بات کا۔۔۔ بیٹا؟"

"تمھیں آج دوپہر کو مجھے کہانی سنانی ہے۔"

"ہاں بیٹا۔۔!" میں نے اس کا منھ چومتے ہوئے کہا۔

یہ تو بھولا ہی جانتا ہو گا کہ اس نے دوپہر کے آنے کا کتنا انتظار کیا۔ بھولے کو اس بات کا علم تھا کہ بابا جی کے کہانی سنانے کا وقت وہی ہوتا ہے جب وہ کھانا کھا کر اس پلنگ پر جا لیٹتے ہیں جس پر وہ بابا جی یا ماتا جی کی مدد کے بغیر نہیں چڑھ سکتا تھا۔ چنانچہ وقت سے آدھ گھنٹہ پیشتر ہی اس نے کھانا نکلوانے پر اصرار شروع کر دیا۔ میرے کھانے کے لیے نہیں بلکہ اپنی کہانی سننے کے چاؤ سے۔

میں نے معمول سے آدھ گھنٹہ پہلے کھانا کھایا۔ ابھی آخری نوالہ میں نے توڑا ہی تھا کہ پٹواری نے دروازے پر دستک دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہلکی سے جریب تھی۔ اس نے کہا کہ خانقاہ والے کنویں پر آپ کی زمین کو ناپنے کے لیے مجھے آج ہی فرصت مل سکتی ہے، پھر نہیں۔

دالان کی طرف نظر دوڑائی تو میں نے دیکھا۔ بھولا چارپائی کے چاروں طرف گھوم کر بستر بچھا رہا تھا۔ بستر بچھانے کے بعد اس نے ایک بڑا سا تکیہ بھی ایک طرف رکھ دیا اور خود پائینتی میں پاؤں اڑا کر چارپائی پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اگرچہ بھولے کا مجھے اصرار سے جلد روٹی کھلانا اور بستر بچھا کر میری تواضع کرنا اپنی خود غرضی پر مبنی تھا تاہم میرے خیال میں آیا۔ "آخر مایا ہی کا بیٹا ہے نہ۔۔۔ ایشور اس کی عمر دراز کرے۔"

میں نے پٹواری سے کہا، تم خانقاہ والے کنویں کو چلو اور میں تمھارے پیچھے پیچھے آ جاؤں گا۔ جب بھولے نے دیکھا کہ میں باہر جانے

کے لیے تیار ہوں تو اس کا چہرہ اس طرح مدھم پڑ گیا جیسے گزشتہ شب کو آسمان کے ایک کونے میں مشعل کی مانند روشن ستارہ مسلسل دیکھتے رہنے کی وجہ سے ماند پڑ گیا تھا۔ مایا نے کہا، "بابا جی، اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ خانقاہ والا کنواں کہیں بھاگا تو نہیں جاتا۔۔ آپ کم سے کم آرام تو کر لیں۔"

"اوہوں۔" میں نے زیر لب کہا، "پٹواری چلا گیا تو پھر یہ کام ایک ماہ سے ادھر نہ ہو سکے گا۔" مایا خاموش ہو گئی۔ بھولا منہ بسورنے لگا۔ اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اس نے کہا، "بابا میری کہانی۔۔۔ میری کہانی۔۔۔"

"بھولے، میرے بچے؟ میں نے بھولے کو ٹالتے ہوئے کہا۔ "دن کو کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔"

"راستہ بھول جاتے ہیں!" بھولے نے سوچتے ہوئے کہا، "بابا تم جھوٹ بولتے ہو۔۔۔ میں بابا جی کا بھولا نہیں بنتا۔"

اب جب کہ میں تھکا ہوا بھی نہیں تھا اور پندرہ بیس منٹ آرام کے لیے نکال سکتا تھا، بھلا بھولے کی اس بات کو آسانی سے کس طرح برداشت کر لیتا۔ میں نے اپنے شانے سے چادر اتار کر چارپائی کی پائینتی پر رکھی اور اپنی دبی ہوئی ایڑی کو جوتی کی قید بامشقت سے نجات دلاتے ہوئے پلنگ پر لیٹ گیا۔ بھولا پھر اپنے بابا کا بن گیا۔ لیٹتے ہوئے میں نے بھولے سے کہا، "اب کوئی مسافر راستہ کھو بیٹھے تو اس کے تم ذمے دار ہو۔"

اور میں نے بھولے کو دوپہر کے وقت سات شہزادوں اور سات شہزادیوں کی ایک لمبی کہانی سنائی۔ کہانی میں ان کی باہمی شادی کو میں نے معمول سے زیادہ دلکش انداز میں بیان کیا۔ بھولا ہمیشہ اس کہانی کو پسند کرتا تھا جس کے آخر میں شہزادہ اور شہزادی کی شادی ہو جائے مگر میں نے اس روز بھولے کے منہ پر خوشی کی کوئی علامت نہ دیکھی بلکہ وہ ایک افسردہ سا منہ بنائے خفیف طور پر کانپتا رہا۔

اس خیال سے کہ پٹواری خانقاہ والے کنویں پر انتظار کرتے کرتے تھک کر اپنی ہلکی ہلکی جھنکار پیدا کرنے والی جریب جیب میں ڈال کر کہیں اپنے گاؤں کا رخ نہ کر لے۔ میں جلدی جلدی مگر اپنے نئے جوتے میں دبتی ہوئی ایڑی کی وجہ سے لنگڑاتا ہوا بھاگا۔ گو مایا نے جوتی کو سرسوں کا تیل لگا دیا تھا۔ تاہم وہ نرم مطلق نہ ہوئی تھی۔

شام کو جب میں واپس آیا تو میں نے بھولے کو خوشی سے دالان سے صحن میں اور صحن سے دالان میں کودتے پھاندتے دیکھا۔ وہ لکڑی کے ایک ڈنڈے کو گھوڑا بنا کر اسے بھگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا، "چل ماموں جی کے دیس۔۔۔ رے گھوڑے، ماموں جی کے دیس۔ ماموں جی کے دیس، ہاں ہاں، ماموں جی کے دیس۔ گھوڑے۔۔۔" جوں ہی میں نے دہلیز میں قدم رکھا۔ بھولے نے اپنا گانا ختم کر دیا اور بولا، "بابا۔۔۔ آج ماموں جی آئیں گے نا۔۔۔؟"

"پھر کیا ہو گا بھولے۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔ "ماموں جی اگن بوٹ لائیں گے۔ ماموں جی کلّو (کتا) لائیں گے۔ ماموں جی کے سر پر کّی کے بھٹوں کا ڈھیر ہو گا نا بابا۔ ہمارے یہاں تو کّی ہوتی ہی نہیں بابا۔ اور تو اور ایسی مٹھائی لائیں گے جو آپ نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی۔" میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ کس خوبی سے "خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی" کے الفاظ سات شہزادوں اور سات شہزادیوں والی کہانی کے بیان میں سے اس نے یاد رکھے تھے۔ "جیتا رہے" میں نے دعا دیتے ہوئے کہا، "بہت ذہین لڑکا ہو گا اور ہمارے نام کو روشن کرے گا۔"

شام ہوتے ہی بھولا دروازے میں جا بیٹھا تا کہ ماموں کی شکل دیکھتے ہی اندر کی طرف دوڑے اور پہلے پہل اپنی ماتا جی کو اور پھر مجھے اپنے ماموں جی کے آنے کی خبر سنائے۔

دیوں کو دیا سلائی دکھائی گئی۔ جوں جوں رات کا اندھیرا گہرا ہوتا جاتا دیوں کی روشنی زیادہ ہوتی جاتی۔ متفکرانہ لہجے میں مایا نے کہا، "بابا جی۔ بھیّا ابھی تک نہیں آئے۔"

"کسی کام کی وجہ سے ٹھہر گئے ہوں گے۔"

"ممکن ہے کوئی ضروری کام آپڑا ہو۔۔۔ راکھی کے روپئے ڈاک میں بھیج دیں گے۔۔۔"

"مگر راکھی؟"

"ہاں راکھی کی کہو۔۔ انھیں اب تک تو آجانا چاہیے تھا۔"

میں نے بھولے کو زبردستی دروازے کی دہلیز پر سے اٹھایا۔ بھولے نے اپنی ماتا سے بھی زیادہ متفکرانہ لہجے میں کہا، "ماتا جی! ماموں جی کیوں نہیں آئے؟" مایا نے بھولے کو گود میں اٹھاتے ہوئے اور پیار کرتے ہوئے کہا، "شاید صبح کو آجائیں۔ تیرے ماموں جی۔ میرے بھولے۔"

پھر بھولے نے اپنے نرم و نازک بازوؤں کو اپنی ماں کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا،

"میرے ماموں جی تمھارے کیا ہوتے ہیں؟"

"جو تم ننھی کے ہو۔"

"بھائی؟"

"تم جانو۔"

"اور بنسی (بھولے کا دوست) کے کیا ہوتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔"، "بھائی بھی نہیں؟"، "نہیں"۔۔۔۔۔۔

اور بھولا اس عجیب بات کو سوچتا ہوا سو گیا۔ جب میں اپنے بستر پر لیٹا تو پھر وہ مشعل کی مانند چمکتا ہوا ستارہ آسمان کے ایک کونے میں میرے گھورنے کی وجہ سے ماند ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے پھر بھولے کا چہرہ یاد آگیا جو میرے خانقاہ والے کنوئیں کو جانے پر تیار ہونے کی وجہ سے یوں ہی ماند پڑ گیا تھا۔ کتنا شوق ہے بھولے کو کہانیاں سننے کا۔ وہ اپنی ماں کو استوتر بھی پڑھنے نہیں دیتا۔ اتنا سا بچہ بھلا گیتا کو کیا سمجھے۔ مگر صرف اس وجہ سے کہ اس کے ادھیائے کا مہاتم ایک دلچسپ کہانی ہوتا ہے۔ وہ نہایت صبر سے ادھیائے کے ختم ہونے اور مہاتم کے شروع ہونے کا انتظار کیا کرتا ہے۔

"مایا کا بھائی ابھی تک نہیں آیا۔ شاید نہ آئے۔" میں نے دل میں کہا۔ "اسے اپنی بہن کا پیار سے جمع کیا ہوا مکھن کھانے کے لیے تو آجانا چاہئے تھا۔" میں ستاروں کی طرف دیکھتے دیکھتے اونگھنے لگا۔ یکایک مایا کی آواز سے میری نیند کھلی۔ وہ دودھ کا کٹورا لیے کھڑی تھی۔ "میں نے کئی بار کہا ہے۔ تم میرے لیے اتنی تکلیف نہ کیا کرو۔"

میں نے کہا۔ دودھ پینے کے بعد فرط شفقت سے میرے آنسو نکل آئے۔ حد سے زیادہ خوش ہو کر میں مایا کو یہی دعا دے سکتا تھا کہ وہ سہاگ وتی رہے۔ کچھ ایسا ہی میں نے کہنا چاہا۔ مگر اس خیال کے آنے سے اس کا سہاگ تو برس ہوئے لٹ گیا تھا۔ میں نے کچھ نہ کچھ کہنے کی غرض سے اپنی رقت کو دباتے ہوئے کہا۔ "بیٹی۔۔۔ تمہیں اس سیوا کا پھل ملے بغیر نہ رہے گا۔" پھر میرے پہلو میں بچھی ہوئی چارپائی پر سے بھولا ننھی کو جو کہ اس کے ساتھ ہی سو رہی تھی پرے دھکیلتے ہوئے اور آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا۔ اٹھتے ہی اس نے کہا۔

"بابا۔۔۔ ماموں جی ابھی تک کیوں نہیں آئے؟"

"آجائیں گے۔۔۔ بیٹا، سو جاؤ، وہ صبح سویرے آجائیں گے۔" اپنے بیٹے کو اپنے ماموں کے لیے اس قدر بیتاب دیکھ کر مایا بھی کچھ بے تاب سی ہو گئی۔ عین اس طرح جس طرح ایک شمع سے دوسری شمع روشن ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ بھولے کو لٹا کر تھپکنے لگی۔ مایا کی آنکھوں میں بھی نیند آنے لگی۔ یوں بھی جوانی میں نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور پھر دن بھر کام کاج کر کے تھک جانے کی وجہ سے مایا گہری نیند سوتی تھی۔ میری نیند تو عام بوڑھوں کی نیند تھی۔ کبھی ایک آدھ گھنٹے تک سو لیتا۔ پھر دو گھنٹے جاگتا رہتا۔ پھر کچھ دیر اونگھنے لگ جاتا اور باقی رات اختر شماری کرتے گزار دیتا۔ میں نے مایا کو سو جانے کے لیے کہا اور بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا۔

"بتی جلتی رہنے دو۔ صرف دھیمی کر دو۔۔۔ میلے کی وجہ سے بہت سے چور چکار ادھر گھوم رہے ہیں۔۔۔" میں نے سوئی ہوئی مایا سے کہا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس دفعہ میلے پر جو لوگ آئے تھے ان میں ایسے آدمی بھی تھے جو کہ ننھے بچوں کو اغواء کر کے لے جاتے تھے۔ پڑوس کے ایک گاؤں میں دو ایک ایسی وارداتیں ہوئی تھیں اور اسی لیے میں نے بھولے کو اپنے پاس لٹا لیا تھا۔ میں نے دیکھا، بھولا جاگ رہا تھا۔ اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو میں نے بتی کو دیوار پر نہ دیکھا۔ گھبرا کر ہاتھ پسارا تو میں نے دیکھا کہ بھولا بھی بستر پر نہ تھا۔ میں نے اندھوں کی طرح در و دیوار سے ٹکراتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے تمام چارپائیوں پر دیکھا۔ مایا کو بھی جگایا۔ گھر کا کونا کونا چھانا، بھولا کہیں نہ تھا۔ "مایا ہم لٹ گئے۔"

میں نے اپنا سر پیٹتے ہوئے کہا۔ مایا ماں تھی۔ اس کا کلیجہ جس طرح شق ہوا یہ کوئی اس سے پوچھے۔ اپنا سہاگ لٹنے پر اس نے اتنے بال نہ نوچے تھے جتنے کہ اس وقت نوچے۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا اور وہ دیوانوں کی طرح چیخیں مار رہی تھی۔ پاس پڑوس کی عورتیں شور سن کر جمع ہو گئیں اور بھولے کی گمشدگی کی خبر سن کر رونے پیٹنے لگیں۔ میں عورتوں سے زیادہ پیٹ رہا تھا۔ آج میں نے ایک بازی گر کو اپنے گھر کے اندر گھورتے بھی دیکھا تھا۔ مگر میں نے پرواہ نہ کی تھی۔ آہ! وہ وقت کہاں سے ہاتھ آئے۔ میں نے دعائیں کیں کہ کسی وقت کا دیا کام آ جائے۔ منتیں مانیں کہ بھولا مل جائے۔ وہی گھر کا اجالا تھا۔ اسی کے دم سے میں اور مایا جیتے تھے۔ اس کی آس سے ہم اڑتے پھرتے تھے۔ وہی ہماری آنکھوں کی بینائی، وہی ہمارے جسم کی توانائی تھا۔ اس کے بغیر ہم کچھ نہ کرتے تھے۔ میں نے گھوم کر دیکھا مایا بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ اندر کی طرف مڑ گئے تھے۔ نسیں کھچی ہوئی اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور عورتیں اس کی ناک بند کر کے اک چمچے سے اس کے دانت کھولنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں سچ کہتا ہوں ایک لمحے کے لیے میں بھولے کو بھی بھول گیا۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک ساتھ گھر کے دو بشر جب دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے چلے جائیں تو اس وقت دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے لرزتے ہوئے ایشور کو برا بھلا کہا کہ ان دکھوں کو دیکھنے سے پیشتر اس نے میری ہی جان کیوں نہ لے لی۔ آہ! مگر جس کی قضا آتی ہے اس کے سوا کسی اور کا بال تک بیکا

نہیں ہوتا۔ قریب تھا کہ میں بھی مایا کی طرح گر پڑوں کہ مایا ہوش میں آ گئی۔ مجھے پہلے سے کچھ سہارا ملا۔ میں نے دل میں کہا، میں ہی مایا کو سہارا دے سکتا ہوں اور اگر میں خود اس طرح حوصلہ چھوڑ دوں تو مایا تو کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ میں نے حواس جمع کرتے ہوئے کہا۔

"مایا بیٹی!۔۔۔ دیکھو! مجھے یوں خانہ خراب مت کرو۔۔۔ حوصلہ کرو۔ بچے اغواء ہوتے ہیں مگر آخر مل بھی جاتے ہیں۔ بازی گر بچوں کو مارنے کے لیے نہیں لے جاتے۔ پال کر بڑا کر کے کسی کام میں لانے کے لیے لے جاتے ہیں۔ بھولا مل جائے گا۔"

ماں کے لیے یہ الفاظ بے معنی تھے۔ مجھے بھی اپنے اس طرح صبر کرنے پر گمان ہوا گویا میں اس وجہ سے چپ ہو گیا ہوں کہ مایا کے مقابلے میں بھولے سے بہت کم پیار ہے۔ مگر "نہیں" میں نے کہا "مرد کو ضرور کچھ حوصلہ رکھنا چاہئے۔"

اس وقت آدھی رات ادھر تھی اور آدھی ادھر جب ہمارا پڑوسی اس حادثے کی خبر تھانے میں پہنچانے کے لیے جو گاؤں سے دس کوس دور شہر میں تھا، روانہ ہوا۔ باقی ہم سب ہاتھ ملتے ہوئے صبح کا انتظار کرنے لگے۔ تاکہ دن نکلنے پر کچھ سجھائی دے۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور ہم نے بھولے کے ماموں کو اندر آتے دیکھا۔ اس کی گود میں بھولا تھا۔ اس کے سر پر مٹھائی کی ٹوکریاں اور ایک ہاتھ میں بتی تھی۔ ہمیں تو گویا تمام دنیا کی دولت مل گئی۔ مایا نے بھائی کو پانی پوچھا نہ خیریت اور اس کی گود سے بھولے کو چھین کر اسے چومنے لگی۔ تمام اڑوس پڑوس نے مبارکباد دی۔ بھولے کے ماموں نے کہا۔

"مجھے کسی کام کی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔ دیر سے روانہ ہونے پر رات کے اندھیرے میں، میں اپنا راستہ گم کر بیٹھا تھا۔ یکایک مجھے ایک طرف سے روشنی آتی دکھائی دی۔ میں اس کی جانب بڑھا۔ اس خوف ناک تاریکی میں پرس پور سے آنے والی سڑک پر بھولے کو بتی پکڑے ہوئے اور کانٹوں میں الجھے ہوئے دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ میں نے اس وقت اس کے وہاں ہونے کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا۔۔۔ کہ بابا جی نے آج دوپہر کے وقت مجھے کہانی سنائی تھی اور کہا تھا کہ دن کے وقت کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ تم دیر تک نہ آئے تو میں نے یہی جانا کہ تم راستہ بھول گئے ہو گے اور بابا نے کہا تھا کہ اگر کوئی مسافر راستہ بھول گیا تو تم ذمے دار ہو گے نا۔۔۔!!"

6.2.3 خلاصہ:

افسانہ "بھولا میں" ایک معصوم بچے کی نفسیات، جذباتی حساسیت اور خاندانی رشتوں کی لطافت کو بڑے ہی ہنر مندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کہانی کے مرکزی کرداروں میں دادا، مایا (بیوہ بہو) اور اس کا چھوٹا بیٹا بھولا ہیں، جو سب ایک ساتھ رہتے ہیں۔ افسانہ ایک عام مگر جذبات سے لبریز دیہی ماحول میں واقع ہوتا ہے۔

مایا کا بھائی راکھی بندھوانے کے لیے آنے والا ہے اور اس کی تیاری میں وہ مکھّن نکال رہی ہے۔ یہ عمل معمولی لگتا ہے، لیکن دراصل وہ اپنے بھائی کے لیے محبت، خلوص اور جذبات کی علامت کے طور پر کیا جا رہا ہے۔

دوسری طرف بھولا، ایک نہایت معصوم اور حساس بچہ، دادا سے دن میں کہانی سننے کی ضد کرتا ہے۔ دادا لاپرواہی سے کہہ دیتا ہے کہ "دن میں کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں"۔ یہ جملہ بھولے کے ذہن میں گھر کر جاتا ہے۔

جب مایا کا بھائی (بھولا کا ماموں) وقت پر نہیں آتا، تو بھولا یہ سمجھتا ہے کہ ماموں واقعی راستہ بھول گئے ہوں گے اور یہ سب اس کی دن میں کہانی سننے کی ضد کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ موم بتی لے کر ماموں کو راستہ دکھانے رات کو تنہا نکل پڑتا ہے۔ یہ معصومیت، محبت اور ذمہ داری کا بے مثال اظہار ہے۔

گھر والے پریشان ہو جاتے ہیں۔ لیکن جلد ہی ماموں آ جاتے ہیں اور بھولا ان کی گود میں ہوتا ہے۔ سب حیران اور جذباتی ہو جاتے ہیں، کیونکہ بھولا ایک معصوم جذبے سے ایسا عمل کرتا ہے جو بڑوں کو بھی ہلا دیتا ہے۔

افسانہ "بھولا" بچوں کی معصومیت اور گھر کے رشتوں کی اہمیت کو نہایت سادہ مگر گہرے انداز میں بیان کرتا ہے۔ اس کہانی میں ایک چھوٹے سے لڑکے "بھولا" کے ذریعے یہ دکھایا گیا ہے کہ بچے کتنے حساس ہوتے ہیں۔ وہ بڑوں کی باتوں کو دل سے لگا لیتے ہیں اور ان پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ چاہے وہ بات مذاق میں ہی کیوں نہ کہی گئی ہو۔ یہ افسانہ ہمیں پریم چند کے افسانے "عید گاہ" کی بھی یاد دلاتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی نے اس کہانی کو سادہ اور محبت بھرے الفاظ میں لکھا ہے۔ ان کی زبان عام فہم ہے، مگر اس میں جذبات کی گہرائی چھپی ہوئی ہے۔ قاری کو کہانی کے ہر منظر میں سچائی اور خلوص محسوس ہوتا ہے۔

افسانے میں مایا نامی ایک بیوہ عورت، اس کا بیٹا بھولا اور دادا جیسے کردار موجود ہیں۔ مایا کی زندگی میں اکیلا پن اور امید کا میل ہے، وہ راکھی کے دن اپنے بھائی کے آنے کی تیاری کرتی ہے۔ بھولا اپنے دادا سے دن میں کہانی سننے کی ضد کرتا ہے اور دادا کی کہی ہوئی بات کہ "دن میں کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں" بھولا کے دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ بعد میں جب ماموں وقت پر نہیں آتے تو بھولا یہ سوچ کر موم بتی لے کر نکل پڑتا ہے کہ وہ انہیں راستہ دکھا دے۔

یہ سب اس بات کا ثبوت ہے کہ بچے کتنے حساس، سچے اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ بڑوں کی باتوں کو مذاق نہیں سمجھتے، بلکہ دل سے مانتے ہیں۔ اس کہانی میں تنہائی، بیوگی، محبت، احساسِ جرم اور معصوم جذبات کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

6.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری کی سب سے نمایاں خصوصیت نفسیاتی حقیقت نگاری ہے۔ وہ انسان کے باطن، جذبات اور داخلی کشمکش کو بڑی سادگی اور گہرائی سے پیش کرتے ہیں۔
- راجندر سنگھ بیدی کی زبان سادہ مگر علامتی ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار جیتے جاگتے، تضاد سے بھرپور اور عام زندگی سے جڑے ہوتے ہیں۔ بیدی نے خاص طور پر عورتوں، غریبوں اور مظلوم طبقات کے جذبات اور مسائل کو مؤثر انداز میں اجاگر کیا۔
- راجندر سنگھ بیدی یکم ستمبر 1915ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ بیدی کے والد کا نام ہیرا سنگھ بیدی اور والدہ کا نام سیوا دیوی تھا۔

- راجندر سنگھ بیدی کے والد کھتری سکھ اور والدہ برہمن تھے۔ بیدی نے ابتدائی تعلیم لاہور چھاؤنی کے صدر بازار کے ایک اسکول میں حاصل کی۔
- بیدی کا پہلا اردو افسانہ جس کا عنوان "مہارانی کا تحفہ" تھا، جو رسالہ "ادبی دنیا" لاہور کے سالنامہ 1937ء میں شائع ہوا اور اسے "ادبی دنیا" میں گزشتہ برس شائع ہونے والے سبھی افسانوں میں بہترین افسانہ قرار دیا گیا۔
- اردو فکشن کی دنیا میں ان کے ممتاز مقام و مرتبے اور فلموں کے تعلق سے ان کے گراں قدر تعاون کے اعتراف کے طور پر انہیں مختلف اعزازات سے نوازا گیا۔ 1965ء میں انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ' 1972ء میں پدم شری' 1978ء میں غالب ایوارڈ اور فلم فیئر ایوارڈ بھی دیے گئے۔
- 11 نومبر 1984 کو بمبئی میں بیدی کا انتقال ہوا
- افسانہ "بھولا میں" ایک معصوم بچے کی نفسیات، جذباتی حساسیت اور خاندانی رشتوں کی لطافت کو بڑے ہنر مندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کہانی کے مرکزی کرداروں میں دادا، مایا (بیوہ بہو) اور اس کا چھوٹا بیٹا بھولا ہیں، جو سب ایک ساتھ رہتے ہیں۔ افسانہ ایک عام مگر جذبات سے لبریز دیہی ماحول میں واقع ہوتا ہے۔
- راجندر سنگھ بیدی نے اس کہانی کو سادہ اور محبت بھرے الفاظ میں لکھا ہے۔ ان کی زبان عام فہم ہے، مگر اس میں جذبات کی گہرائی چھپی ہوئی ہے۔ قاری کو کہانی کے ہر منظر میں سچائی اور خلوص محسوس ہوتا ہے۔

6.4 مشکل الفاظ

امتزاج	ملاپ، کسی چیز کا دوسری چیز میں شامل ہو جانا	Mixture, Fusion
لاشعوری میلانات	وہ خواہشات یا رجحانات جو انسان کو خود بھی معلوم نہ ہوں	Unconscious tendencies
نفسیاتی کشمکش	ذہنی الجھن، دماغ میں چلنے والی اُلجھنیں	Psychological conflict
داخلی کشمکش	انسان کے دل یا دماغ کے اندرونی تنازعہ یا تکرار	Inner conflict
لطافت	نرمی، نزاکت، خوبصورتی یا نفاست	Subtlety, Delicacy, Grace
رکھشا	حفاظت، بچاؤ	Protection, Safeguard
سہاگن	شادی شدہ عورت، جس عورت کا شوہر موجود ہو	Married woman
مشعل	روشنی دینے والا چراغ یا جلتی ہوئی لکڑی	Torch, Flame
ادھیائے	باب یا فصل (زیادہ تر ہندو مذہبی کتابوں میں)	Chapter (Sanskrit/Hindi origin)

6.5 مشقیں

مشق 1: دیے گئے الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

1۔ فکشن .....

2۔ ایوارڈ .....

3۔ بیوہ .....

4۔ اکیلا پن .....

5۔ خوف ناک .....

مشق 2: دیے گئے جملوں میں صحیح اور غلط کی نشاندہی کیجیے۔

1۔ راجندر سنگھ بیدی کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ ( )

2۔ راجندر سنگھ بیدی کے والد کا نام عجائب لال تھا۔ ( )

3۔ بھولا کی ماں کا نام مایا ہے۔ ( )

4۔ افسانہ بھولا راجندر سنگھ بیدی نے لکھا ہے۔ ( )

5۔ راجندر سنگھ بیدی کا انتقال 1984 میں ہوا۔ ( )

مشق 3: دیے گئے الفاظ کے معنی لکھیے۔

1۔ ادھیائے .....

2۔ رکھشا .....

3۔ امتزاج .....

4۔ لطافت .....

5۔ نفسیاتی کشمکش .....

6.6 نمونہ امتحانی سوالات

6.6.1 معروضی سوالات:

1۔ راجندر سنگھ بیدی کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی؟

1905 (a) 1910(b) 1912(c) 1915 (d)

2۔ راجندر سنگھ بیدی کے والد کا نام کیا تھا؟

(a)ہیرا سنگھ بیدی (b)مہندر سنگھ بیدی (c)کنور سنگھ بیدی (d)بیرا سنگھ بیدی

3۔ راجندر سنگھ بیدی کی والدہ کا نام کیا تھا؟

(a) شیورانی دیوی (b)سیوا دیوی (c)مالنی دیوی (d)کماری دیوی

4۔ اردو میں راجندر سنگھ بیدی کا پہلا افسانہ کون سا شائع ہوا؟

(a) بھولا (b)لاجونتی (c)مہارانی کا تحفہ (d)گرہن

5۔ راجندر سنگھ بیدی نے ابتدا میں کس نام سے لکھنا شروع کیا؟

(a)محسن لاہوری (b)بیدی (c)محسن کاکوروی (d)راجندر سنگھ

6۔ پنجابی زبان میں راجندر سنگھ بیدی کا پہلا افسانہ کون سا شائع ہوا؟

(a)دکھ سکھ (b)کلیانی (c)تلادان (d)رحمٰن دی جتی

7۔ راجندر سنگھ بیدی کا پہلا اردو افسانہ کس رسالے میں شائع ہوا؟

(a) دلگداز (b)زمانہ (c)ادبی دنیا (d)مخزن

8۔ افسانہ "بھولا" کس نے لکھا؟

(a)راجندر سنگھ بیدی (b)پریم چند (c)کرشن چندر (d)سعادت حسن منٹو

9۔ راجندر سنگھ بیدی کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کس سنہ میں ملا؟

1955(a) 1960(b) 1965(c) 1970(d)

10۔ راجندر سنگھ بیدی کا انتقال کہاں ہوا؟

(a)دہلی (b)بمبئی (c)لاہور (d)پنجاب

6.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ راجندر سنگھ بیدی کے ابتدائی حالات لکھیے۔

2۔ بیدی کی ملازمت اور دیگر مصروفیات کا حال لکھیے۔

3۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کے موضوعات پر تبصرہ کیجیے۔

4۔ بھولا کے ماموں جی پر ایک نوٹ لکھیے۔

5۔ افسانہ "بھولا" کی کردار "مایا" پر نوٹ لکھیے۔

6.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ راجندر سنگھ بیدی کا تعارف پیش کیجیے۔

2۔ افسانہ "بھولا" کا خلاصہ بیان کیجیے۔

3۔ راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کیجیے۔

6.6.1 کے جوابات:

A (v)	C (iv)	B (iii)	A (ii)	D (i)
B (x)	C (ix)	A (viii)	C (vii)	A (vi)

اکائی 7: ڈراما

(انار کلی: امتیاز علی تاج)

اکائی کے اجزا

7.0		تمہید
7.1		مقاصد
7.2		ڈراما: "انار کلی" (امتیاز علی تاج)
	7.2.1	امتیاز علی تاج کا تعارف
	7.2.2	انار کلی کا قصہ
	7.2.3	انار کلی کے کردار
	7.2.4	"انار کلی" کا متن (اقتباس)
	7.2.5	خلاصہ
7.3		اکتسابی نتائج
7.4		مشکل الفاظ
7.5		مشقیں
7.6		نمونۂ امتحانی سوالات

7.0 تمہید

نقل کی صلاحیت انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ دوسروں کو دیکھ کر سیکھنا اور خود ویسا ہی کرنا، انسان نے شاید اس عمل کا آغاز اسی وقت سے کر دیا تھا کہ جب اس نے دنیا میں قدم رکھا تھا۔ نقل کرنے کی یہی انسانی جبلت ڈرامے کا نقش اول قرار دی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی تہذیب کا مطالعہ ہمیں اس حقیقت سے واقف کراتا ہے کہ کسی مخصوص صورت حال یا واقعہ سے دوسروں کو آگاہ کرنے کے لیے "کر کے دکھانا" کی تکنیک یا طریقہ کار اختیار کیا جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے مذہبی عقائد سے متعلق اور دیومالائی تصورات کے حامل واقعات کو عمل کے ذریعہ پیش کیا جانے لگا۔ پیش کش کے اس عمل سے وقت گزرنے کے ساتھ نکھار آتا گیا۔ قصہ، کردار، مکالمہ اور پس منظر کی ابتدائی شکلیں وجود میں آئیں اور اس طرح اسٹیج کا تصور قائم ہوا۔ یہی وہ ابتدائی صورتیں ہیں جنہیں ہم ڈرامے کا نام دے سکتے ہیں۔

اصناف شعر وادب میں ڈراما واحد صنف ادب ہے جس کا تعلق قلم وکاغذ سے آگے بڑھ کر اس کی عملی پیش کش یعنی اسٹیج سے بھی ہے۔ڈرامے کی ادبی اور فنی اہمیت کے پیش نظر اس اکائی میں اردو کے ممتاز ڈراما نگار سید امتیاز علی تاج اور ان کے مشہور ترین ڈرامے انار کلی سے آپ کو واقف کرایا جارہا ہے۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- امتیاز علی تاج کی حیات اور ان کی تصانیف سے واقف ہو سکیں۔
- ڈراما انار کلی کے اسلوب بیان، مکالموں کی خوبی اور منظر کشی سے لطف اندوز ہو سکیں۔
- ڈراما انار کلی کی ادبی اہمیت اور فنی خصوصیات کو سمجھ سکیں۔

7.2 ڈراما: "انار کلی" (امتیاز علی تاج)

7.2.1 امتیاز علی تاج کا تعارف:

سید امتیاز علی تاج کی پیدائش 13 / اکتوبر 1900ء کو لاہور میں ہوئی۔ ان کے اجداد کا تعلق بخارا سے تھا اور اورنگ زیب کے دور حکومت میں یہ خاندان یوپی کے ضلع سہارنپور کے قصبہ دیوبند میں آکر بس گیا تھا۔ امتیاز علی تاج کا گھرانہ اپنے علمی پس منظر کی وجہ سے جانا جاتا تھا اور خود ان کے والد مولوی سید ممتاز علی (پیدائش 1868ء۔ وفات 1935ء) عربی، فارسی اور انگریزی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کی علمیت کے اعتراف میں برطانوی سرکار نے انہیں شمس العلما کا خطاب عطا کیا تھا۔ وہ عالم دین بھی تھے اور قرآنی علوم پر ان کی ایک اہم تصنیف "تفصیل البیان فی مقاصد القرآن" کے نام سے تین جلدوں میں موجود ہے۔ امتیاز علی تاج کی والدہ محمدی بیگم بھی تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور اصلاح نسواں کی تحریک میں اپنے شوہر کی دست راست تھیں۔ 1906ء میں انہوں نے "شیر مادر" کے نام کے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ امتیاز نے اپنے والد اور والدہ دونوں کا اثر قبول کیا تھا اور علم وادب سے شغف نیز اپنے مقاصد سے لگن انہیں اپنے والدین سے ورثہ میں ملی تھی۔

امتیاز علی تاج کی تعلیم کا آغاز ایک انگریزی اسکول سے ہوا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے کالج میں داخلہ لے لیا اور گورنمنٹ کالج لاہور سے 1922ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ بچپن سے ہی امتیاز کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور کالج میں داخلہ لینے کے بعد سے ان کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ڈراموں میں انہیں شروع سے ہی دلچسپی تھی اور وہ پارسی تھیٹر سے وابستہ بھی رہے وہ ڈرامے بھی لکھتے اور ان میں اداکاری بھی کرتے۔ اس طرح نہ صرف انہیں ڈراما نگاری کے رموز سے آگاہی ہوئی بلکہ انہوں نے اسٹیج کے تقاضوں سے بھی واقفیت حاصل کی۔ 1918ء میں انہوں نے لاہور سے "کہکشاں" نام کا ایک رسالہ جاری کیا۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کا یہ تخلیقی سفر ڈراموں مضامین، کہانیوں اور ادب اطفال پر مشتمل تھا۔

1935ء میں امتیاز علی تاج نے اس دور کی ممتاز افسانہ نگار حجاب اسماعیل (پیدائش 1915ء۔ وفات 2024ء) سے شادی کرلی۔

حجاب اسماعیل بحثیت ناول وافسانہ نگار شہرت کی حامل ہیں۔ ان کا ناول ظالم محبت اور افسانوی مجموعہ میری ناتمام محبت بہت مشہور ہے۔ امتیاز علی تاج کی صرف ایک ہی بیٹی ہیں یاسمین جو خود بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔

تاج نے ملازمت کا آغاز آل انڈیا ریڈیو سے کیا اور تقسیم ہند کے بعد ریڈیو پاکستان کے قیام میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ 1958ء میں انہیں مجلس ترقی ادب لاہور جیسے موقر علمی وادبی ادارے کا نگران مقرر کیا گیا۔ اس کے علاوہ بزم اقبال اور دارالاشاعت پنجاب سے بھی ان کا تعلق رہا۔ انہیں فلموں سے بھی کافی دلچسپی تھی اور کئی فلمیں انہوں نے ڈائرکٹ کیں جن میں فلم "گلنار" خاص شہرت کی حامل ہے۔ وہ فلموں میں مکالمے اور کہانیاں بھی لکھا کرتے تھے۔ پاکستان کی حکومت نے ان کی ادبی وعلمی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کو ستارۂ امتیاز کے خطاب سے سرفراز کیا۔

امتیاز علی تاج کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ ادیب، شاعر، ڈراما نگار اور مزاح نگار سبھی کچھ تھے۔ 9 اپریل 1970ء کو کسی نے ان پر سوتے میں قاتلانہ حملہ کیا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور ان کا انتقال ہو گیا۔

امتیاز علی تاج بحثیت ڈراما نگار زیادہ مشہور ہوئے۔ وہ ڈراما نگار، شاعر، مزاح نگار، بچوں کے ادیب، صحافی، فلم کے کہانی کار اور مکالمہ نگار غرضیکہ ایک ہمہ جہت علمی وادبی شخصیت کے حامل تھے۔ لیکن ان کی اصل شہرت ایک ڈراما نگار کی حیثیت سے ہے اور اس کی وجہ ان کا مشہور ترین ڈراما انارکلی ہے جو اردو کا سب سے اچھا ڈراما قرار دیا جا سکتا ہے۔ انارکلی کے علاوہ امتیاز کے لکھے چند ڈرامے ذیل میں درج ہیں۔

1۔ پرتھوی راج　　2۔ دلہن　　3۔ جہاں آرا　　4۔ سکندر

5۔ قرطبہ کا قاضی　　6۔ یاسمین

ڈراموں کے علاوہ تاج نے بچوں کے لیے کہانیاں بھی کثرت سے لکھیں۔ ان کہانیوں میں سے چند کے نام نیچے دیئے جا رہے ہیں۔

1۔ بیربل کی کہانیاں 2۔ بچوں کی بہادری 3۔ چڑیاخانہ　　4۔ پھول باغ

5۔ انصاف کی کہانیاں　　6۔ پرستان کی شہزادی　　7۔ جادو کا برج　　8۔ سمندری شہزادہ

ان کے علاوہ پردہ قرآنی نقطۂ نظر سے "موت کا راگ" جہاں گیر ہیبت ناک افسانہ وغیرہ بھی ان کی اہم تصانیف ہیں۔ ان کی کتاب چچا چھکن اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

7.2.2 انارکلی کا قصہ:

اس ڈرامے میں جو قصہ یا واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ مختصراً اس طرح ہے۔

مغل شہنشاہ اکبر اعظم نے اپنے حرم کی ایک خوبصورت اور نوخیز کنیز نادرہ بیگم کو انارکلی کا خطاب عطا کیا۔ خطاب سے سرفراز ہوتے ہی انارکلی محل سرا کے تمام افراد بشمول دیگر کنیزوں اور خواجہ سراؤں وغیرہ کی نگاہوں کا مرکز بن گئی۔ اس کی اس قدر منزلت سے انارکلی سے قبل اکبر کی منظور نظر دل آرام کو بے حد حسد ہوا اور وہ انارکلی کو نقصان پہنچانے کے موقع کی تلاش میں رہنے لگی۔ اسی درمیان جب اسے یہ علم ہو جاتا ہے کہ شہزادہ سلیم بھی انارکلی کی محبت میں گرفتار ہے تو اس کا جذبۂ انتقام اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے کیونکہ وہ خود بھی شہزادے میں دلچسپی لے رہی تھی اور اسے حاصل کرنا چاہتی تھی تاکہ اس کا ملکۂ ہندوستان بننے کا خواب پورا ہو سکے۔ وہ

انار کلی کے گرد سازشوں کا جال بننا شروع کر دیتی ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ سلیم کی انار کلی سے محبت کا راز کسی طرح اکبر اعظم کے کانوں تک پہنچ جائے۔ انار کلی بھی سلیم کو چاہتی ہے لیکن چونکہ وہ ایک کنیز ہے اس لیے اس عشق کے انجام سے بھی ڈرتی ہے۔ سلیم کا دوست بختیار عاقل اور صائب الرائے شخص ہے وہ سلیم کے جذبوں کی شدت سے بھی واقف ہے لیکن یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا دوست سلیم بڑی حد تک قوت عمل سے محروم ہے اور شاید اکبر اعظم اور سلیم کے اس ٹکراؤ میں غریب انار کلی کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سلیم کو اس راستے پر مزید آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ ثریا انار کلی کی چھوٹی بہن ہے جو حرکیاتی شخصیت کی مالک ہے وہ زیرک اور ذہین بھی ہے، دل آرام کی چالوں کو سمجھ لیتی ہے۔ لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔ دل آرام جشن نوروز کے موقعہ پر انار کلی کو مفرح عرق کے بدلے شراب پلا دیتی ہے۔ نشے میں انار کلی آداب شاہی فراموش کر بیٹھتی ہے۔ وہ رقص کے دوران سلیم کو انتہائی واضح اشارے کرنے لگتی ہے۔ اسے نشے میں یہ احساس ہی نہیں رہتا کہ محفل میں خود اکبر اعظم بھی موجود ہیں۔ دل آرام بہانے سے اکبر کے قریب جاتی ہے اور اسے انار کلی اور سلیم کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اکبر غیظ وغضب کے عالم میں کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کا اگلا ہی حکم انار کلی کو تنگ و تاریک قید خانے میں پہنچا دیتا ہے۔ سلیم کی خواہش پر بختیار داروغہ زنداں کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ رات کو قید خانے میں سلیم کو انار کلی سے ملنے دے۔ سلیم انار کلی کو قید سے نکال کر لے جانا چاہتا ہے۔ لیکن داروغۂ زنداں کی دروغ گوئی اسے باز رکھتی ہے۔ وہ سلیم کو وہاں سے ہٹا دیتا ہے اور خود جا کر اکبر اعظم کو سارے واقعہ کی اطلاع دے دیتا ہے۔ اکبر کا قہر وغضب پھٹ پڑتا ہے اور اس کے اگلے حکم کے مطابق انار کلی زندہ دیوار میں چنوا دی جاتی ہے۔ ہوش میں آنے پر سلیم ہوش وخرد سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ سلیم کی یہ حالت دیکھ کر اکبر کو اپنی نامرادی وناکامی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہ سلیم کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ وہ شہنشاہ نہیں بلکہ صرف اور صرف اس کا باپ ہے اور اس نے جو کچھ بھی کیا اپنے بیٹے کی بہتری کے لیے کیا۔ لیکن اکبر سلیم کو یہ یقین دلانے میں کامیاب نہیں ہو پاتا اور ڈرامے کے آخر میں اس کی حیثیت ایک ایسے ناکام شخص کی رہ جاتی ہے جسے کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔

7.2.3 ڈراما "انار کلی" کے کردار:

جہاں تک ڈرامے کے کرداروں کا تعلق ہے۔ اس ڈرامے میں پندرہ کردار باقاعدہ عمل اور مکالمے کے ذریعہ ڈرامے میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ درج ذیل ہیں:

1۔ اکبر	(شہنشاہ ہندوستان)
2۔ سلیم	(ولی عہد سلطنت)
3۔ رانی	(ملکۂ ہندوستان)
4۔ انار کلی	(اکبر کی منظور نظر کنیز)
5۔ دل آرام	(انار کلی سے پہلے اکبر کی منظور نظر کنیز)
6۔ انار کلی کی ماں	
7۔ زعفران	(کنیز)

8۔ستارہ	(کنیز)
9۔عنبر	(کنیز دل آرام کی رازدار)
10۔مروارید	(کنیز دل آرام کی رازدار)
11۔بختیار	(سلیم کا دوست)
12۔ثریا	(انارکلی کی بہن)
13۔خواجہ سرا کافور	(کنیزوں کا داروغہ)
14۔داروغہ زندان	
15۔حکیم ہمام	(شاہی طبیب)

7.2.4 ڈراما:"انارکلی" متن(اقتباس):

باب اول(عشق)منظر دوم

شہزادہ سلیم کے محل کا شمال مغربی ایوان۔ محل قلعہ لاہور میں حرم سرا کی چار دیواری سے باہر لیکن اس سے بہت کم فاصلے پر واقع ہے۔یہ ایوان جس کے آگے ایک جھروکے دار مثمن برج ہے۔بیرونی منظر کی سرسبز وشادابی کے باعث ایسا دل کشا اور فرحت زا مقام بن گیا ہے کہ کوئی بھی مغل بادشاہ اپنے اوقات فرصت گزارنے کے لیے تمام محل میں سے اس ایوان کے سوا دوسرا مقام منتخب نہ کر سکتا۔

دور جہاں غروب آفتاب نیلے آسمان پر ارغوانی رنگ آمیزی کر رہا ہے۔گھنے پیڑوں کے طویل سلسلے میں سے کھجور کے سربلند اور ساکت درخت کالے کالے نظر آرہے ہیں۔راوی ان دور کی رنگینیوں کو اپنے دامن میں قلعے کی دیوار تک لانے کی کوشش کر رہی ہے۔برج کے مغربی جھروکے میں سے ایک مسجد کے سفید گنبد اور سرخ میناروں کا کچھ حصہ نظر آتا ہے۔

اندر برج کے آگے سنگ مرمر کا ایک چبوترہ ہے جو تمام ایوان کے عرض میں پھیلا ہوا ہے۔اس چبوترے کے دونوں پہلوؤں پر مغلیہ انداز کی محرابوں والے دروازے ہیں جن سے دایاں حرم سرا کو اور بایاں بیرونی حصوں کو جاتا ہے۔ تین سیڑھیاں جو چبوترے ہی کے برابر عریض ہیں ایوان میں اترتی ہیں۔ایوان کی دائیں اور بائیں دیوار میں محل کے دوسرے حصوں میں جانے کے دروازے ہیں۔

ایوان میں بیش قیمت ایرانی قالین بچھے ہیں جن پر زری کے تکیوں والی مسند جڑاؤ تخت پر رکھی ہوئی بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ سامان آرائش کم مگر پر تکلف ہے اور اگرچہ تزئین میں بے حد سادگی سے کام لیا گیا ہے اور بحیثیت مجموعی ایوان کسی قدر خالی خالی معلوم ہوتا ہے مگر دیواروں کے نقش ونگار برج کے جھروکوں پر جالیوں کی صنعت۔ دروازوں پر گراں قیمت بھاری بھاری اطلسی پردے اور مناسب مقامات پر طلائی چوکیاں، ہشت پہلو میزیں اور ان پر جڑاؤ پھولدان دیکھنے سے مغلیہ تجمل کا اثر دل پر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

سلیم برج کے جھروکے میں بیٹھا راوی پر غروب آفتاب کو دیکھ رہا ہے۔اندرزعفران اور ستارہ دف بجا بجا کر ناچ رہی ہیں۔ مگر ان کو علم ہے کہ سلیم متوجہ نہیں۔کچھ دیر ناچنے کے بعد وہ ٹھہر جانے میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتیں۔ مگر کھڑی کھڑی اس خیال سے پاؤں ہلاتی رہتی

ہیں کہ سلیم سمجھے کہ ناچ رہی ہیں۔ زعفران ستارہ کو اشارے سے چلنے کے لیے کہتی ہے۔ ستارہ نفی میں سر ہلا دیتی ہے۔ آخر دونوں قریب آکر سرگوشیوں میں گفتگو شروع کر دیتی ہیں۔

ستارہ : پوچھ لے پہلے۔

زعفران : چل بھی دے چپکے سے۔ انہیں دریا کی سیر سے فرصت کہاں؟

ستارہ : اور جو مہارانی پوچھ بیٹھیں۔ ایسی جلدی کیوں لوٹ آئیں۔

زعفران : کہہ دیں گے۔ وہ تو دیکھ رہے تھے لہروں کا ناچ۔ ہم دیواروں کے آگے ناچتے گاتے؟

ستارہ : ہاں کہہ ہی تو دیں گے؟

زعفران : اور کیا نہیں بھی؟

ستارہ : اے تو تم اجازت ہی جو لے لو۔ تم سے تو بہت ہنس ہنس کر باتیں کیا کرتے ہیں۔ کیوں؟

زعفران : (جیسے شرما گئی۔ ہلکا سا طمانچہ مارتی ہے) چل قطامہ!

ستارہ : افوہ شرما بھی تو گئیں۔

زعفران : میں کیوں شرماتی۔ پوچھ لیتے ہیں ہم (زعفران اس انداز سے سلیم کی طرف جاتی ہے گویا ایک اہم خدمت کے لیے منتخب کی گئی ہے۔ کہیں پاؤں ٹیڑھا پڑ جاتا ہے اور گر پڑتی ہے)

(سلیم چونک کر زعفران کی طرف دیکھتا ہے اور برج میں سے اٹھ کر اندر آجاتا ہے تیکھے نقش کا وارستہ مزاج طبیعت کا بندہ جو شباب کے اولیں مراحل میں ہے)

سلیم : کیا ہوا زعفران؟

ستارہ : (ہنستی ضبط کرتے ہوئے) حضور رخصت کی اجازت لینے جا رہی تھیں۔ (نگوڑے چیونٹے سے ٹھوکر۔ (کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے)

زعفران : نامراد ہنسے جا رہی ہے کھڑی کھڑی۔

سلیم : تم چاہتی ہو۔ تمہیں آکر اٹھائے۔ (سلیم زعفران کو اٹھانے کے لیے اس کی طرف بڑھتا ہے۔ زعفران خود اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ ستارہ شوخی سے اس کے کپڑے جھاڑنے لگتی ہے۔ زعفران اسے ایک تھپڑ رسید کرتی ہے۔)

سلیم : تم بہت شوخ ہو زعفران۔

زعفران : ہاں حضور بھی جب کہتے ہیں۔ ہمیں ہی شوخ کہتے ہیں۔ (ناز کے مصنوعی کھسیانے پن سے) ایک تو میں لے کے گر پڑی (سلیم اور ستارہ دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے ہیں) حضور کو تو ہنسی کی سوجھ رہی ہے۔ جاتے ہیں ہم (چلی ہی تو جائیں گی)

سلیم : (مسکراتے ہوئے) کہاں چلیں؟ بات تو سنو۔

زعفران : (چلتے چلتے رک کر ستارہ کی طرف دیکھتی ہے۔ اس کے چہرے پر پھر ایک پر معنی تبسم ہے) پھر اس کو بھیج دیجئے یہاں

سے۔

سلیم : وہ تمہیں کیا کہہ رہی ہے؟

ستارہ : اب تو یہ نکلوائیں گی ہی ہمیں۔ ادھر انارکلی نے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ ادھر آپ نے منھ لگا رکھا ہے۔ جو نہ کریں تھوڑا ہے۔

سلیم : (انارکلی کا ذکر ہو اور سلیم دلچسپی نہ لے) افوہ وہ انارکلی بھی تم سے بے تکلف ہیں زعفران؟ ثریا تو کہتی تھی وہ کسی سے بات ہی نہیں کرتی۔

زعفران : تو حضور آدمی دیکھ کر ہی بات ہوتی ہے۔

ستارہ : ہاں ان میں تو بڑے چاند جڑے ہیں۔

زعفران : پھر کیا نہیں بھی؟

سلیم : (مسند پر بیٹھ کر) تو تم سے کیا باتیں کیا کرتی ہیں وہ؟

زعفران : اب کوئی باتیں مقرر تو ہیں نہیں۔ سبھی طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔

سلیم : خوب خوب۔ (کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا بات کر کے اس تذکرے کو جاری رکھے) غرضیکہ بہت محبت ہے تم کو انارکلی سے؟

زعفران : اے مجھی کو کیا۔ کون سا ہے بھلا آدمی محل سرا میں جو انہیں نہ چاہتا ہو۔ (بڑی تمکنت سے سر پھیر کر ستارہ پر ایک نظر ڈالتی ہے)

سلیم : تو ہم نہیں بھلے آدمی زعفران؟ (گویا دیکھو زعفران سامنے سے کیا کہتی ہے)

ستارہ : (زعفران کی پریشانی کو بھانپ کر) گھبرا کیوں گئیں؟

زعفران : اب حضور کے۔ حضور کی تو۔ میں نے تو محل سرا۔ توبہ توبہ۔ اے حضور میں تو اس کل موہی کو جلانے کو کہہ رہی تھی۔

ستارہ : (فاتحانہ انداز میں مسکرا کر) اب کیوں نہ کہو گی یوں؟

سلیم : (لطف لیتے ہوئے) ہم یوں باتوں میں نہیں اڑنے کے۔ اب تو زعفران تمہیں ہم کو بھی بھلے آدمیوں میں شامل کرنا پڑے گا۔

زعفران : اے بھول ہو گئی حضور۔ بخش دیجئے۔

ستارہ : بھول کیوں۔ اب لاؤ نہ جا کر اپنی انارکلی کو۔

سلیم : ہاں ہاں ان کے گانے کی بھی تو بہت تعریف سنی ہے ہم نے۔

زعفران : مجھ سے اچھا تھوڑی ہی گاتی ہے۔

سلیم : لیکن زعفران۔ ہم بھلے آدمی بھی تو بننا چاہتے ہیں۔ کیوں ستارہ؟

ستارہ : حضور اب جان بچانا چاہتی ہے۔

سلیم : ناکام رہو گی زعفران۔

زعفران : میں پھر جا کر بلا بھی لاؤں گی۔

ستارہ : جاؤنا پھر انتظار کاہے کا ہے؟

زعفران : اچھی بات ہے۔(تاؤ میں آ کر چل پڑتی ہے)

سلیم : (متوقع ملاقات کے اندیشوں سے یک لخت سراسیمہ ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے) ٹھہرو ٹھہرو زعفران۔

ستارہ : جانے بھی دیجئے حضور۔ جو اس کے کہے سے کبھی آ جائے۔

زعفران : اور اگر لے آئی تو؟

سلیم : (گھبرا کر) نہیں نہیں زعفران نہیں۔

ستارہ : تو مضائقہ بھی کیا ہے حضور۔ سبھی تو آتے جاتے ہیں یہاں۔

سلیم : تم کو نہیں معلوم اس میں۔ بس نہیں تم جاؤ (ایسے انداز سے دور جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ جس کے صاف یہ معنی ہیں کہ زعفران اور ستارہ رخصت ہو جائیں)۔(دونوں حیران ہو کر ایک دوسرے کو دیکھتی ہیں۔ اور سرگوشیاں کرتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ سلیم تنہا رہ جاتا ہے۔

اللہ پھر یہ سہمی ہوئی محبت کب تک راز رہے گی۔ مجبور دل یوں ہی چپ چاپ دکھا کرے گا۔ یا وہ فرخندہ ساعت بھی آئے گی۔ جس کی امید میں زندگی قیامت ہے۔(آہ بھر کر) کیسے آئے گی۔ وہ کہاں مانیں گے۔ ہائے وہ تو کہہ دیں گے وہ انار کلی ہے۔ حرم سرا کی کنیز۔ تو سلیم ہے۔ مغلیہ ہند کا شہزادہ پھر میں کیسے اپنا سینہ ان کے سامنے کھول کر رکھ دوں گا۔ میرے اللہ میں کیا کروں۔(بے چین ہو کر مسند پر گر پڑتا ہے۔ اور تکیے پر سر رکھ دیتا ہے۔)

(ذرا دیر خاموشی رہتی ہے۔ پھر دور دریا کی طرف سے گانے کی ہلکی ہلکی آواز آتی ہے۔ سلیم کچھ دیر اسی طرح پڑا سنتا رہتا ہے۔ پھر اٹھتا ہے اور سست قدموں سے برج میں جاتا ہے اور دریا کی طرف جھانکتا ہے۔ آخر جھروکے کے ساتھ سر ٹیک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور گیت سننے لگتا ہے۔ آواز مدھم ہوتی ہوتی غائب ہو جاتی ہے)

سلیم : راوی کے دل شاد ملاح! تو کیوں نہ گائے۔ لہریں نیند میں بہہ رہی ہوں اور کشتی اپنے آپ چلی جا رہی ہو۔ پھر بھی نہ گائے؟ تو کیا جانے جب وقت کی ندی بہتے بہتے سست پڑ جاتی ہے اور امید ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟(آہ بھر کر) جا شفق زار لہروں پر گاتا ہوا چلا جا۔ اور خوش ہو کہ تو شہزادہ نہیں ورنہ سنگ مرمر کی چھتوں کے نیچے اور بھاری بھاری پردوں کے اندر تیرے گیت بھی دبی ہوئی آہیں ہوتے۔(سر جھکا کر خاموش ہو جاتا ہے)

(سورج ڈوب چکا ہے۔ باہر شام کا دھندلکا ہے۔ ایوان کے اندر تاریکی دم بدم گہری ہوتی جا رہی ہے)

(چبوترے کے دائیں دروازے سے دو خواجہ سرا داخل ہوتے ہیں۔ ایک نے روشن مشعلیں اور دوسرے نے ایک چوکی اٹھا رکھی ہے۔ اندر

آکر وہ تعظیم بجالاتے ہیں۔ ایک فانوس کے نیچے چوکی رکھ دیتا ہے۔ دوسرا چڑھ کر مشعل سے فانوس روشن کرتا ہے اور پھر چپ چاپ اگلے بائیں دروازے سے رخصت ہو جاتے ہیں۔)

(بختیار چبوترے کے بائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ سلیم کے ساتھ کا کھیلا ہوا اس قدر بے تکلف دوست ہے کہ اسے داخل ہونے کے لیے اجازت حاصل کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ خوش طبع نوجوان ہے جس کی آنکھوں میں خلوص چمکتا ہوا نظر آتا ہے)

بختیار : (سلیم کو برج میں مستغرق دیکھ کر) پھر سوچ میں؟

سلیم : بختیار آ گئے تم؟ (سیڑھیاں اتر کر ایوان میں آجاتا ہے)

بختیار : آپ کس فکر میں غرق ہیں؟

سلیم : میں سوچ رہا ہوں بختیار۔ مطمئن ملاح ایک آرزومند شہزادے کی نسبت کس قدر خوش نصیب ہے۔

بختیار : میں ان ملاحوں کا ادھر سے آنا جانا ہی بند کرا دوں گا۔

سلیم : کیوں؟

بختیار : نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

سلیم : احمق پھانس نکالنے کے بجائے انگلی کاٹنا چاہتا ہے۔

بختیار : پھانس نکالنا بس میں جو نہیں۔

سلیم : (مسند پر بیٹھتے ہوئے) جبھی تو کہتا ہوں۔ آرزوئیں پوری کرنے کی قدرت نہ ہو تو حکومت اور ناداری یکساں ہیں۔

بختیار : تو پھر سودا کر لیجئے۔ ولی عہدی کا بوجھ میں اٹھائے لیتا ہوں۔

سلیم : اور اس کے بدلے مجھے کیا دو گے؟

بختیار : انار کلی۔

سلیم : وہ کیسے؟

بختیار : یہ رہی۔ (جیب میں سے ایک رومال نکالتا ہے اور اسے مسند پر رکھ کر بڑے اہتمام سے کھولتا ہے۔ رومال میں انار کلی کے پھول اور کلیاں ہیں۔ ایک کلی اٹھا کر بہت تکلف سے سلیم کو دیتا ہے۔)

سلیم : تم کتنے خوش فکر ہو بختیار۔

بختیار : قبلہ۔ ڈبیا میں بند کر رکھنے کے قابل ہوں۔

سلیم : (کلی کو دیکھتا رہتا ہے) کتنا حسن، کتنی رعنائی ہے اس کلی میں۔ رنگ، بو اور نزاکت ننھی سی نیند سو رہے ہیں۔ لیکن بختیار انار کلی۔ اس سے ان کا کیا تعلق؟ وہ تو فردوس کا ایک خواب ہے۔ شباب کی آنکھوں کی قوس قزح اور سچ مچ بختیار کبھی کبھی تنہائی میں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ وہ صرف میرا تصور ہے۔ اسے حقیقت سے کوئی تعلق ہیں۔ جیسے میں نے ایک خیال کو اپنے دل کے سنگھاسن پر بٹھالیا ہے اور اسے پوج رہا ہوں۔

بختیار : عرفی کی صحبت آپ کو شاعر بنادے گی۔

سلیم : (کلی کو دیکھتا دیکھتا کسی خیال میں غرق ہو چکا ہے۔ بختیار کی طرف توجہ نہیں رہی) کیا؟

بختیار : (سلیم کو بے توجہ دیکھ کر ذرا بلند آواز سے) مغلوں کو مدبر بادشاہوں کی ضرورت ہے۔ وہ شاعر بادشاہ نہیں چاہتے۔

سلیم : (اسی بے خبری کی کیفیت میں) درست ہے۔

بختیار : قابل عمل تو کیوں ہو گا؟

سلیم : (یک لخت کھڑا ہو کر بختیار کو شانوں سے پکڑ لیتا ہے) اور بختیار اگر میں تمام محل ان ہی انار کلی کے پھولوں اور کلیوں سے سجالوں اور پھر کسی روز انار کلی بھول کر ادھر آجائے۔ آہ وہ دیکھے کہ اسی کے نام کے پھولوں سے میں نے اپنے تمام محل میں اک آگ سی لگا رکھی ہے۔ پھر۔ پھر؟

بختیار : اور اگر انار کلی سے پہلے ظل الٰہی ادھر آجائیں۔ پھر؟

سلیم : (سوچتے ہوئے) پھر کیا ہو؟

بختیار : اکبر اعظم کی نگاہ اپنے فرزند کی نسبت بہت زیادہ دور بین اور معاملہ فہم ہے۔ وہ بہت جلد ہر بات کی تہہ تک پہنچ جاتی ہے۔

سلیم : (سوچ میں بیٹھ جاتا ہے) وہ اس سے کیا نتیجہ نکالیں؟

بختیار : جو نتیجہ آپ نہیں چاہتے کہ وہ نکالیں (سلیم کے سامنے مسند پر بیٹھ جاتا ہے) انار کلی کا خطاب ابھی حرم سرا کی پرانی بات نہیں۔ اور آپ کی یہ تنہائی پسندی اور افسردگی اور پھر ان پھولوں کی رنگ و بو سب سے بڑی جاسوس بن سکتی ہے۔

سلیم : سوختہ اختری۔ نحس تھی وہ ساعت جب تیرہ بختی نے مجھے دومان مغلیہ کا ولی عہد کر دیا۔ اور اس سے زیادہ نحس تھا وہ لمحہ جب انار کلی کی حیران نظروں نے اس دل کو ایک انگارہ بنا دیا۔ (بختیار سلیم کی طرف ہمدردی کی نظروں سے دیکھتا ہے)

(دل آرام چبوترے کے دائیں دروازے سے داخل ہوتی ہے۔ نہ بختیار نے اسے دیکھا ہے نہ سلیم نے۔ جب وہ قریب پہنچ کر تعظیم بجالاتی ہے تو بختیار اسے دیکھ کر انار کے پھولوں کو فوراً مسند کے تکیے کے نیچے چھپا دیتا ہے۔ دل آرام دیکھ لیتی ہے مگر تعظیم بجالا کر خاموش کھڑی ہو جاتی ہے)

سلیم : کیا ہے دل آرام؟

دل آرام : ظل الٰہی حرم سرا سے باہر تشریف لا رہے ہیں۔ انہوں نے اطلاع بھیجی ہے کہ وہ آپ کی طرف بھی آئیں گے۔

سلیم : ادھر آئیں گے؟ وہ خود؟

دل آرام : حضور

سلیم : (بختیار کی طرف متفکر نظروں سے دیکھ کر) کیوں؟ (دل آرام سے) تمہیں معلوم ہے کیوں؟

دل آرام : جی نہیں۔

سلیم : کوئی خاص بات تو نہیں سنی تم نے؟

دل آرام : نہیں۔

سلیم: (کچھ تامل کے بعد) میں استقبال کو حاضر ہوتا ہوں۔ (سلیم سوچ میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دل آرام چلنا چاہتی ہے)

بختیار : (جواب تک دل آرام کو دلچسپی کی میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھتا رہا ہے) کیا نام تھا تمہارا؟ دل آرام نا؟ ہاں (مسکرا کر) کچھ نہیں۔ دل آرام! خوب نام ہے۔ تم جاؤ۔ (دل آرام خاموش چلی جاتی ہے۔ بختیار گردن بڑھا بڑھا کر ادھر دیکھ رہا ہے جہاں دل آرام گئی ہے کہ شاید پردوں میں سے دل آرام ایک مرتبہ ایوان میں جھانکے، یک لخت ایک بارعب انداز سے نوبت پٹنی شہنائیاں بجنی شروع ہو جاتی ہیں۔)

سلیم : وہ حرم سے برآمد ہو گئے۔ ٹھہرو بختیار۔ میں استقبال کو جاتا ہوں۔

(سلیم جاتا ہے۔ بختیار مسند کے تکیے درست کرتا ہے۔ ایک تکیے کے نیچے سے انار کے وہ پھول نکلتے ہیں جو اس نے دل آرام کو دیکھ کر چھپا دیئے تھے۔ انہیں اٹھالیتا ہے اور ادھر ادھر دیکھتا ہے کہ کہاں رکھے مگر قدموں کی آہٹ سن کر پھر تکیے کے نیچے چھپا دیتا ہے۔

سلیم۔ اکبر۔ حکیم ہمام اور چند خواجہ سرا داخل ہوتے ہیں۔ خواجہ سرا دروازے کے قریب رک جاتے ہیں۔ سلیم۔ اکبر اور حکیم ہمام آگے بڑھ آتے ہیں۔ بختیار مجرا بجالاتا ہے۔

اکبر گٹھے ہوئے جسم کا خوش شکل اور میانہ شخص ہے۔ پیشانی اور رخساروں کی شکنیں کو دیکھنے والے کے دل میں خوش اخلاقی اور حلم کا اعتماد پیدا کرتی ہیں لیکن غالباً دنیائے خیال میں رہنے کے باعث خواب ناک آنکھوں میں کچھ ایسی قوت ہے جو قطع نظر اس امر سے کہ وہ شہنشاہ ہند ہے ہر شخص کو محتاط رہنے اور نظریں جھکا لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ گردن کی باوقار حرکت سے ظاہر ہے کہ عالی ہمت شخص ہے۔ مضبوط دہانہ کہہ رہا ہے کہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لا سکتا۔ حرکات میں مستعدی ہے۔ رفتار میں ایک ایسا انداز گویا زمین کو تحقیر کر رہا ہے۔ اس وقت وہ سلیم سے ناخوش نظر آتا ہے لیکن سلیم سے اس کی غیر معمولی الفت اس قدر مسلم ہے کہ محرمان حرم بخوبی جانتے ہیں۔ یہ کبیدگی پدرانہ فہمائش کو موثر بنانے کے لیے سوچ سمجھ کر اختیار کی گئی ہے۔ اور اس غیظ و غضب سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں جو کبھی کبھار اکبر کو بے پناہ بنا دیا کرتا ہے۔)

اکبر: حکیم صاحب کہتے ہیں۔ تم علیل ہو شیخو؟

سلیم : (گومگو کے عالم میں) نہیں تو جہاں پناہ۔

اکبر : (حکیم صاحب پر نظر ڈال کر) کیوں حکیم صاحب؟

حکیم : ظل الٰہی غلام بارگاہ کوئی خاص مرض تو تشخیص نہیں کر سکا۔ البتہ سست اور مضمحل دیکھ کر.....

اکبر : اسے یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہ بیمار ہے۔

حکیم : ظل الٰہی۔ غلام کی ذمہ داری.....

اکبر : تم علیل نہیں۔ تو پھر یہ کیا ہے شیخو کہ ہر ایک تمہاری بے توجہی کا شاکی ہے۔ نہ تمہیں اپنی تعلیم کا خیال ہے نہ ضروری

مشاغل کا۔ سواری کو تم نہیں نکلتے۔ شکار کو تم نہیں جاتے۔ تم دستر خوان تک پر نظر نہیں آتے۔ آخر کیوں؟ تم اپنے باپ کے سامنے حاضر ہونے میں اپنی توہین سمجھتے ہو یا دیکھنا چاہتے ہو کہ اگر تم اس کے پاس نہ جاؤ تو وہ کب تک بے صبر نہیں ہوتا۔ تم نے دیکھ لیا؟ تم خوش ہو اب؟

سلیم : میں شرمندہ ہوں۔

اکبر : نہیں شاید تم یہ بھی دیکھنا چاہتے ہو کہ مامتا کب تمہاری ماں کو حرم کی چار دیواری سے باہر کھینچ کر لاتی ہے۔ کیوں شیخو؟ ماں کے بلانے پر ہر مرتبہ عذر کر بھیجنا پھر اور کیا معنی رکھتا ہے؟

سلیم : میں ابھی ان کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔

اکبر : تم کو اگر ماں باپ کی پروا نہیں تو وہ بھی تم سے بے پروا ہو سکتے ہیں۔

سلیم : میں معافی چاہتا ہوں۔

اکبر : میں جانتا ہوں۔ یہ معافی اکبر بادشاہ سے ہے۔ اکبر باپ سے نہیں۔ بادشاہ تمہیں معاف کرتا ہے۔ باپ اظہار افسوس سے زیادہ چاہتا ہے۔

(سلیم کے آنسو نکل آتے ہیں)

آنسو! بادشاہ بھی تمہیں معاف نہیں کر سکتا۔ معاف نہیں کر سکتا سلیم۔ وہ مغل شہزادوں کو سیاست کی الجھنوں میں مجنون دیکھ سکتا ہے۔ وہ انہیں ہوس ملک گیری میں گرفتار دیکھ سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے۔ ان کے زخموں سے کیا کرے۔ وہ جانتا ہے ان کی سر بریدہ نعشوں کو کیا کرے۔ مگر آنسو..... آنسو..... جا اپنی ماں کے پاس جا۔ ان آنسوؤں کو تو اس کے ہاتھ بیچ سکتا ہے.... جاؤ سلیم!

(سلیم سر جھکائے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا حرم کی طرف جاتا ہے۔ اکبر کھڑا دیکھتا رہتا ہے) بے وقوف لڑکا.... چلیے حکیم صاحب (چلتے چلتے ٹھہر کر) بختیار تم شیخو کے آنے تک یہیں ٹھہرو۔ تنہائی میں وہ پھر آنسو بہائے گا..... احمق..... چلیے حکیم صاحب (چلتے چلتے پھر ٹھہر کر) یا تم بھی ہمارے ساتھ آؤ بختیار ہم ایک اور طرح اس کی اشک شوئی کرنا چاہتے ہیں۔ سب بائیں دروازے سے بیرونی حصے کو چلے جاتے ہیں)

جب ایوان خالی ہو چکتا ہے تو حرم کے دروازے کے پردے ہلتے ہیں اور دل آرام سر نکال کر جھانکتی ہے۔ جب اطمینان ہو جاتا ہے کہ کوئی موجود نہیں تو دبے پاؤں ادھر ادھر دیکھتی ہوئی اندر آجاتی ہے۔ ہر طرف دیکھ کر اطمینان کرتی ہے کہ کوئی واپس نہ آرہا ہو۔ پھر مسند کی طرف بڑھتی ہے اور تکیے اٹھا اٹھا کر دیکھتی ہے۔ ایک تکیے کے نیچے سے اسے انار کے پھولوں کا رومال مل جاتا ہے۔

(دل آرام ادھر ادھر دیکھ کر رومال کھول لیتی ہے)

دل آرام : پھول!..... پھر چھپائے کیوں انار کے پھول!..... کیا تھا؟

(پھول ہاتھ میں لیے وہ سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ قدموں کی آہٹ سن کر یک لخت چونکتی ہے اور بیرونی دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ گھبرا کر واپس آتی ہے اور پھول تکیے کے نیچے رکھ کر حرم کے دروازے کی طرف بھاگتی ہے۔ ادھر سے بھی گھبرا کر واپس آتی ہے۔ پریشانی کے عالم میں کھڑی ہو جاتی ہے اور چھپنے کے لیے جگہ دیکھتی ہے۔ آخر دوڑ کر دائیں ہاتھ کے در لے دروازے کے پردے کے پیچھے چھپ جاتی ہے)

(بختیار داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک جڑاؤ انگشتری ہے)

بختیار : بادل گرج چکتا ہے تو میٹھا پانی پرستا ہے۔ کتنا بڑا ہیرا۔ کس قدر عمدہ تراش۔

(سلیم سوچ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا داخل ہوتا ہے)

سلیم کیا سوچ رہے ہو تم؟ یقیناً ظل الٰہی کی فہمائش سے تم آزردہ نہیں ہوئے؟ آزردہ نہیں نا؟ وہ تمہارے باپ ہیں۔ اور وہ باپ جو تمہارے لیے متحد ہندوستان کی سلطنت تیار کر رہے ہیں۔ اور اگر اس کے لیے وہ تمہیں ایک خاص رنگ میں دیکھنے کی توقع رکھیں تو قابل الزام نہیں۔ نہیں نہ سلیم؟ اور کیا قصور تمہارا نہ تھا؟ پھر بھی ان کی الفت دیکھو۔ انہوں نے تمہارے لیے یہ تحفہ بھیجا ہے۔ دربار میں جو فرنگی جوہری آئے ہیں انہوں نے اپنے ملک کے ڈھنگ پر اس انگشتری کا نگینہ تراشا ہے۔ دیکھو تو کتنا بڑا کس قدر خوبصورت۔ لاؤ میں تمہیں پہنا دوں۔ (ہاتھ پکڑ کر انگشتری پہنا دیتا ہے) تم تو ویسے ہی خاموش ہو!

سلیم : میں کچھ اور سوچ رہا ہوں بختیار۔

بختیار : کیا؟

سلیم : واپس آ رہا تھا تو مجھے راستے میں ثریا ملی۔

بختیار : پھر؟

سلیم : اس نے کہا۔ انار کلی آج کل چاندنی راتوں میں باغ میں جاتی ہے۔

بختیار : تو؟

سلیم : میں آج باغ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ (مسند پر بیٹھ جاتا ہے)

بختیار : محبت نے تم کو بالکل دیوانہ بنا دیا ہے سلیم۔ باپ کی اتنی خفگی اور اتنی ذرا سی دیر میں پھر اتنی بڑی جرأت۔

سلیم : ہاں لیکن چاندنی راتیں پھر نہ رہیں گی۔

بختیار : (سلیم کے سامنے مسند پر بیٹھ کر) تم کیوں انار کلی سے ملنا چاہتے ہو سلیم؟ اگر تمہیں معلوم ہو گیا وہ بھی تمہیں چاہتی ہے تو تمہارے لیے وقت کاٹنا قیامت نہ ہو جائے گا؟

سلیم: اور اب یہ معلوم ہو کر کہ تنہائی میں اس سے مل لینے کا موقع بھی ہے۔ میں اگر نہ ملا تو جینا عذاب نہ ہو جائے گا؟

(دونوں اپنے اپنے فکر میں سر جھکا لیتے ہیں) (دل آرام پردے میں سے جھانکتی ہے اور دونوں کو غافل دیکھ کر دبے پاؤں باہر نکل جاتی ہے۔ جب وہ گذر چکی ہے تو)

بختیار: (چونک کر) کون؟

سلیم: (ادھر ادھر دیکھ کر) کوئی نہیں۔

بختیار: (جس دروازے سے دل آرام باہر نکلی ہے اس کی طرف اشارہ کر کے) دیکھو۔ پردہ ہل رہا ہے۔

سلیم: ہوا ہے۔

بختیار: نہیں کوئی باہر گیا ہے۔

(دونوں بھاگ کر دروازے کی طرف جاتے ہیں اور دائیں بائیں دیکھتے ہیں۔ کوئی نظر نہیں آتا)

7.2.5 خلاصہ:

اردو ڈرامے کی تاریخ کا سب سے اہم ڈراما امتیاز علی تاج کا ڈراما انار کلی ہے۔ تاج نے یہ ڈراما 1922ء میں تصنیف کیا تھا لیکن اس کی اشاعت دس سال بعد یعنی 1932ء میں ہوئی۔ اس کا موضوع مغلیہ سلطنت کی شان و شوکت اور وہ داستان محبت ہے جس کا تعلق مغل ولی عہد شہزادہ سلیم اور حرم سرا کی کنیز انار کلی سے ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے اس الم ناک داستان محبت کی اصلیت و حقیقت ہنوز بحث کا موضوع ہے لیکن امتیاز علی تاج کا مقصد تاریخ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ خود انہیں کے الفاظ میں:

> "میرے ڈرامے کا تعلق محض روایت سے ہے۔ بچپن سے انار کلی کی فرضی کہانی سنتے رہنے سے حسن و عشق اور ناکامی و نامرادی کا جو ڈراما میرے تخیل نے مغلیہ حرم کی شوکت و تجمل میں دیکھا اس کا اظہار ہے۔"

(دیباچہ "انار کلی" صفحہ:24)

امتیاز علی تاج نے اس ڈرامے کا انتساب مشہور افسانہ نگار حجاب اسماعیل کے نام کیا ہے جن سے بعد میں امتیاز علی تاج کی شادی ہوئی اور وہ حجاب امتیاز علی کہلائیں۔ ڈراما انار کلی ایک طویل ڈراما ہے۔ امتیاز علی تاج نے اسے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب یا ایکٹ کا عنوان عشق دوسرے باب کا عنوان رقص اور تیسرے باب کا عنوان موت ہے۔ پہلے باب بعنوان عشق میں چار مناظر ہیں۔ دوسرے باب بعنوان رقص میں چار مناظر ہیں۔ تیسرے اور آخری باب بعنوان موت میں پانچ مناظر ہیں۔ اس طرح کل تیرہ مناظر ہیں۔ جن میں سلیم کے ایوان کے چار مناظر، زندان کے دو مناظر اس کے علاوہ بارہ دری، غلام گردش، انار کلی کا حجرہ، قلعۂ لاہور کا ایک ایوان، شیش محل اور اکبر کی خواب گاہ کا ایک ایک منظر ڈرامے میں پیش کیا گیا ہے۔

مذکورہ اقتباس ڈرامہ انار کلی کے باب اول کے منظر دوم سے لیا گیا ہے۔ جہاں شہنشاہِ ہندوستان اکبر اعظم کا لاہور قلعہ اپنی مغلیہ شان و شوکت کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اکبر اعظم کو شہزادہ سلیم سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ وہ شہزادے کو ایک عظیم سلطنت کا شہنشاہ دیکھنا چاہتا ہے۔ قلعہ میں حرم سرا کی چار دیواری سے تھوڑی دور پر شہزادہ سلیم کے محل کا شمال مغربی ایوان واقع ہے۔ بیرونی مناظر کی سرسبزی و شادابی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایوان کے آگے جھروکے دار کھڑکیاں بنائی گئی ہیں۔ جہاں سے خطہ ارض پر ہر طرف بکھرا قدرتی حسن کا نظارہ قابل دید ہے۔ گویا یہ مقام کسی بھی مغل شہزادے کو فرصت کے اوقات بسر کرنے اور خوبصورت مناظر سے لطف اٹھانے کے لیے بہترین مقام ہے۔ تاج نے قدرتی مناظر کی عکاسی میں اپنے تخیل اور تصور کی مدد سے تاریخی و رومانوی ماحول کو بہترین طریقے سے پیش کر کے اس میں اور رنگ بھر دیا ہے۔ شاہی محل کی شان و شوکت، دریائے راوی اور باغات کی خوبصورتی، محل سرا کی بناوٹ، سنگ مرمر کے چبوترے، سیڑھیاں، محل کی دیواروں کے نقش و نگار، جھروکے دار کھڑکیوں پر جالی دار ڈیزائنیں، دروازوں پر اطلسی پردے، ہشت پہلو میزیں اور ان پر جڑاؤ پھولدان کا ذکر تفصیل سے کیا ہے جو اس دور کے ماحول اور ثقافت کے ساتھ ساتھ مغلیہ حکومت کی شان و شوکت و طرز

زندگی کو بھی بیان کر رہے ہیں۔ مذکورہ اقتباس میں مغل دور کے محلات، مسجد کے سفید گنبد اور سرخ میناروں کی منظر کشی خاصی جامع اور متاثر کن ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ امتیاز علی تاج نے اس ڈرامے میں نہ صرف پلاٹ اور کردار نگاری پر توجہ دی ہے بلکہ منظر نگاری کے ذریعے بھی کہانی کو خوبصورت اور جاندار بنانے کی کوشش کی ہے۔

ہندوستان کا ہونے والا شہنشاہ برج کے جھروکے میں دریائے راوی پر ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف نظر جمائے کسی کے خیال میں بیٹھا ہے۔ ایوان کے اندر دو کنیزیں زعفران اور ستارہ ڈھول بجا بجا کر ناچ رہی ہیں مگر سلیم کو ان کے ناچ گانے میں بالکل بھی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ بات ان کو بھی پتہ ہے کہ سلیم ان کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔ تو وہ بھی رخصت ہونا چاہتی ہیں۔ اسی خیال سے زعفران سلیم کی طرف بڑھتی ہے، پاؤں ٹیڑھا پڑ جاتا ہے اور گر پڑتی ہے۔ ستارہ کی ہنسی چھوٹ جاتی ہے۔ سلیم چونک کر اس کی طرف دیکھتا ہے اور اندر آ کر خیریت دریافت کرتا ہے۔ ستارہ اسے بتاتی ہے کہ وہ رخصت کی اجازت لینے جا رہی تھی اور ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ زعفران، ستارہ اور سلیم کے درمیان گفتگو شروع ہوتی ہے۔ سلیم زعفران کی شوخی دیکھ کر اس کی تعریف کرتا ہے۔ جس سے زعفران کے اندر کی شوخی اور ظاہر ہونے لگتی ہے۔ سلیم کے منھ سے زعفران کی تعریف سن کر ستارہ کے منھ سے نکل جاتا ہے کہ 'ادھر انار کلی نے سر پر چڑھا رکھا ہے اِدھر آپ نے منھ لگا رکھا ہے'۔ سلیم انار کلی کا نام سن کر گفتگو میں اور دلچسپی لینے لگتا ہے اور اسے سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ انار کلی کے تذکرے کو جاری رکھنے کے لیے کیا باتیں کریں۔ اس کا حال نو عمر دیوانوں جیسا ہے۔ وہ اپنا حال دل ظاہر بھی کرنا چاہتا ہے مگر راز فاش ہونے سے ڈرتا بھی ہے کیوں کہ انار کلی ایک کنیز ہے جب کہ وہ بادشاہ اکبر کا بیٹا اور ہندوستان کا متوقع شہنشاہ ہے۔ (انار کلی مغل بادشاہ اکبر کی کنیز ہے جس کی عمر ۱۵۔۱۶ سال اور نام نادرہ بیگم ہے۔ انار کلی دوسری کنیزوں کی بہ نسبت اتنی خوبصورت تو نہ تھی مگر اس کے حسن میں عجیب کشش تھی۔ دل آرام جو اکبر اعظم کی منظور نظر کنیز تھی جس کی غیر موجودگی میں انار کلی دربار میں رقص پیش کرتی ہے اور مغل شہنشاہ سے انار کلی کا خطاب پاتی ہے۔ شہزادہ سلیم انار کلی میں دلچسپی لینے لگتا ہے اور اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ انار کلی بھی سلیم میں دلچسپی لینے لگتی ہے لیکن اپنے جذبوں کا اظہار نہیں چاہتی ہے کیوں کہ وہ کنیزوں کی تقدیر کے بارے میں خوب جانتی ہے، وہ جانتی ہے کہ کنیزوں کی تقدیر میں شہزادوں کی صحبت تو ہوتی ہے مگر ہمراہی نہیں۔ دل آرام جب واپس آتی ہے تو انار کلی اکبر اعظم کے دل اور دربار میں اپنا مقام پختہ کر چکی ہوتی ہے۔ دل آرام زخمی ناگن کی طرح بے قرار رہنے لگتی ہے۔ اور انار کلی کو راستے سے ہٹانے کے لیے سازشیں کرنا شروع کر دیتی ہے)۔

سلیم، ستارہ اور زعفران کی گفتگو دلچسپ ہوتی جاتی ہے۔ سلیم انار کلی سے ملنے کے لیے بیتاب ہے۔ زعفران اس کام کے لیے راضی بھی ہو جاتی ہے مگر سلیم اسے منع کر دیتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ لوگ اس کے بارے میں کہیں کہ ولی عہد شہزادہ سلیم مغلیہ حرم کی ایک کنیز کے دام محبت میں گرفتار ہے۔ وہ دونوں کو رخصت کر دیتا ہے۔ اس کے دل میں طرح طرح کے خیال جنم لے رہے ہیں۔ وہ بے چین طبیعت لیے مسند پر گر پڑتا ہے۔ دریا کی طرف سے آنے والی گانے کی ہلکی ہلکی آواز کو سنتا رہتا ہے۔ سورج ڈوب چکا ہے محل کے اندر تاریکی گہری ہو چکی ہے۔ اسی اثنا میں اس کے بچپن کا دوست بختیار چبوترے کے بائیں دروازے سے حرم میں داخل ہوتا ہے۔ بختیار سلیم سے اس قدر بے تکلف ہے کہ اسے اجازت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بختیار ایک خوش طبع نوجوان ہے جس کی آنکھوں میں خلوص اور وفاداری جھلک رہی ہے۔ بختیار سلیم کو برج میں غرق دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ دونوں میں گفتگو شروع ہوتی ہے۔ انار کلی کا ذکر آتے ہی سلیم انار کلی کے ہجر

میں بے قرار ہو جاتا ہے تو بختیار اسے انار کے پھول اور کلیاں تحفہ میں پیش کر کے اس کا دل بہلاتا ہے۔ وہ ایک پر خلوص دوست ہے۔ اسی اثنا میں دل آرام چبوترے کے دائیں دروازے سے داخل ہوتی ہے۔ بختیار دل آرام کو دیکھ کر انار کے پھول اور کلیوں کو تکیے کے نیچے چھپا دیتا ہے۔ دل آرام تعظیم بجالانے کے بعد بادشاہ اکبر کے آنے کی اطلاع دیتی ہے۔ سلیم ظل الٰہی کے استقبال میں چلا جاتا ہے۔ شہنشاہ اکبر ڈراما انار کلی کا مرکزی کردار ہے۔ مصنف نے اسے ایک شفیق باپ، ایک مدبر سیاست دان اور ایک پر وقار شہنشاہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سلیم اپنے باپ اکبر، حکیم اور چند خواجہ سرا کے ساتھ ایوان میں داخل ہوتے ہیں۔ بختیار تعظیم میں مجرا بجالاتا ہے۔ بادشاہ اکبر کو سلیم کچھ پریشان نظر آتا ہے تو وہ اس کی صحت کے لیے حکیم سے مشورہ طلب کرتا ہے۔ باپ کی حیثیت سے وہ اپنے بیٹے کی تربیت کی ذمہ داری کا احساس رکھتا ہے چنانچہ وہ معمولات مشاغل سے بے پروائی اور تعلیم کی طرف سے بے توجہی پر سلیم کو تنبیہ بھی کرتا ہے۔ سلیم کے آنسو دیکھ کر وہ پسیجتا نہیں ہے بلکہ وہ سلیم کو اس کی ماں کے پاس بھیج کر حکیم کے ساتھ اس کی فکر کرتے ہوئے بختیار کو لے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ بختیار کے ہاتھوں وہ سلیم کو ایک بیش قیمت انگوٹھی تحفہ میں دے کر اس سے والہانہ محبت کا اظہار بھی کرتا ہے۔ وہ ایک مفکر اور مدبر سیاست دان ہے اور مغلیہ سلطنت کو مضبوط و مستحکم بنانے کے منصوبوں پر غور و فکر کرتا رہتا ہے۔ دل آرام حرم سرا کے تمام افراد کے مزاج اور کردار سے باخبر ہے اور ہر ایک کی نقل و حرکت پر نظر رکھتی ہے اور کمزوریوں سے واقف ہے۔ وہ حرم سرا کی ایک کنیز ہے لیکن اپنی حیثیت سے بڑھ کر سوچتی ہے اس کے دل میں ہندوستان کی ملکہ بننے کی خواہش موجود ہے۔ وہ مستقل مزاج اور مضبوط اعصاب کی عورت ہے۔ جب بختیار بادشاہ اکبر کے ساتھ چلا جاتا ہے تو وہ اس تنہائی کا فائدہ اٹھا کر سلیم کے ایوان کی چھان بین کرنے لگتی ہے۔ ایک تکیے کے نیچے سے اسے انار کے پھولوں کا رومال مل جاتا ہے ادھر ادھر دیکھ کر رومال کھول لیتی ہے۔ دل آرام انار کے پھول دیکھ کر چونکتی ہے اور سوچ میں پڑ جاتی ہے۔ تبھی کچھ آہٹ ہوتی ہے اور وہ پردے کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔ بختیار اکبر کی دی ہوئی انگوٹھی لیے ہوئے حرم میں داخل ہوتا ہے اور اس کے پیچھے سلیم بھی داخل ہوتا ہے۔ بختیار سلیم کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اس سے پوچھتا ہے کہ کیا سوچ رہے ہو۔ بختیار خوش طبع ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین، عقل مند اور دوراندیش بھی ہے۔ وہ تصورات اور تخیلات کی دنیا میں کھویا ہوا نہیں بلکہ ایک عملی آدمی ہے۔ وہ شہنشاہ اکبر اور شہزادہ سلیم دونوں کا مزاج شناس ہے۔ وہ سلیم کو سلطنت کے استحکام کے لیے شہنشاہ اکبر کے منصوبوں سے باخبر کرتا ہے۔ اور انگوٹھی دیتے ہوئے ظل الٰہی کی محبت کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ مگر جب سلیم کہتا ہے میں کچھ اور سوچ رہا ہوں بختیار! سلیم بختیار کو بتاتا ہے انار کلی چاندنی راتوں میں باغ میں جاتی ہے اور وہ اس سے ملاقات کی خواہش رکھتا ہے تو بختیار اسے سمجھاتا ہے۔ بختیار شہنشاہ اکبر کے مزاج سے واقف ہے اس لیے وہ سلیم کو انار کلی کی محبت سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نشیب و فراز سمجھاتا ہے۔ بختیار اس محبت کا انجام جانتا ہے اسی لیے اسے سمجھاتا ہے اور اندیشوں سے باخبر کرتا ہے لیکن سلیم دل سے مجبور ہے وہ کوئی پرواہ نہیں کرتا اور باغ میں انار کلی سے ملاقات کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ بختیار جب دیکھتا ہے کہ سلیم اس کی بات سننے کو تیار نہیں تو وہ سر خم کر دیتا ہے۔ دونوں جب اپنی اپنی فکر میں سر جھکا لیتے ہیں تو دل آرام دبے پاؤں باہر نکل جاتی ہے۔ دونوں چونک کر دیکھتے ہیں مگر کوئی نظر نہیں آتا۔

اردو ڈرامے کی تاریخ میں امتیاز علی تاج کا ڈراما انار کلی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے تخیل کی رنگا رنگی، جذبات کی سرمستی، فکر کی توانائی اور اسلوب بیان کی لطافت و نزاکت اس ڈرامے کی اہم خصوصیات ہیں۔ انار کلی ڈراما اگر زندگی کے دو مختلف نظریات کے مابین کشمکش کا

شناس نامہ ہے تو مختلف و متضاد رویوں اور جذبوں کا فنکارانہ اظہار یہ بھی۔

7.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- ڈراما انتہائی قدیم صنف ادب ہے۔
- مختلف ادوار اور مختلف شکلوں سے گزر کر ڈراما اردو زبان کے نثری اور شعری ادب کا حصہ بن چکا ہے۔ نثری اور منظوم ڈرامے اردو میں بھی لکھے جاتے رہے ہیں۔
- اردو ڈراموں کی روایت کا سنگ میل امتیاز علی تاج کا ڈراما انار کلی ہے۔ امتیاز علی تاج 1900ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔
- تھیٹر اور اداکاری سے امتیاز کو شروع سے ہی دلچسپی تھی اور اسی دلچسپی نے آگے چل کر انہیں کہانی کار اور مزاح نگار کے ساتھ ڈراما نگار بھی بنا دیا۔
- انار کلی ان کا شاہکار ڈراما ہے جس کا سنہ تصنیف 1922ء ہے لیکن یہ پہلی بار 1932ء میں شائع ہوا۔ انار کلی کا واقعہ تاریخ کا کم روایت کا حصہ زیادہ ہے اور صدیوں سے چلی آ رہی اسی روایتی داستان کو بنیاد بنا کر امتیاز علی تاج نے یہ ڈراما لکھا۔
- اس ڈرامے کا پلاٹ ایک اچھے پلاٹ کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے۔ واقعات کا آغاز ہوتا ہے اور وہ منطقی ترتیب کے ساتھ وسط سے گذر کر انجام تک پہنچتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انار کلی کا پلاٹ المیہ کی شرائط بھی پوری کرتا ہے۔
- کردار نگاری کے تعلق سے یہ ڈراما انتہائی فطری نہج پر آگے بڑھتا ہے۔ سبھی کردار اپنے پس منظر کے عین مطابق سامنے آتے ہیں۔
- مکالمے بھی کرداروں کی فطرت اور مزاج کے آئینہ دار ہیں۔ ڈراما انار کلی میں تصادم و کشمکش کی داخلی اور خارجی دونوں صورتیں پائی جاتی ہیں۔
- ڈرامے میں نقطۂ عروج اس وقت آتا ہے جب انار کلی اکبر اعظم کے حکم سے قید کر لی جاتی ہے۔ اس ڈرامے کا انجام بھی انتہائی المناک لیکن آغاز سے نقطۂ عروج تک پیش آئے واقعات کا فطری نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔
- ڈراما انار کلی اسٹیج پر پیش نہیں کیا جا سکا۔ اور اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ اس کے مناظر کا جو عالی شان ایوانوں، سرسبز باغوں اور شیش محل وغیرہ کو پیش کرتے ہیں عملاً اسٹیج پر دکھانا ممکن نہیں تھا۔ علامتی اسٹیج پر یہ ڈراما دکھایا جا سکتا تھا مگر مغلوں کی شوکت و تجمل کا جو تصور ان مناظر سے پیدا ہوتا ہے وہ علامتی اسٹیج سے ممکن نہیں۔ بہر حال یہ اردو کے ادبی ڈراموں میں نمائندہ ڈراما ہے۔

7.4 مشکل الفاظ

راست	سیدھا
Straight, Honest	

جبلت	فطرت	Instinct
محاسن	خوبیاں	Virtues, Merits
معائب	خامیاں	Faults, Defects
ہمہ جہت	ہر طرف	Multi-dimensional, Versatile
ہنوز	ابھی تک	Still, Yet
تجمل	عظمت، وقار	Splendor, Elegance
حرکیاتی	حرکت کرنے والا، فعال	Kinetic, Dynamic
زیرک	دانا، عقلمند	Intelligent, Clever
مفرح	فرحت بخشنے والا	Refreshing, Pleasant
دروغ	جھوٹ	Lie, Falsehood
ایوان	محل	Mansion, Hall
دل کشا	دل خوش کرنے والا	Delightful, Charming
ارغوانی	نارنجی	Crimson, Reddish-purple
تزئین	سجاوٹ	Decoration, Ornamentation
فرخندہ	مبارک، خوشگوار	Auspicious, Blessed
مہجور	فراق زدہ، جدائی کا مارا	Abandoned, Forsaken
دودمان	قبیلہ، خاندان	Dynasty, Lineage
کبیدگی	رنجیدگی، آزردگی	Sadness, Grief
فہمائش	ہدایت، نصیحت	Instruction, Guidance
سربریدہ نعش	سر کٹی لاش	Beheaded corpse
اشک شوئی	آنسو پوچھنا	Consolation, Wiping of tears
منطقی	عقلی، منطق کے اعتبار سے	Logical, Rational
اندوہ	رنج	Sorrow, Grief

حشمت	عظمت	Grandeur, Dignity
نشاطیہ	خوشی کی حامل	Joyful, Cheerful
مشاہرین	نامور لوگ	Celebrities, Eminent persons
مابین	درمیان	Between, Among
مربوط	جڑا ہوا	Connected, Coherent
ندرت	نیاپن	Rarity, Novelty
تذبذب	ہچکچاہٹ، شش و پنج	Hesitation, Uncertainty
عشوہ	غمزہ، نخرہ، ادا	Coquetry, Allurement
وارستہ	لاپرواہ	Detached, Free
تردد	اندیشہ، فکر	Trouble, Anxiety, Effort
خوابیدگی	خواب کی سی کیفیت، نیند	Sleepiness, Drowsiness
فطین	ذہین، دانا	Wise, Intelligent
ریشۂ دوانی	شرارت، فساد	Conspiracy, Intrigue
زندان	قید خانہ	Prison
ناظرین	دیکھنے والے	Viewers, Spectators
نہج	طور، طریقہ	Method, Approach

7.5 مشقیں

مشق 1: نیچے دیے گئے لفظوں سے خالی جگہوں کو پُر کیجیے۔

ہلکی ہلکی، قدم، کہانیاں، حجاب اسماعیل

i. ذرا دیر خاموشی رہتی ہے۔ پھر دور دریا کی طرف سے گانے کی..... آواز آتی ہے۔

ii. امتیاز علی تاج نے اس ڈرامے کا انتساب مشہور افسانہ نگار..... کے نام کیا ہے۔

iii. سلیم سر جھکائے آہستہ آہستہ..... اٹھاتا ہوا حرم کی طرف جاتا ہے۔

iv. ڈراموں کے علاوہ تاج نے بچوں کے لیے..... بھی کثرت سے لکھیں۔

7.6 نمونۂ امتحانی سوالات

7.6.1 معروضی سوالات:

1۔ امتیاز علی تاج کہاں پیدا ہوئے؟

(a) لاہور (b) آگرہ (c) دہلی (d) کراچی

2۔ امتیاز علی تاج کے والد کو انگریزی سرکار نے کس خطاب سے سرفراز کیا؟

(a) خان بہادر (b) شمس العلما (c) ادیب (d) میر منشی

3۔ امتیاز علی تاج نے کس نام سے رسالہ جاری کیا؟

(a) امنگ (b) نیادور (c) ادیب (d) کہکشاں

4۔ دلہن کس کا ڈراما ہے؟

(a) امانت (b) واجد علی شاہ (c) امتیاز علی تاج (d) حبیب تنویر

5۔ نادرہ بیگم کو اکبر نے کس خطاب سے سرفراز کیا؟

(a) گلاب کلی (b) انارکلی (c) نورکلی (d) بے نظیر

6۔ دل آرام کیا بننا چاہتی ہے؟

(a) ملکہ ہندوستان (b) ملکہ برطانیا (c) ایران کی شہزادی (d) خادمہ

7۔ انارکلی کو کیا سزا دی جاتی ہے؟

(a) زندہ دفن (b) دیوار میں چنوا دینا (c) قتل کر دینا (d) جیل کی

8۔ انارکلی کا سنہ تصنیف کیا ہے؟

(a) 1932 (b) 1912 (c) 1930 (d) 1922

9۔ زعفران اور ستارہ کون ہیں؟

(a) کنیز (b) شہزادی (c) ملکہ (d) اکبر کی بیویاں

10۔ سلیم کے دوست کا کیا نام ہے؟

(a) اختیار (b) بختیار (c) امتیاز (d) ممتاز

7.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. ڈراما انارکلی کرداروں کا تعارف کروایئے۔
2. انارکلی کے دو اہم کرداروں کے بارے میں لکھیے۔

3. اکبر کون تھا؟ بیان کیجیے۔
4. انار کلی کون تھی؟ اور اس کو کیا سزا دی جاتی ہے۔ چند جملوں میں لکھیے۔
5. امتیاز علی تاج کے مطابق ڈراما انار کلی کا تعلق کس سے ہے؟

7.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. امتیاز علی تاج کی حیات کے بارے میں تفصیل سے لکھیے۔
2. ڈراما انار کلی کا تفصیلی تعارف پیش کیجئے۔
3. انار کلی کا قصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

7.6.1 کے جوابات:

B	(v)	C	(iv)	D	(iii)	B	(ii)	A	(i)
B	(x)	A	(ix)	D	(viii)	B	(vii)	A	(vi)

اکائی 8: ڈراما

(آگرہ بازار: حبیب تنویر)

اکائی کے اجزا

8.0		تمہید
8.1		مقاصد
8.2		ڈراما: (آگرہ بازار) حبیب تنویر
	8.2.1	حبیب تنویر کا تعارف
	8.2.2	ڈراما: "آگرہ بازار" متن (اقتباس)
	8.2.3	خلاصہ
8.3		اکتسابی نتائج
8.4		مشکل الفاظ
8.5		مشقیں
8.6		نمونۂ امتحانی سوالات

8.0 تمہید

ڈراما ادب کی ایک اہم اور قدیم ترین صنف ہے۔ ہندوستان اور یونان دنیا کے وہ دو ملک ہیں جہاں ڈرامے سب سے پہلے لکھے گئے۔ بھرت منی ہندوستان میں اور ارسطو یونان میں ڈرامے کے اولین ناقد کہلائے۔ لفظی اعتبار سے ڈراما کی اصل یونانی ہے۔ یونانی زبان میں اس کے معنی 'کر کے دکھانا' ہے۔ گویا یونانیوں کے نزدیک ڈرامے کا اصل مطلب یہ ہے کہ جو کچھ تحریر کیا جائے اسے کر کے دکھایا جائے۔ ڈراما نقل ہے اور نقل کرنا انسانی فطرت میں ازل سے شامل ہے۔

صنف ادب کی حیثیت سے ڈراما ایسی کہانی یا قصہ ہے جو اداکاری کے لیے لکھا جائے یا اداکاری کے ذریعے پیش کیا جائے۔ ڈرامے کا تعلق محض الفاظ سے نہیں بلکہ عمل سے ہے۔ اس لیے ارسطو نے ڈرامے کو عمل کی نقل کہا ہے۔ یعنی کسی قصہ یا واقعہ کو اداکاروں کے ذریعہ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا نام ڈراما ہے۔ اردو کے اولین ڈرامے لکھنؤ میں لکھے اور کھیلے گئے، بظاہر یہ ڈرامے فن کی کسوٹی پر کھرے نہیں اترتے، اس لیے بعض نقادوں نے اسے ڈراما تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی چیز وجود میں آتی ہے تو وہ ہر لحاظ

سے مکمل نہیں ہوتی، بلکہ اس میں بہت ساری کمیاں ہوتی ہیں، یہی حال ان ڈراموں کا ہے۔

واجد علی شاہ کے رہس اور امانت کے اندر سبھا کا شمار اردو کے اولین ڈراموں میں ہوتا ہے۔ اردو ڈرامے کو نئی اونچائی عطا کرنے میں امتیاز علی تاج اور سید عابد حسین کے بعد اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر محمد مجیب اور حبیب تنویر کے نام سر فہرست ہیں۔ حبیب تنویر کا شمار بہترین ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا ڈراما آگرہ بازار ترقی پسند تحریک کے زیر اثر تحریر کیا گیا ہے۔

اس اکائی میں آپ حبیب تنویر کے ڈرامے "آگرہ بازار" کا مطالعہ کریں گے۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ڈراما نگار حبیب تنویر کے بارے میں جان سکیں۔
- ڈراما "آگرہ بازار" کے متن کو سمجھ کے پڑھ سکیں۔
- ڈراما "آگرہ بازار" خلاصہ پیش کر سکیں۔
- ڈراما "آگرہ بازار" کے پڑھنے سے اس دور کے سیاسی و سماجی حالات کو سمجھ سکیں۔

8.2 ڈراما: "آگرہ بازار" حبیب تنویر (اقتباس)

8.2.1 حبیب تنویر کا تعارف:

اسٹیج کی دنیا کے بادشاہ، نامور ڈرامہ نگار، ہدایت کار، اسکرین رائٹر، گیت نگار اور شاعر حبیب تنویر یکم ستمبر 1923 کو رائے پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام محبیب احمد خان تھا مگر حبیب تنویر کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد حافظ محمد حیات خان علم دوست انسان تھے۔ ان کا تعلق رائے پور کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔ حبیب تنویر کی ابتدائی تعلیم معمول کے مطابق گھر اور مدرسے میں ہوئی۔ 1940 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد آگے کی تعلیم کے لیے ناگپور کے مورس کالج میں داخلہ لیا۔ جہاں سے انہوں نے 1944 میں گریجویشن کیا۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں ایم۔اے (اردو) میں داخلہ لیا مگر جلد ہی وہ ممبئی چلے گئے۔ ممبئی میں ان کی صلاحیتوں کو اور نکھرنے کا موقع ملا۔ جہاں انہیں کئی فلموں میں کام کرنے کے مواقع دستیاب ہوئے۔ احمد شاہ بخاری پطرس کی کوششوں سے آل انڈیا ریڈیو میں نوکری ملی۔ وہ بچوں اور خواتین کے پروگرام سے لے کر ڈرامے، فیچرز، فلم ریویو وغیرہ دیکھنے لگے۔ ممبئی میں ان کا قیام 1948 سے 1954 تک رہا۔ اس دوران وہ اداکار اور ہدایت کار کی حیثیت سے اپٹا سے بھی جڑے رہے۔ انگلینڈ بھی گئے جہاں ڈرامے کی فنی تربیت حاصل کی۔ اپنی اہلیہ مونیکا مشرا کے ساتھ مل کر "نیا تھیٹر" کے نام سے ایک ڈراما کمپنی قائم کی۔

حبیب تنویر نے نو فلموں میں کام کیا جن میں گاندھی، بلیک اینڈ وائٹ اور منگل پانڈے شامل ہیں۔ 1972 میں انہیں راجیہ سبھا کا ممبر بنایا گیا۔ آگرہ بازار، شطرنج کے کھلاڑی اور چرن داس چور ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔ یہ ڈرامے ہندوستان اور یورپ میں تین دہائیوں تک پیش کیے گئے۔ انہیں پدم شری اور پدم بھوشن سمیت کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ ان کا انتقال 8 جون 2009 کو بھوپال میں ہوا۔

8.2.2 ڈراما: "آگرہ بازار" متن (اقتباس)

(پہلا ایکٹ)

دو آدمیوں کا کورس "شہر آشوب" گاتے ہوئے ہال کی پُشت سے داخل ہوتا ہے اور ہال میں سے ہوتا ہوا اسٹیج پر جاتا ہے۔ یہ لوگ فقیروں کے لباس میں ہیں۔ کفنی پہنے، ایک ہاتھ میں کشکول اور تسبیح اور دوسرے میں ایک ڈنڈا اور لوہے کے کڑے۔ حاضرین کی صفوں میں سے ہوتے ہوئے پردے کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور حاضرین کو مخاطب کر کے نظم سناتے ہیں اور تال پر کڑے بجاتے جاتے ہیں۔

کورس:

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے اختیار بند
رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر کا ہے موجدار بند
ہو کس طرح نہ منھ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو روزگار بند
جتنے ہیں آج آگرے میں کارخانہ جات
سب پر پڑی ہیں آن کے روزی کی مشکلات
کس کس کے دکھ کو روئیے اور کس کی کہئے بات
روزی کے اب درخت کا ہلتا نہیں ہے پات
ایسی ہوا کچھ آکے ہوئی ایک بار بند
کیا چھوٹے کام والے و کیا پیشہ ور نجیب
روزی کے آج ہات سے عاجز ہیں سب غریب
ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے جب آ شام عنقریب
اٹھتے ہیں سب دکان سے کہہ کر کہ یا نصیب
قسمت ہماری ہو گئی بے اختیار بند
حجام پر بھی یا تئیں ہے مفلسی کا زور
پیسہ کہاں جو سان پہ ہو استروں کا شور
کانپے ہے سر بھگوتے ہوئے اس کی پور پور
کیا بات ایک بال کٹے یا تراشے کور

یاں تک ہے استرے و نہرنی کی دھار بند
بے وارثی سے آگرہ ایسا ہوا تباہ
پھوٹی حویلیاں ہیں تو ٹوٹی شہر پناہ
ہوتا ہے باغباں سے ہر اک باغ کا نباہ
وہ باغ کس طرح نہ لٹے اور نہ اجڑے آہ
جس کا نہ باغباں ہو نا مالک نہ خاربند
عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے
ملا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے
شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے
اس واسطے یہ اس نے لکھے پانچ چار بند

(نظم پڑھتے ہوئے ایک دائیں طرف سے اور دوسرا بائیں طرف سے اسٹیج کے باہر چلا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی پردہ بڑی تیزی سے اٹھتا ہے۔ بازار پر عجب بے رونقی ہے۔ تل کے لڈو والا، ککڑی والا اور دوسرے پھیری والے آواز لگاتے ہیں، لیکن کہیں شنوائی نہیں ہوتی، بچے للچائی ہوئی نظروں سے خوانچہ والوں کو دیکھتے ہیں مگر دم نہیں مارتے۔ ان میں سے دو تین کھیل کود میں لگے ہوئے ہیں، اور گاتے جارہے ہیں "کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے"! پس منظر میں ایک نسوانی آواز طبلے اور سارنگی پر غزل گارہی ہے۔ غالباً پان کی دوکان کے اوپر کوٹھے آباد ہیں۔ کچھ بھکاری بھیک مانگتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور کچھ راہ گیر بات چیت کرتے ہوئے۔ ان ملی جلی آوازوں سے بازار میں ایک دھیما دھیما شور برپا ہے، جو مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے ملتا جلتا ہے۔ پتنگ والے کی دوکان بند ہے۔ کتب فروش کے ہاں دو گاہک کھڑے کتابیں دیکھ رہے ہیں۔ جب ککڑی والا یہاں آکر ککڑی بیچنے کی کوشش کرتا ہے، گاہک کتاب کی دوکان سے نکل کر پان والے کے ہاں پہنچ جاتے ہیں، اور کتب فروش اپنے حساب کتاب میں لگ جاتا ہے)۔

ککڑی والا : (بائیں طرف سے داخل ہو کر، لڈو والے کے سامنے کھڑا ہو جاتا) پھر تو میری جگہ پر بیٹھا؟

لڈو والا : ابے جا جا!

(ککڑی والا وہاں سے ہٹ کر کتب فروش کی دوکان پر آتا ہے، اور اس کے گاہکوں کو ککڑی بیچنے کی کوشش کرتا ہے)

ککڑی والا : تازہ اور مزیدار ککڑی، پیسے کی چھے چھے! کرکری، ہری بھری ککڑی پیسے کی چھے چھے! کھا کر دیکھو بھائی صاحب، ریشم کی طرح ملائم، گنے کی جیسی میٹھی، خاص اسکندرے کی ہے۔ پیسے کی چھے چھے۔ (کوئی ککڑی نہیں خریدتا)

لڈو والا : تل کے لدو دھیلے کے دو دو۔ تل کے لڈو دھیلے کے دو دو۔ چکھ کے دیکھو میاں (ایک بچے سے) مصری کے سمان میٹھے! لو کھاؤ۔ (بچہ منھ پھیر لیتا ہے)

تربوز والا : تربوز، ٹھنڈا تربوز، تربوز ٹھنڈا تربوز، کلیجے کی ٹھنڈک، آنکھوں کی تری، شربت کے کٹورے، ٹھنڈا تربوز، دل کی گرمی نکالنے والا، جگر کی پیاس بجھانے والا، شربت کے کٹورے تربوز ٹھنڈا تربوز۔ (راہ گیر بے نیازی سے گزر جاتے ہیں)

(کچھ لوگ پیچھے کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں، ککڑی والا آواز لگاتا ہوا ان کی طرف بڑھتا ہے، اور ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اتنے میں ایک مداری دائیں طرف سے بندر لیے ہوئے داخل ہوتا ہے، اور اپنے تماشے سے عجب رنگ جما دیتا ہے۔ پھیری والے، بچے لڑکے اور راستہ چلنے والے سب اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں، شور تھم جاتا ہے۔ اور پہلی بار مداری کے فقرے صاف صاف سمجھ میں آتے ہیں۔ مداری دائیں راستے سے داخل ہوتا ہے، اور اسٹیج کے بیچوں بیچ اپنا کھیل جماتا ہے۔)

مداری : (بندر نچاتا ہے) ہاں جرا ناچ دکھا دو ناچ، آگرہ سہر میں جرا ناچ دکھا دو! بچہ لوگ جرا ہاتھ کا تالی بجاؤ۔ اچھا بتاؤ تو جرا ہولی میں مردنگ کیسے بجاؤ نگے؟ (بندر مردنگ بجاتا ہے) اور پتنگ کیسے اڑاؤ نگے؟ (بندر نقل کرتا ہے) اور بانکے بن کر مہادیو جی کے میلے میں کیسے جاؤ نگے؟ (بندر کج کلاہی کی چال چلتا ہے) اور برسات آ گیا تو؟ (بندر پھسل جاتا ہے) پھسل پڑو نگے؟ ارے بھئی واہ۔ اور اگر جاڑا لگی تو؟ (بندر بدن میں کپکپی پیدا کرتا ہے) اور بڈھا ہو گئے تو؟ (بندر بڑھاپے کی نقل کرتا ہے) اور مر گئے تو؟ (بندر مر جاتا ہے) ہندو کو رام کی کسم اور مسلمان کو قرآن کی کسم، ذرا ایک ایک قدم پیچھے ہٹ جاؤ۔ اچھا اب بتاؤ بھلا نادر ساہ دلی پر کیسا جھپٹا تھا (بندر مداری کو ایک لاٹھی مارتا ہے) ارے تم تو سارے دلی سہر کو مار ڈالو گے! بس کرو بڑے میاں بس کرو۔ اچھا! احمد ساہ ابدالی دلی پر کیسا جھپٹا تھا؟ (بندر لاٹھی مارتا ہے) ہاں ہاں ہاں!!! اور سورج مل جاٹ آگرہ سہر پر کیسا جھپٹا تھا؟ (وہی نقل) اور آگرہ سہر میں کیا ہوا تھا؟ (بندر ادھر ادھر دوڑتا ہے) لوگ باگ بھاگ گیا تھا؟ (بندر لیٹ جاتا ہے) اور بہت سا آدمی مر گیا تھا؟ اور پھرنگی ہندوستان میں کیسا آیا تھا؟ (بندر بھیک مانگنے کی نقل کرتا ہے) اور پلاسی لڑائی میں لاٹ صاحب نے کیا کیا تھا؟ (بندر لاٹھی سے بندوق چلاتا ہے) فیر کر دیا تھا؟ اوہو ہو۔ اور بنگال میں کیا ہوا تھا؟ (بندر پیٹ بجاتا ہے اور کمزوری کا اظہار کرتا ہے) کال پڑ گیا تھا (بندر لیٹ جاتا ہے) لوگ باگ بھوک سے مر گیا تھا؟۔۔۔ اور ہمارا کیسا حالت ہے؟ (بندر پھر پیٹ بجاتا ہے) اور کل ہمارا کیسا حالت ہو جائیں گا؟ (بندر گر جاتا ہے) پھر ہمارے کو کیا کرنا چاہئے؟ (بندر لوگوں کے پاس جاتا ہے اور پیروں پر سر رکھ کر لیٹ جاتا ہے) سلام کرو (بندر سلام کرتا ہے، لوگ کھسکنے لگتے ہیں)

ککڑی والا : اسکندرے کی ککڑی۔ پیسے کی چھے چھے۔

لڈو والا : تل کے لڈو، دھیلے کے دو دو۔ دھیلے کے دو دو۔

تربوز والا : تربوز، ٹھنڈا تربوز، تربوز ٹھنڈا تربوز۔

مداری : سلام کرو۔ (بندر پان کی دوکان پر جو دائیں راستے کے قریب ہے، ایک آدمی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور سلام کرتا ہے)

ککڑی والا : (اسی آدمی سے) کھا کے دیکھئے صاحب، ہری بھری، کرکری ککڑی، (آدمی چلا جاتا ہے، مداری غصے میں جھپٹتا ہے اور ککڑی والے کے ہاتھ سے ٹوکرا چھین کر پھینک دیتا ہے۔ ساری ککڑیاں سڑک پر بکھر جاتی ہیں)

مداری : بڑا آیا ککڑی بیچنے والا۔ ہم ایک لکڑی دینگا تو ککڑی و کڑی سب بھول جائیں گا۔

(ککڑی والا سر پیٹ کر وہیں بیٹھ جاہے اور رونے لگتا ہے)

ککڑی والا : میری ککڑی!

مداری : ابھی تیرا بندر بنا کر رکھ دینگا۔ سالا آیا ہے ککڑی بیچنے۔ ککڑی دکھا دکھا کے ہمارا سب آدمی بھگا دیا۔ (مداری اسے ایک دھپ رسید کرتا ہے)

8.2.3 خلاصہ:

ڈراما" آگرہ بازار "حبیب تنویر کے مشہور ڈراموں میں سے ایک ہے۔ یہ ڈراما حبیب تنویر نے 1954 میں لکھا تھا۔14 مارچ1954 کو پہلی بار یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں کھیلا گیا۔ حبیب تنویر اس ڈرامے کے لکھے جانے کا پس منظر کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ "اطہر پرویز کا فون آیا کہ 14 مارچ کو جامعہ ملیہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین جامعہ ملیہ کی طرف سے یوم نظیر منایا جارہا ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ میں اس سلسلے میں نظیر پر ایک ڈراما تیار کروادوں۔ نظیر کے کلام سے مجھے دلچسپی تو مدت سے رہی ہے، مگر نظیر پر ڈراما لکھنے کا خیال کبھی نہ آیا تھا۔"

(حبیب تنویر، آگرہ بازار، آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی، صفحہ 7)

ڈراما آگرہ بازار بظاہر نظیر اکبر آبادی کی حیات اور ان کی شاعری پر مبنی دکھائی دیتا ہے لیکن اس ڈرامے کا ہیرو نظیر نہیں ہے البتہ اس کا موضوع نظیر کا زمانہ اور اس دور کی معاشرت ہے۔ ڈرامے کا زمانہ لگ بھگ 1810 ہے۔ اس زمانے میں نظیر کی عمر کوئی 75 برس رہی ہوگی۔ اس ڈرامے میں حبیب تنویر نے نظیر کی زندگی کے عوامی رخ پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شخصیت کو محور بنا کر شہر آگرہ کی تہذیب و معاشرت کو پیش کیا ہے۔ حبیب تنویر اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ "میں ڈرامے کی بنیاد نظیر کی زندگی کو نہیں، بلکہ اس کے کلام کو بنانا چاہتا تھا۔ ڈراما لکھنے کے دوران میں یہ بات بھی ذہن میں آئی کہ نظیر کو اسٹیج پر نہ لانا ہی بہتر ہوگا"۔

حبیب تنویر نظیر اکبر آبادی کو ان کے کلام کی طرح زندہ جاوید دیکھنا چاہتے تھے اور ان کی شخصیت کے افسانوی پہلو کو بھی برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ کسی مصنف کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے ہیرو کو سامنے نہ لاکر ہی اسے ہیرو بنانا۔ مگر حبیب تنویر یہاں کامیاب نظر آتے ہیں۔ انہوں نے نظیر کو سامنے نہ لاکر ان کی موجودگی کی فضا اور دیکھنے والوں کے دلوں میں ان کی شخصیت کا احساس پیدا کر دیا ہے۔

ڈراما آگرہ بازار کی کہانی دو ایکٹ پر مشتمل ہے۔ پہلے ایکٹ کی ابتدا نظیر اکبر آبادی کی نظم "شہر آشوب" سے ہوتی ہے۔ دو لوگ فقیر کے لباس میں اسٹیج پر آتے ہیں۔ کفنی پہنے، ایک ہاتھ میں کشکول اور تسبیح اور دوسرے میں ایک ڈنڈا اور لوہے کے کڑے لیے، پردے کے سامنے کھڑے ہو کر شہر آشوب پڑھتے ہیں۔ اس نظم سے قاری کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہر آگرہ کے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات بہت زیادہ خراب ہیں۔ مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اکبر ثانی برائے نام دلی کے تخت پر بیٹھا ہے، ملک میں انگریزوں کا اقتدار بڑھ چکا ہے، اور چاروں طرف لوٹ کھسوٹ مچی ہوئی ہے۔ اندرونی و بیرونی حملوں سے یہ شہر بربادی کے دہانے پر آگیا ہے۔ سارے کارخانے بند ہیں، دکانوں میں گاہکوں کی کمی ہے۔ لوگوں کے پاس پیسے نہیں ہیں، چاروں طرف افراتفری اور سیاسی بے چینی پھیلی ہوئی ہے، لوگوں کی اقتصادی حالت دن بدن گر رہی ہے۔ نظم کے بعد ایک فقیر اسٹیج کے دائیں اور دوسرا بائیں جانب چلا جاتا ہے، تب پردہ اٹھتا ہے۔ پردہ اٹھنے کے بعد ہمیں بازار کا ماحول نظر آتا ہے۔ حبیب تنویر نے جس مقام کا انتخاب کیا ہے وہ آگرہ کا "کناری بازار" ہے۔ جہاں مختلف قسم کے لوگ موجود ہیں۔ بازار

میں عجب قسم کی بے رونقی چھائی ہے بلکہ سناٹا پسرا ہوا ہے، کچھ دکانیں کھلی تو کچھ بند ہیں۔ یہاں تک کہ پتنگ والے کی دکان بھی بند ہے۔ تل کے لڈو والا، ککڑی والا اور دوسری پھیری والے آواز لگاتے ہیں، لیکن ان کی آوازوں پر کوئی دھیان نہیں دیتا ہے۔ حالانکہ چھوٹے بچے خوانچے والوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں مگر پاس نہیں جاتے۔ غالباً پان کی دکان کے اوپر کوٹھے آباد ہیں۔ کچھ بھکاری بھیک مانگتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ ککڑی والا، لڈو والا اور تربوز والا الگ الگ آوازوں سے راہ گیروں کو اپنا اپنا سامان بیچنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ناکام ہوتے ہیں۔ ان کی آپسی گفتگو سے یہ اندازا لگتا ہے کہ ان کا کاروبار مندا چل رہا ہے۔

اتنے میں ایک مداری بندر لیے ہوئے بازار میں داخل ہوتا ہے اور اپنے تماشے سے ایسا رنگ جماتا ہے کہ پھیری والے، بچے، بوڑھے اور راستہ چلنے والے سب اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ مداری تماشا دکھاتے وقت اپنے مکالمے میں تاریخی پس منظر پیش کرتا ہے۔ اس سے آگرہ شہر کے تاریخی و سیاسی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ مداری کی باتوں سے ہمیں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے دلی کو لوٹنے اور سورج مل جاٹ کے آگرہ شہر کو تباہ کرنے پر پڑنے والی مصیبت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد مداری پلاسی کی جنگ اور انگریزوں کا ہندوستان پر قبضے کا ذکر کرتا ہے۔ پھر قحط بنگال کی تصویر کھینچتے ہوئے اپنی مفلسی کا رونا رونے لگتا ہے۔ کھیل ختم ہوتا ہے اور لوگ بندر کو پیسہ دیے بغیر جانے لگتے ہیں، ککڑی والا ناظرین کے سامنے جا کر اپنی ککڑی بیچنے کی کوشش کرتا ہے۔ مداری کو ایسا لگتا ہے کہ ککڑی والے کی وجہ سے لوگوں نے اس کے بندر کو پیسے نہیں دیے۔ اسی بات پر دونوں میں لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ مداری ککڑی کی ٹوکری اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ ساری ککڑی زمین پر بکھر جاتی ہے۔ ککڑی والا سر پیٹ کر وہیں بیٹھ جاتا ہے اور رونے لگتا ہے۔ اس کے بعد سبھی پھیری والے اس لڑائی میں شامل ہوتے ہیں اور مداری سے نوک جھونک کرتے ہیں۔ سارا تماشا دیکھنے کے بعد یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہر شخص اپنی مفلسی کا رونا روتا ہے۔ اچانک ککڑی والے کے دل میں خیال آتا ہے کہ کیوں نہ وہ اپنی ککڑی بیچنے کے لیے نظم لکھوالے۔ جس کے لیے وہ شاعر سے ملاقات کرتا ہے۔ یہاں پر پہلے منظر کا اختتام ہوتا ہے۔

8.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں۔

- ڈراما ادب کی ایک اہم اور قدیم ترین صنف ہے۔ ہندوستان اور یونان دنیا کے وہ دو ملک ہیں جہاں ڈرامے سب سے پہلے لکھے گئے۔ بھرت منی ہندوستان میں اور ارسطو یونان میں ڈراما کے اولین نقاد کہلائے۔
- لفظی اعتبار سے ڈراما کی اصل یونانی ہے۔ اور اس زبان میں اس کے معنی 'کر کے دکھانا' ہے۔ گویا یونانیوں کے نزدیک ڈرامے کا اصل مطلب یہ ہے کہ جو کچھ تحریر کیا جائے اسے کر کے دکھایا جائے۔ ڈراما نقل ہے اور نقل کرنا انسانی فطرت میں ازل سے شامل ہے۔
- مشہور ڈراما نگار اور شاعر حبیب تنویر یکم ستمبر 1923 کو رائے پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام محبیب احمد خان تھا مگر حبیب تنویر کے نام سے مشہور ہوئے۔

- حبیب تنویر کی ابتدائی تعلیم معمول کے مطابق گھر اور مدرسے میں ہوئی۔ 1940 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ جس کے بعد آگے کی تعلیم کے لیے ناگپور کے مورس کالج میں داخلہ لیا۔ جہاں سے انہوں نے 1944 میں گریجویشن کیا۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں ایم۔ اے (اردو) میں داخلہ لیا مگر جلد ہی وہ ممبئی چلے گئے۔
- اپنی اہلیہ مونیکا مشرا کے ساتھ مل کر "نیا تھیٹر" کے نام سے ایک ڈراما کمپنی قائم کی۔
- حبیب تنویر نے نو فلموں میں کام کیا جن میں گاندھی، بلیک اینڈ وائٹ اور منگل پانڈے شامل ہیں۔
- 1972 میں انہیں راجیہ سبھا کا ممبر بنایا گیا۔
- آگرہ بازار اور چرن داس چور ان کے مشہور ڈرامے ہیں۔ یہ ڈرامے ہندوستان اور یورپ میں تین دہائیوں تک پیش کیے گئے۔
- انہیں پدم شری اور پدم بھوشن سمیت کئی اعزازات سے نوازا گیا۔
- ان کا انتقال 8 جون 2009 کو بھوپال میں ہوا۔
- حبیب تنویر اردو ڈراما نگاری کے اہم ستون ہیں۔ 1936 کے بعد ترقی پسند نظریے کے تحت انہوں نے ڈرامے تحریر کیے۔
- ڈراما "آگرہ بازار" حبیب تنویر کے مشہور ڈراموں میں سے ایک ہے۔ یہ ڈراما حبیب تنویر نے 1954 میں لکھا تھا۔ 14 مارچ 1954 کو پہلی بار یہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی میں کھیلا گیا تھا۔
- ڈراما آگرہ بازار بظاہر نظیر اکبر آبادی کی حیات اور ان کی شاعری پر مبنی دکھائی دیتا ہے لیکن اس ڈرامے کا ہیرو نظیر نہیں ہے البتہ اس کا موضوع نظیر کا زمانہ اور اس دور کی معاشرت ہے۔
- حبیب تنویر نے نظیر کی زندگی کے عوامی رخ پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شخصیت کو محور بنا کر شہر آگرہ کی تہذیب و معاشرت کو پیش کیا ہے۔
- ڈراما آگرہ بازار کی کہانی دو ایکٹ پر مشتمل ہے۔ پہلے ایکٹ کی ابتدا نظیر اکبر آبادی کی نظم "شہر آشوب" سے ہوتی ہے۔
- اس نظم سے قاری کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہر آگرہ کے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات بہت زیادہ خراب ہیں۔ مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اکبر ثانی برائے نام دلی کے تخت پر بیٹھا ہے، ملک میں انگریزوں کا اقتدار بڑھ چکا ہے، اور چاروں طرف لوٹ کھسوٹ مچی ہوئی ہے۔ اندرونی و بیرونی حملوں سے یہ شہر بربادی کے دہانے پر آ گیا ہے۔ سارے کارخانے بند ہیں، دکانوں میں گاہکوں کی کمی ہے۔ لوگوں کے پاس پیسے نہیں ہیں، چاروں طرف افراتفری اور سیاسی بے چینی پھیلی ہوئی ہے، لوگوں کی اقتصادی حالت دن بدن گر رہی ہے۔
- مداری تماشا دکھاتے وقت اپنے مکالمے میں تاریخی پس منظر پیش کرتا ہے۔ اس سے آگرہ شہر کے تاریخی و سیاسی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ مداری کی باتوں سے ہمیں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے دلی کو لوٹنے اور سورج مل جاٹ کے آگرہ شہر کو تباہ کرنے پر پڑنے والی مصیبت کا پتہ چلتا ہے
- سارا تماشا دیکھنے کے بعد یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہر شخص اپنی مفلسی کا رونا روتا ہے۔

8.4 مشکل الفاظ

قدیم	پرانا	Ancient, Old
ازل	جس کی ابتدا معلوم نہ ہو،	Eternal
تعبیر	مفہوم، منشا، مراد	Interpretation, Meaning
متن	کسی کتاب یا مضمون کی اصل عبارت	Text, Content
نام ور	بہت نام والا، مشہور	Famous, Renowned
ہدایت کار	رہنمائی کرنے والا	Director
اسکرین رائٹر	مسودہ نگار	Screenwriter
میٹرک	ہائی اسکول، دسویں جماعت	Matriculation, Metric
دستیاب	حاصل، پانا	Available
فنی تربیت	سکھانے کا عمل	Technical training
قائم	بنانا،	Established, Standing
ہال کی پشت	بڑے کمرے کے پیچھے کا حصہ	Back of the hall
سخن	بات، گفتگو	Speech, Poetry, Word
اختیار	حکم چلانے کی اہلیت	Authority, Power
لیل و نہار	رات اور دن	Day and night
خلق	مخلوق، عوام	People, Creation
موجدار	لہر دار، اونچ نیچ، وہ پانی جس میں موج و لہر پایا جائے	wavelike, wavy, waved
کارخانہ جات	کارخانہ کی جمع، کسی چیز کو بنانے کی جگہ	Factories
پیشہ ور	کاروبار کرنے والا، ہنر یا پیشہ کے ذریعہ کمانے والا،	workman, tradesman, Professional
نجیب	بزرگ، محترم، شریف	Noble, Well-born
عاجز	پریشان	Humble, Weak
عنقریب	بہت جلد	Soon, Shortly

حجام	نائی	Barber
مفلسی	غریبی، ناداری	Poverty
استرہ	وہ آلہ جس سے نائی داڑھی بناتے ہیں	Razor
نہرنی	جس سے ناخن کاٹا جاتا ہے	Nail Cutter
بے وارثی	جس کا کوئی وارث نہ ہو،	Orphanhood, Without heir
شہر پناہ	شہر کی چہار دیواری، فصیل	City wall, Fortification
باغباں	مالی،	Gardener
خاربند	کانٹوں سے بنایا ہوا	Thorn-remover (gardener's helper)
شنوائی	سننے کا عمل یا قوت، قوت سماعت	Hearing, Listening
کتب فروش	کتاب بیچنے والا، Book Seller	Bookseller
فقرے	جملے، Sentences	Sentences, Phrases
جرا	ذرا، Bit	Bit, slightly, a little
نادر ساہ	ایران کا بادشاہ جو ہندوستان سے تخت طاووس لوٹ لے گیا، Nadir Shah, King of Iran	Rare, Precious
پھرنگی	فرنگی،	French
فیر کر دینا	فائر کر دینا،	To be fired, Kill
دھپ رسید کرنا	مارنا، Hit	To slap, To hit
مشتمل	شامل شدہ، containing, including	containing, including
شہر آشوب	وہ نظم جس میں کسی شہر یا ملک کی اقتصادی یا سیاسی بے چینی کا تذکرہ ہو	City distress poetry (lament on city's decline)
معاشی حالات	اقتصادی یا مالی حالت، Economic conditions	Economic conditions
افراتفری	بے چینی، مار کاٹ، اضطرابی حالات، chaos, confusion	Chaos, Confusion

راہ گیر	مسافر، راستہ چلنے والا، pedestrian, traveller	Passer-by
پلاسی کی جنگ	پلاسی کے مقام پر بنگال کے نواب شجاع الدولہ اور انگریزوں کے درمیان لڑی جانے والی جنگ	Battle of Plassey (1757)

8.5 مشقیں

مشق 1: حبیب تنویر کے بارے میں چند جملوں میں لکھیے۔

.....

.....

.....

مشق 2: نیچے دیے گئے اشعار میں جمع (Plural) الفاظ تلاش کر کے لکھیے۔

جتنے ہیں آج آگرے میں کارخانہ جات
سب پر پڑی ہیں آن کے روزی کی مشکلات
کس کس کے دکھ کو روئیے اور کس کی کہئے بات
روزی کے اب درخت کا ہلتا نہیں ہے پات
ایسی ہوا کچھ آکے ہوئی ایک بار بند

جمع (Plural) الفاظ:

.....	.....	.....
.....	.....	.....
.....	.....	.....

8.6 نمونۂ امتحانی سوالات

8.6.1 معروضی سوالات:

1۔ حبیب تنویر کا اصل نام کیا تھا؟

(a) مجیب احمد خان (b) نجیب احمد خان (c) شریف احمد خان (d) حیات خان

2۔ حبیب تنویر کب پیدا ہوئے؟

(a) 1930 (b) 1923 (c) 1940 (d) 1920

3۔ حبیب تنویر کے والد کا کیا نام تھا؟

(a) محمد نجات خان (b) محمد امتیاز خان (c) محمد حیات خان (d) محمد مجیب خان

4۔ "نیا تھیٹر" کے نام سے کس نے ڈراما کمپنی قائم کی؟

(a) امتیاز علی تاج (b) سید عابد حسین (c) پروفیسر محمد مجیب (d) حبیب تنویر

5۔ آگرہ بازار کے مصنف کا کیا نام ہے؟

(a) واجد علی شاہ (b) امانت (c) حبیب تنویر (d) اشتیاق حسین

6۔ ڈراما آگرہ بازار پہلی مرتبہ کہاں کھیلا گیا؟

(a) جامعہ ملیہ اسلامیہ (b) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (c) جامعہ عثمانیہ (d) جامعہ ہمدرد

7۔ کس ڈرامے میں نظیر اکبر آبادی کی زندگی اور ان کی شاعری کو بنیاد بنایا گیا ہے؟

(a) اندر سبھا (b) انار کلی (c) کربل کتھا (d) آگرہ بازار

8۔ ڈراما آگرہ بازار کب لکھا گیا؟

(a) 1954 (b) 1960 (c) 1963 (d) 1976

9۔ ڈراما آگرہ بازار میں کتنے ایکٹ ہیں؟

(a) پانچ (b) تین (c) چار (d) دو

10۔ ڈراما آگرہ بازار میں کس شہر کی تہذیب و معاشرت کو پیش کیا گیا ہے؟

(a) لکھنؤ (b) آگرہ (c) دلی (d) حیدرآباد

8.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. حبیب تنویر کی سوانح قلم بند کیجیے۔
2. حبیب تنویر کی تصانیف پر روشنی ڈالیے۔
3. ڈراما آگرہ بازار کا موضوع بیان کیجیے۔
4. ڈراما آگرہ بازار میں جھگڑے کا کیا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔؟
5. ان اشعار کی تشریح اپنے الفاظ میں کیجیے۔

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے
ملا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے

شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے
اس واسطے یہ اس نے لکھے پانچ چار بند

8.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. حبیب تنویر کی ڈراما نگاری پر مفصل نوٹ لکھیے۔
2. ڈراما آگرہ بازار میں مداری کے مکالمہ سے ہمیں کیا پتہ چلتا ہے؟ واضح کیجیے۔
3. ڈراما آگرہ بازار کے دیے گئے اقتباس کا خلاصہ لکھیے۔

8.6.1 کے جوابات:

A (i)	B (ii)	A (iii)	C (iv)	D (v)
C (vi)	A (vii)	A (viii)	D (ix)	A (x)

بلاک III

اکائی 9: مضمون

(بحث و تکرار: سر سید احمد خاں)

اکائی کے اجزا

9.0		تمہید
9.1		مقاصد
9.2		"بحث و تکرار" سر سید احمد خاں
	9.2.1	سر سید احمد خاں کا تعارف
	9.2.2	"بحث و تکرار": متن
	9.2.3	خلاصہ
9.3		اکتسابی نتائج
9.4		مشکل الفاظ
9.5		مشقیں
9.6		نمونہ امتحانی سوالات

9.0 تمہید

کسی منتخب موضوع پر اپنے خیالات کا تحریری صورت میں اظہار کرنا مضمون کہلاتا ہے۔ مضمون کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں۔ مضمون ادبی، سماجی، تاریخی، سیاسی اور اخلاقی ہو سکتا ہے۔ مضمون نگار کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مطالعہ وسیع اور لکھنے کی مشق ہو۔ مضمون کی عبارت میں تسلسل اور ربط کا ہونا ضروری ہے۔ مضمون کے اجزا تین ہوتے ہیں۔

(1) تمہید (2) نفس مضمون (3) خاتمہ

اردو مضمون نگاری کا آغاز دہلی کالج سے ہوتا ہے۔ اس صنف کو فروغ دینے میں سر سید احمد خاں اور ان کے ساتھیوں کا اہم کردار رہا ہے۔ اردو کے اہم مضمون نگاروں میں محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مولوی ذکاء اللہ، محسن الملک، میر ناصر علی

دہلوی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

اس اکائی میں آپ سرسید احمد خان کے مضمون "بحث و تکرار" کا مطالعہ کریں گے۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- سرسید کی زندگی کے حالات پر گفتگو کر سکیں۔
- سرسید کے مضامین کے موضوعات کو سمجھ سکیں۔
- مضمون "بحث و تکرار" کے موضوع سے واقف ہو سکیں۔
- سرسید کے مشہور مضمون "بحث و تکرار" کے خلاصہ کر سکیں۔

9.2 "بحث و تکرار" سرسید احمد خاں

9.2.1 سرسید احمد خاں کا تعارف:

اردو ادب کی تاریخ میں سرسید احمد خاں کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ وہ بہترین مقرر، مصنف، مدبّر اور مصلح تھے۔ ان کی پیدائش دلّی کے معزز گھرانے میں 1817ء میں ہوئی۔ علمی و ادبی اعتبار سے گھر کا ماحول ساز گار تھا۔ جس کا اثر سرسید کی شخصیت پر بھی پڑا۔ سرسید ذہین، باشعور اور اپنے ملک و قوم کی صورت حال سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور انگریزوں کی ملازمت کی تھی جس سے انھیں انگریز قوم کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

جب سرسید 1857ء میں 40 برس کے تھے اس وقت ہندوستان میں آزادی ہند کی پہلی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں ہندوستانیوں کو شکست ہوئی اور انہیں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سرسید اس کے چشم دید گواہ تھے۔ وہ بہت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ان تمام مسائل کا تدارک تعلیم ہے۔ ملک و قوم کے لیے تعلیم بہت ضروری ہے بالخصوص نوجوانوں کے لیے۔ ان کا خواب تھا کہ تمام ہندوستانی تعلیم یافتہ ہوں۔ سائنس اور دیگر سماجی علوم سے ان کی واقفیت ہو۔ قوم کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر بہت محنت کی۔ ان کے رفقائے کار میں ڈپٹی نذیر احمد، الطاف حسین حالیؔ، محسن الملک وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے تعلیمی ادارے قائم کیے۔ "سائنٹفک سوسائٹی' قائم کی۔ جہاں سائنس اور سماجی علوم کی کتابیں اردو میں ترجمہ کرائی گئیں تاکہ ان ترجمہ شدہ کتابوں کے مطالعے سے لوگوں میں بیداری آئے۔ ان میں وسعت نظری پیدا ہو۔

سرسید نے 1870ء میں "تہذیب الاخلاق" اخبار شائع کیا۔ اس میں وہ آسان اور عام فہم زبان میں مضامین لکھتے تھے۔ جو مقصدی نوعیت کے ہوتے تھے۔ سرسید نے محمڈن اینگلو اورینٹل (MAO) کالج قائم کیا ہے۔ یہی کالج 1920ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ جس کی شہرت نہ صرف قومی بلکہ بین الاقوامی سطح پر ہے۔ آج بھی ہزاروں طالب علم اس یونیورسٹی سے فیضیاب ہو رہے ہیں اور سرسید کو یاد کرتے ہیں۔ اس عظیم ہستی کا انتقال مارچ 1898ء میں علی گڑھ میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر 81 سال تھی۔ ان کی بنائی ہوئی

درس گاہ کی مسجد کے بیرونی حصے میں انھیں دفن کیا گیا۔

9.2.2 متن بحث و تکرار:

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں، پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے، پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے، ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں، منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عنیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں، اس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں، اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا، جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں، پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے، واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے، "واہ تم کیا جانو۔" وہ بولتا ہے، "تم کیا جانو۔" دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی ہے، رخ بدل جاتا ہے، آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں، باچھیں چر جاتی ہیں، دانت نکل پڑتے ہیں، تھوک اڑنے لگتا ہے، باچھوں تک کف بھر آتے ہیں، سانس جلدی چلتا ہے، رگیں تن جاتی ہیں، آنکھ، ناک، بھوں، ہاتھ، عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں، آستین چڑھا ہاتھ پھیلا، اس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی داڑھی اس کی مٹھی میں۔ لپاڈکی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر اور ایک ادھر، اور اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے پٹ کر کپڑے جھاڑتے سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔ کہیں غرفش ہو کر رہ جاتی ہے، کہیں توں تکار تک نوبت آ جاتی ہے، کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے، مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔ انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کے پرکھنے کے لیے بحث و مباحثہ ہی کسوٹی ہے اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے، مگر ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں تہذیب و شائستگی، محبت اور دوستی کو ہاتھ سے دینا نہ چاہیے۔

پس اے میرے عزیز ہم وطنو! جب تم کسی کے بر خلاف کوئی بات کہنی چاہو یا کسی کی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دو بدو بات چیت کرتے ہو تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ، لہجہ، آواز، وضع، لفظ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو مگر بناوٹ بھی نہ پائی جاوے۔ تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے لفظ استعمال کرو، مثلاً یہ کہ میری سمجھ میں نہیں آیا یا شاید مجھے دھوکا ہوا یا میں غلط سمجھا، گو بات تو عجیب ہے، مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں۔ جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ۔ یہ کہہ کر کہ میں اس بات کو پھر سوچوں گا یا اس پر پھر خیال کروں گا، جھگڑے کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کرو۔

دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اس دو تین دفعہ کی الٹ پھیر سے تمہارے دل میں کچھ کدورت نہیں آئی ہے اور نہ تمہارا مطلب باتوں کی اس الٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا، کیونکہ جھگڑا یا شبہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبت میں کمی آجاتی ہے اور رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسی عزیز چیز (جیسے کہ دوستی) ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

جب کہ تم مجلس میں ہو جہاں مختلف رائے کے آدمی ملے ہوئے ہیں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثے کو آنے مت دو، کیونکہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے۔ جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو جس قدر ممکن ہو اس کو ختم کر دو اور آپس میں ہنسی خوشی مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس بات پر غور کریں کہ ان مجلسوں میں آپس کے مباحثے اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔

9.2.3 خلاصہ:

بحث و تکرار انسانی زندگی کے وہ عوامل ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل، معاملات، خیالات اور نظریات میں واضح طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور جن کے ذریعے لوگ اپنی بات کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور دوسروں کی رائے سے اختلاف یا اتفاق کرتے ہیں۔ لیکن مہذب اور تعلیم یافتہ افراد کے بحث و تکرار کا طریقہ اخلاقیات اور شائستہ لب و لہجے پر مشتمل ہوتا ہے اور ان کی گفتگو میں نرمی اور آپسی بھائی چارے کا عنصر غالب ہوتا ہے، جب کہ غیر مہذب اور تعلیم سے بے بہرہ افراد کے یہاں شائستگی اور مجلسی آداب کا فقدان ہوتا ہے۔

سر سید احمد خان نے اپنے مضمون "بحث و تکرار" میں مہذب تعلیم یافتہ افراد اور غیر مہذب تعلیم یافتہ افراد کی گفتگو یا بحث و تکرار کے رویوں کی گہرائی سے وضاحت کی ہے۔ اور ان کے معاشرتی، علمی اور اخلاقی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ یہ کیسے انسانی شخصیت اور معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے ابتدائی مضمون میں کتوں کی لڑائی کے منظر کو نقل کیا ہے اور ان کی ان تمام خصلتوں اور حرکتوں کا ذکر کیا ہے جو لڑائی کے وقت ان کے جانور ہونے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جیسا کہ کتوں کی لڑائی جب آگے بڑھتی ہے تو اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "منہ سے جھاگ نکل پڑتے ہیں اور عنیف آواز کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں، اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں، اس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں، اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا، جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔"

سر سید نے کتوں کی مذکورہ حرکات کو بیان کرنے کے بعد سماج کے غیر مہذب افراد کی بحث و تکرار سے اس کا موازنہ کرتے ہیں کہ جب غیر مہذب افراد ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور کسی موضوع پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں تو رفتہ رفتہ باتیں شروع ہوتی ہیں۔ پہلے آواز ہلکی آتی ہے۔ پھر وہ ایک لڑائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر ان کی عادتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" نامہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں پھر دھیمی دھیمی بات شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے، دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں یوں ہے۔ وہ کہتا ہے "واہ تم کیا جانو" وہ بولتا ہے "تم کیا جانو"... پھر دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے، تیوری چڑھ جاتی ہے،... عنیف عنیف آوازیں نکلنے لگتی ہیں، آستین چڑھا ہاتھ پھیلا، اس کی گردن، اس کے ہاتھ میں اور اس کی داڑھی اس کی مٹھی میں لپاڈو کی ہونے لگتی ہے۔"

اس مضمون میں کتا در اصل انسانوں کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ تمام خصوصیات آج انسانوں میں ملتی ہیں۔ حالاں کہ کتا ایک جانور ہے اور انسان اشرف المخلوقات۔ لیکن سر سید نے کتوں کے توسط سے انسان کو اخلاقیات سکھانے اور ایسی حرکتوں سے باز آنے کی ترغیب دی ہے۔ اسی لیے انھوں نے بحث و تکرار میں بحث اور تکرار کی وضاحت الگ الگ زاویے سے کی ہے۔

بحث ایک ایسا عمل ہے جس میں دو یا دو سے زیادہ افراد کسی موضوع پر اپنے خیالات پیش کرتے ہیں، دلائل دیتے ہیں اور ایک دوسرے کے نظریات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سر سید کے نزدیک بحث ایک تعمیری عمل ہے، جو نہ صرف انسان کی ذہنی اور فکری صلاحتوں کو جِلا بخشتا ہے بلکہ معاشرتی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بحث کا بنیادی مقصد حقیقت کو پیش کرنا اور مسائل کا حل تلاش کرنا ہونا چاہیے۔ ایک تعلیم یافتہ اور باشعور فرد ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی بحث دوسروں کے لیے بھی مفید ہو اور وہ خود بھی اس سے کچھ نیا سیکھے۔

اس کے علاوہ بحث کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ یہ مختلف خیالات کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے۔ جب دو افراد یا گروہ کسی موضوع پر دلائل کے ذریعے گفتگو کرتے ہیں، تو ان کے خیالات کا تبادلہ ہوتا ہے اور ایک دوسرے کی سوچ کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

سر سید نے تکرار کو بحث کے مقابلے میں ایک منفی عمل قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک، تکرار وہ رویہ ہے جو انسان کو حقیقت سے دور لے جاتا ہے اور اسے صرف اپنی بات پر اصرار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ تکرار میں دلائل کی جگہ ضد اور انا لے لیتی ہے، جس کے نتیجے میں اختلافات مزید گہرے ہو جاتے ہیں۔ تکرار کا مقصد نہ تو مسائل کو حل کرنا ہوتا ہے اور نہ ہی سچائی کو تلاش کرنا، بلکہ یہ محض اپنی برتری ثابت کرنے کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔

تکرار کے کئی نقصانات ہیں، جن پر سر سید نے اپنے مضمون میں روشنی ڈالی ہے۔ جب دو افراد یا دو گروہ آپسی تکرار میں مبتلا ہو جاتے ہیں، تو وہ ایک دوسرے کی بات کو سمجھنے کے بجائے محض اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے رنجشیں اور اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ جس سے دلوں میں کدورت اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ سر سید کے نزدیک، یہ رویہ انسان کی ذہنی اور اخلاقی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔

سر سید احمد خان نے بحث اور تکرار کے درمیان واضح فرق بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق، بحث ایک تعمیری اور مثبت عمل ہے، جب کہ تکرار ایک منفی اور تخریبی رویہ ہے۔ بحث کا مقصد مسائل کا حل تلاش کرنا اور حقیقت کو واضح کرنا ہوتا ہے، جب کہ تکرار صرف اپنی

بات کو زبردستی منوانے کا ایک ذریعہ ہے۔

بحث کو مثبت بنانے کے لیے سرسید نے کچھ اصول بھی بیان کیے ہیں، جو آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ بحث کے دوران ادب اور تہذیب کا خیال رکھنا چاہیے۔ دوسرے کی بات کو غور سے سننا اور اسے سمجھنے کی کوشش کرنا بحث کے عمل کو نتیجہ خیز بناتا ہے۔ اپنی رائے کے حق میں دلائل پیش کرنا اور دوسروں کی رائے کو احترام کے ساتھ لینا ایک مہذب انسان کی نشانی ہے۔

ان تمام نکات پر ہم غور کریں جسے سرسید نے اس مضمون میں شامل کیا ہے تو ایک مہذب سماج کی شکل نظر آتی ہے۔ جہاں لوگ آپس میں تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ ان میں پیار و محبت اور آپسی بھائی چارے کا جذبہ ہوتا ہے۔ ایسی کوئی بات سامنے نہیں آتی ہے جس سے طبیعت مکدر ہو بلکہ اس سے ذہن کے دریچے وا ہوتے ہیں۔ انسان کو اپنے دل و دماغ اور ذہن کو کھلا رکھنا چاہیے تاکہ نئی نئی باتیں سیکھ سکے۔ جس طرح گھر کی کھڑکیاں کھلی ہونے سے تازہ اور ٹھنڈی ہوا آتی ہے اور اس میں رہنے والوں کو فرحت بخشتی ہے۔ اسی طرح تکرار کے بجائے اچھی گفتگو بھی انسان کے لیے نہایت مفید اور کار آمد ثابت ہوتی ہے۔ اور انسان سلیقہ مند ہو کر مہذب سماج کا حصہ بن جاتا ہے۔

سرسید نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں اپنی زندگی میں تعمیری بحث کو فروغ دینا چاہیے اور غیر ضروری تکرار سے پرہیز کرنا چاہیے۔ لیکن اس کا دارومدار تربیت اور تہذیب پر ہوتا ہے یعنی جس قدر مہذب اور تربیت یافتہ شخص ہوگا اس کے بحث و تکرار میں اتنا ہی نرم رویہ اور شائستگی پائی جائے گی۔ اور اگر تربیت اور تہذیب میں کمی ہوگی تو اس کے مزاج میں اسی قدر تیزی اور تندی ہوگی اور وہ اسی لحاظ سے اس کا مظاہرہ بھی کرے گا۔

سرسید احمد خان کا مضمون "بحث و تکرار" آج بھی ہمارے لیے اہمیت رہتا ہے، خاص طور پر ان نوجوانوں کے لیے جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ کیوں کہ یہ مضمون ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہم کس طرح اپنے رویوں کو بہتر بنا سکتے ہیں اور اختلافات کو مثبت انداز میں حل کر سکتے ہیں۔ بحث کے ذریعے علم حاصل کرنا اور دوسروں کے خیالات سے فائدہ اٹھانا ایک مہذب اور باشعور انسان کی نشانی ہے۔ سرسید کے خیالات ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ ہمیں اپنی زندگی میں ہمیشہ سچائی، انصاف اور تعمیری رویے کو اپنانا چاہیے تاکہ ہم نہ صرف اپنی شخصیت کو نکھار سکیں بلکہ معاشرے کی ترقی میں بھی اپنا کردار ادا کر سکیں۔

9.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- سرسید احمد خان ایک عظیم مفکر، مصلح قوم اور ادیب تھے۔
- سرسید کی پیدائش دلّی کے معزز گھرانے میں 1817ء میں ہوئی۔ علمی و ادبی اعتبار سے گھر کا ماحول ساز گار تھا۔ جس کا اثر سرسید کی شخصیت پر بھی پڑا۔
- سرسید یہ بات جانتے تھے کہ ملک و قوم کے لیے تعلیم بہت ضروری ہے بالخصوص نوجوانوں کے لیے۔ سرسید کا خواب تھا کہ تمام ہندوستانی تعلیم یافتہ ہوں۔ نیز سائنس اور دیگر سماجی علوم سے ان کی واقفیت ہو۔

- سرسید نے اپنے رفقائے کار کے ساتھ ہمہ جہت کام کیا۔ ان کے رفقائے کار میں ڈپٹی نذیر احمد، الطاف حسین حالیؔ، محسن الملک وغیرہ شامل ہیں۔
- انھوں نے تعلیمی ادارے قائم کیے۔ "سائنٹفک سوسائٹی' قائم کی۔ جہاں سائنس اور سماجی علوم کی کتابیں اردو میں ترجمہ کرائی گئیں تاکہ ان ترجمہ شدہ کتابوں کے مطالعے سے لوگوں میں بیداری آئے۔ ان میں وسعت نظری پیدا ہو۔
- اردو ادب کے حوالے سے بھی سرسید کا نام بے حد اہم ہے۔ سرسید تحریک یا علی گڑھ تحریک کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔
- سرسید احمد خان کا جو سب سے بڑا کارنامہ ہے وہ ہندوستانیوں کو مغربی و سائنسی علوم کی طرف راغب کرنا ہے۔
- سرسید احمد خان نے اپنے مضمون "بحث و تکرار" میں بحث اور تکرار کے درمیان واضح فرق بیان کیا ہے۔ ان کے مطابق، بحث ایک تعمیری اور مثبت عمل ہے، جب کہ تکرار ایک منفی اور تخریبی رویہ ہے۔
- بحث کو تعمیری بنانے کے لیے سرسید نے کچھ اصول بھی بیان کیے ہیں، جو آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ ان کے مطابق، بحث کے دوران ادب اور تہذیب کا خیال رکھنا چاہیے۔
- سرسید کا انتقال مارچ 1898ء میں علی گڑھ میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر 81 سال تھی۔ ان کی بنائی ہوئی درس گاہ کی مسجد کے بیرونی حصے میں انھیں دفن کیا گیا۔

9.4 مشکل الفاظ

اعلیٰ مرتبت	بلند مرتبہ	Highly esteemed / Exalted
اتفاق	واقفیت، میل جول	Agreement / Unity
اختلاف	فرق، ضد، دشمنی	Disagreement / Difference
شائستہ	مہذب، باتمیز	Polite / Elegant / Decent
فقدان	کمی، کسی چیز کا دستیاب نہ ہونا	Loss / Absence / Lack
خصلت	عادت، مزاج	Nature / Trait / Disposition
تشبیہ	ایک چیز کو دوسری چیز کے مانند قرار دینا	Simile / Comparison
مختلف النوع	مختلف قسم کے	Diverse / Varied
عظیم	بڑا، بزرگ	Great / Grand
مثبت	جو منفی نہ ہو	Positive

معاصرین	ہم عصر، ہم زمانہ	Contemporaries
دانشور	عقلمند	Intellectual / Scholar
حکمت عملی	تدبیر، پالیسی	Strategy / Policy
مصلح	اصلاح کرنے والا	Reformer
مفکر	غور و فکر کرنے والا	Thinker / Philosopher
بصیرت	دانا، عقلمند	Insight / Vision
جھاگ	پانی کے بلبلے، یا غصہ و جوش کی حالت میں منہ سے جھاگ نکلنا	Foam / Froth
ٹیٹوا	گلا، حلق	Lapwing (bird)
پچھاڑ	پیٹھ کے بل زمین پر گرنا	Defeat / Overthrow / Fall
غیر مہذب	جس میں تہذیب نہ ہو، اجڈ	Uncivilized / Rude
علامت	اشارہ، نشان، سراغ	Symbol / Sign
اشرف المخلوقات	ساری مخلوق سے بزرگ تر، انسان	Best of creations (Man)
عمل	کام، فعل، قاعدہ	Action / Deed
آشکار	واضح، کھُلا ہوا	Manifest / Obvious / Clear
حقائق	حقیقت کی جمع، سچائیاں	Facts / Realities
گروہ	گروپ، جماعت	Group / Faction
شکست	ہار، مات	Defeat / Failure
تدارک	تلافی	Remedy / Rectification / Compensation
بیداری	جاگنے کی کیفیت، غفلت سے ہوش میں آنا	Awareness / Awakening
تعصب	بے جا حمایت	Prejudice / Bias
شائستہ	مہذب	Malice / Ill-feeling
کدورت	رنجش، دل کا غبار	Possibility / Probability

9.5 مشقیں

مشق 1: نیچے دیئے گئے الفاظ کے متضاد لکھیے۔

i. رات : .....

ii. سیاہ : .....

iii. آسمان : .....

iv. گناہ : .....

v. گورا : .....

مشق 2: جملے بنایئے۔

i. قلم : .....

ii. شاعر: .....

iii. علم: .....

iv. گائے: .....

v. اخبار: .....

مشق 3: خالی جگہ کو پُر کریں۔

I. انسانوں میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے اور اس کے پرکھنے کے لیے ..... ہی کسوٹی ہے۔

(a) مخالفت (b) عداوت (c) دشمنی (d) بحث و مباحثہ

2. انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتّوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے ..... کرے۔

(a) گریز (b) پرہیز (c) سامنا (d) پیچھے

3. ہمیشہ مباحثہ اور تکرار میں ..... محبت اور دوستی کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہیے۔

(a) نفرت و بغاوت (b) تہذیب و شائستگی (c) تعصب و جانبداری (d) سختی و کرختگی

4. تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے ..... کے لفظ استعمال کرو۔

(a) غصہ (b) نفرت (c) معذرت (d) عقیدت

5. ..... کو کچھ ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کہہ کر ختم کرو۔

(a) جھگڑے (b) پیار محبت (c) مار پیٹ (d) دوستی

6. آپس میں ..... مذاق کی باتوں سے دل کو ٹھنڈا کر لو۔

(a) گھُل مل (b) کھیل کود (c) کھا پی کر (d) ہنسی خوشی

7. مجلس میں دوبدو بات کرتے ہوئے.....اختیار کرو

(a) نرمی (b) سختی (c) بے رحمی (d) صلہ رحمی

8. اگر جھگڑا ہو جائے تو.....پر ہی اسے ختم کرو۔

(a) لڑائی (b) کھی نہ ملنے (c) دوستی (d) جدائی

9. تکرار میں جذبات..... غالب ہوتی ہیں۔

(a) ضد اور انا (b) دوستی (c) محبت (d) دل لگی

10. اچھی گفتگو انسان کے لیے نہایت.....ثابت ہوتی ہے۔

(a) غیر مفید (b) مفید اور کارآمد (c) غیر اہم (d) غیر مناسب

9.6 نمونہ امتحانی سوالات

9.6.1 معروضی سوالات:

1. سر سید احمد خاں کہاں پیدا ہوئے؟

(a) دہلی (b) آگرہ (c) علی گڑھ (d) پنجاب

2. :علی گڑھ یونیورسٹی کے بنیاد گزار کون ہیں؟

(a) شبلی (b) حالی (c) نذیر احمد (d) سر سید

3. رسالہ تہذیب الاخلاق کس نے نکالا؟

(a) محسن الملک (b) سر راس مسعود (c) سر سید (d) ان میں سے کوئی نہیں

4. تہذیب الاخلاق کب سے شائع ہو رہا ہے؟

1870(a) 1850(b) 1840(c) 1900(d)

5. سر سید کی وفات کب ہوئی؟

1900(a) 1898(b) 1902(c) 1905(d)

6. سائنٹفک سوسائٹی کس نے قائم کی؟

(a) انگریزی حکومت نے (b) گاندھی جی (c) ابوالکلام (d) سر سید

7. ذیل میں سے کون سا مضمون سر سید کا ہے؟

(a) بحث و تکرار (b) انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا (c) سر سید اور اردو لٹریچر (d) کوئی نہیں

8. "بحث و تکرار" کے توسط سے سر سید نے کیا پیغام دیا ہے؟

(a) آپس میں میل جول رکھو (b) آپس میں لڑائی کرو (c) ایک دوسروں کو مارو (d) دسروں کو ذلیل کرو

9. انسان لڑنے کیوں لگتے ہیں؟

(a) خود پر قابو نہ ہونے کی وجہ سے (b) جنگجو ہونے کی وجہ سے (c) بزدلی کی وجہ سے (d) کمزور ہونے کی وجہ سے

10. "بحث و تکرار" میں سر سید نے کس جانور کا ذکر کیا ہے؟

(a) بکری (b) کتا (c) گائے (d) بھینس

9.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. پانچ ایسے جملے بنایئے جس میں "اتفاق، اختلاف، بحث و مباحثہ، سر سید، علی گڑھ" الفاظ استعمال ہوں۔
2. سر سید نے اس مضمون میں کیا نکات پیش کیے ہیں؟
3. بحث و تکرار کے توسط سے سر سید نے کیا پیغام دیا ہے؟
4. اس مضمون میں کتا در اصل غیر مہذب انسانوں کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس پر اپنی رائے کا اظہار کیجیے۔
5. سر سید نے کیا کیا خدمات انجام دی ہیں۔ مختصر طور پر بیان کیجیے۔

9.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. سر سید احمد خاں کے حالات زندگی تحریر کیجیے۔
2. "بحث و تکرار" کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔
3. اس مضمون سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟ تحریر کیجیے۔

9.6.1 کے جوابات:

B (v)	A (iv)	C (iii)	D (ii)	A (i)
B (x)	A (ix)	A (viii)	A (vii)	D (vi)

اکائی10: مضمون

(ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں:ڈاکٹر زور)

اکائی کے اجزا

10.0		تمہید
10.1		مقاصد
10.2		ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں(ڈاکٹر زور)
	10.2.1	ڈاکٹر زور کا تعارف
	10.2.2	"ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں"کا متن
	10.2.3	خلاصہ
10.3		اکتسابی نتائج
10.4		مشکل الفاظ
10.5		مشقیں
10.6		نمونۂ امتحانی سوالات

10.0 تمہید

پچھلی اکائی میں آپ نے سر سید احمد خان کا لکھا ہوا مضمون "بحث و تکرار" کو پڑھا۔ اس اکائی میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا لکھا ہوا مضمون "ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں " پڑھیں گے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر زور نے محمد قلی قطب شاہ کا مختصر تعارف، کلام کی خصوصیات، منتخب نظموں اور غزلوں کے اشعار کو پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہندوستان کے رسم و رواج، تہوار، موسموں کا حال ،حیدرآباد شہر کی خوبصورتی کو محمد قلی قطب شاہ کی نظر سے دکھانے کی کوشش کی ہے۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ڈاکٹر زور کے بارے میں جان سکیں۔
- ڈاکٹر زور کے لکھے ہوئے مضمون "ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں" کے متن کا مطالعہ کر سکیں۔

- مشکل الفاظ کے معنیٰ کو سمجھ سکیں۔
- مضمون کو پڑھنے کے بعد اس کا خلاصہ پیش کر سکیں۔

10.2 ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں (ڈاکٹر زور)

10.2.1 ڈاکٹر زور کا تعارف:

ڈاکٹر زور کا پورا نام سید محی الدین قادری تھا اور زورؔ تخلص کرتے تھے۔ ڈاکٹر زور 6 دسمبر 1904 کو حیدرآباد کے محلے شاہ گنج میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر غلام محمد شاہ قادری تھے۔ جن کا تخلص زعمؔ تھا۔ ڈاکٹر زور کے اجداد تغلق حکومت کے زمانے میں دکن کے علاقے میں آئے۔

ڈاکٹر زور نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے گھر پر حاصل کی۔ گھر کی تعلیم کے بعد ابتدائی درجے میں ڈاکٹر زور کا داخلہ مدرسہ دارالعلوم میں ہوا۔ پھر سٹی ہائی اسکول میں پڑھائی کی۔ اس کے بعد عثمانیہ کالج میں زیر تعلیم رہے۔ 1925 میں بی۔ اے اور 1927 میں ایم۔ اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ایم۔ اے اچھے نمبروں سے پاس ہونے کی بنا پر حیدرآباد کی حکومت نے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ سرکاری وظیفے پر بھیجا۔ 1929 میں ڈاکٹر زور نے لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے مقالے کا موضوع آریائی زبانوں سے متعلق تھا۔ لسانیات (Linguistics) کی تحقیق میں انہوں نے نام کمایا۔ اس کے بعد اپنے وطن حیدرآباد لوٹ آئے۔

ڈاکٹر زور لندن سے آنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ جب 1950 میں چادر گھاٹ کالج بنا تو ڈاکٹر زور اس کالج کے پرنسپل بنائے گئے اور یہیں سے 1960 میں ریٹائر ہوئے۔ پڑھنے پڑھانے کے علاوہ ڈاکٹر زور حکومت ہند کی طرف سے ساہتیہ اکیڈمی کے رکن بھی بنائے گئے اور رسالہ "آج کل" دہلی سے بھی وابستہ تھے۔ کشمیر یونیورسٹی کے اردو شعبہ کے صدر اور ڈین کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ کشمیر میں دل کا دورہ پڑا۔ ماہر ڈاکٹروں نے علاج کیا لیکن انہیں بچا نہ سکے۔ 24 ستمبر 1962 کو ان کا انتقال ہوا۔ کشمیر میں دفن کیے گئے۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ ڈاکٹر زور کے اہم کارناموں میں سے ایک ادارہ ادبیات اردو کا قیام ہے۔ اس ادارے نے اردو زبان وادب کے فروغ میں مثالی کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر زور کی اہم کتابیں درج ذیل ہیں۔

اردو شہ پارے	ادبیات اردو اور تنقید نگاری	دکنی ادب کی تاریخ	داستان ادب حیدرآباد
فرخندہ بنیاد حیدرآباد	عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	ہندوستانی لسانیات	تذکرہ مخطوطات
میر محمد مومن	کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ	سیر گولکنڈہ	

10.2.2 "ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں" متن:

محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر اور اردو ادب کا سرپرست تھا۔ وہ ہندوستان کے ایک مشہور و معروف شہنشاہ اکبر کا ہم عصر تھا۔ 1565 میں پیدا ہوا۔ 15 سال کی عمر میں 1580 میں گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کا بادشاہ بنا اور صرف 47 سال کی عمر میں

1612 عیسوی میں فوت ہوا۔ لیکن اس قلیل مدت میں اس نے تورانی الاصل ہونے کے باوجود ہندوستان کی سرزمین پر ایسی یادگاریں چھوڑی ہیں جو رہتی دنیا تک اس کے نام کو اس ملک کے عاشق اور اہل ملک کے سچے بہی خواہ کی حیثیت سے زندہ رکھیں گی۔

شہر حیدرآباد اس نے بنایا۔ چارمینار کی عمارت اسی کے اعلیٰ تخیل کا نمونہ ہے۔ اور پھر اس نے اپنی آخری آرام گاہ جس گنبد کی شکل میں تعمیر کرائی تھی، اس سے بھی ہندوستان کی محبت اور اہل ہند کے کلچر اور تمدن کا احترام آج تک نمایاں ہے۔ اس نے عام اسلامی گنبدوں سے ہٹ کر ایسی وضع کا گنبد بنایا جس کا نچلا حصہ مندروں کا ہم شکل ہے اور جس سے ہند اسلامی طرز تعمیر کی ایک نئی روایت قائم ہو گئی۔ چنانچہ بعد کو حیدرآباد میں مسجدیں بھی اسی طرز پر تعمیر کی جاتی رہیں۔

محمد قلی قطب شاہ نے اردو کے علاوہ تلگو اور فارسی میں بھی شاعری کی تھی، مگر اس کا اردو کلام ہی محفوظ رہا جو جملہ اصناف سخن کے اعلیٰ نمونوں سے معمور ہے۔ یہ کلام زبان اور موضوع دونوں کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔ زبان کے لحاظ سے اس لیے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ دیسی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ دیسی الفاظ کی اسی کثرت کی بنا پر آج اربابِ ہندی محمد قلی کو زبان ہندی ہی کا شاعر سمجھتے ہیں، اردو کا نہیں۔ موضوع کے لحاظ سے اس لیے کہ اس نے عام فارسی اور اردو شاعروں کی طرح رسمی و روایتی موضوعوں پر نہیں لکھا بلکہ ایسے مضامین اور موضوعات پر بھی غزلیں نظمیں اور قصیدے لکھے جن کی طرف عام شاعروں کی نظر ہی نہیں پڑی، یا پڑی تھی تو وہ ان کو شعر و سخن کا موضوع بنانے کے قابل ہی نہیں سمجھتے تھے۔

محمد قلی قطب شاہ نے ہندوستان کے موسموں، پھلوں، پھولوں، درختوں، تہواروں اور ہندوستانی عوام کے رسم و رواج اور رہن سہن پر بڑی عمدہ عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ وہ بادشاہ ہونے کے باوصف صحیح معنوں میں ایک عوامی شاعر تھا۔ وہ زندگی کے عوامی پہلوؤں پر انہیں کی طرح نظر ڈالتا اور انہیں کی طرح دلچسپی لیتا تھا۔

حیدرآباد کو اس نے ایک اوپن گارڈن سٹی یعنی کھلے ہوئے شہر باغات کے طور پر بسایا۔ اور جب اس کے ہاتھوں کے درخت پھولے پھلے اور اس نے سڑک سے گزرتے ان کو دیکھا تو ان پھولوں اور پھلوں کی تعریف میں ایک نظم لکھی جس کے چند شعر یہ ہیں۔ جس سے اس کی زبان اور اسلوب دونوں کا اندازہ ہو سکے گا:

سڑک تھے باغ کوں دیکھت کھلے منجہ باغ کے غنچے
سو اس غنچے کے باساں سے لگیا جگمگ جگن سارا
دسے ناسک کلی چنپا بھواں دو پات ہیں تِس کے
بھنور تل دیکھ اس جاگہ ہوا حیران من سارا
اناراں میں سُہے دانے سو جوں یاقوت پتلیاں میں
ہر ایک پھل اس اناراں پر سہے سکے چمن سارا
دسیں ناریل کے پھل یوں زمّرد مرتباناں جوں
ہور اس کے تاج کوں کہتا ہے پیالہ کر دکھن سارا

دِسیں جامون کے پھل بن میں نیلم کے نمن سالم
نظر لاگے نہ تیوں میویاں کوں راکھیا ہے جتن سارا
صفت کرنے کوں سوسن بھی کھو لیا ہے دس زباں اپنی
دکھن سب سندریاں کے تیئں کھلیا نرگس نمن سارا

یعنی جب میں سڑک سے باغ کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسے کھلے ہوئے غنچے نظر آتے ہیں۔ جن کی خوشبو سے سارا جہاں مہکا ہوا ہے۔ چنپا کلی کے پھول ناک کی طرح اور اس کی پتیاں بھوؤں کی طرح ہیں۔ ان پر بھونرا تل کی طرح نظر آتا ہے۔ جس کو دیکھ کر میر ادل حیران رہ جاتا ہے۔ اناروں میں سے دانے یوں نظر آتے ہیں جیسے کانچ کی ڈبیوں میں یاقوت۔ ناریل کے پھل زمّرد کے مرتبان نظر آتے ہیں۔ ان کے تاج کو سارا دکن پیالہ کہتا ہے۔ جامن کے پھل ایک سالم نیلم کی طرح ہیں اور ان کو اس لیے باغ میں لگایا گیا ہے کہ اس چمن کو نظر نہ لگے۔ اس باغ کی تعریف کرنے کے لیے سوسن بھی اپنے دس زبانوں کے ساتھ کھلے ہیں اور نرگس کے پھول دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسینانِ دکن کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔

ہندوستانی پھلوں اور پھولوں پر محمد قلی نے اسی طرح متعدد نظموں میں اظہار خیال کیا ہے۔ ہندوستان کے موسموں، برسات، گرمی اور سردی پر بھی اس نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔ خاص کر آغازِ موسم برسات پر تو اس کی 15 نظمیں بڑی بلند پایا اور دلچسپ ہیں۔ دکن میں جس روز بارش شروع ہوتی اسے آج بھی مِرگ کا دن کہتے ہیں۔ اور مِرگ لگنا یعنی بارش شروع ہونا ایک قومی تہوار ہے۔ جسے عوام وخواص سب دھوم دھام سے مناتے ہیں۔

محمد قلی بھی یہ تہوار بڑے شوق سے مناتا تھا اور اس تہوار کو اپنی نظموں میں مرگ سال آنے کے نام سے یاد کرتا ہے مثلاً:

سہیلیاں مرگ سال آیا ہوا سوں
گرجنا اس کا سُہتا ہے اداسوں

.....

مرگ سال آئیا سر تھے مرگ نینی سنگاراں کر
جڑت مانک بھو بیٹیاں لعل موتیاں لے کے دھاراں کر

محمد قلی نے ہندوستان کی برسات کی تفصیلات جی کھول کر بیان کی ہیں۔ ایک نظم میں لکھتا ہے۔ (نظم کا خلاصہ)

آسمان پر فرشتوں نے مرگ کے مہینے کو دعوت دی اس خوشی میں سمندر کے موتیوں کو آسمان سے برسایا۔ جن سے ہمارے صحن بھر گئے۔ زمین نے سر پر جواہر کی پگڑی باندھ لی اور انگ میں کانچ کے رنگ کی چولی پہن لی۔ لعل یمن جیسی بیر بہوٹیاں تمام ملک میں نکل آئیں۔

ہر طرف ہرے بھرے جنگل دیکھ کر چاروں طرف سے مور کوک رہے ہیں۔ ہرے جنگل میں لال لال پھول نہیں ہے بلکہ زمّرد کی لگنوں میں شبنمی تیل سے شمعیں جل رہی ہیں۔

اس تازگی و طراوت کو دیکھ کر موہنیاں اپنے خوش رنگ جسموں پر رنگ برنگ کے لباس اور زیور سجائے ہوئے اپنے جوبنوں کی بہار

دکھاتے ہوئے ناز و انداز کے ساتھ محو خرام ہیں۔ ہوا کا نظارہ کرنے کے لیے مست سہیلیوں نے شراب پی لی ہے اور چنبیلی کے پھولوں میں بھنورے ملہار کے گیت گاتے پھر رہے ہیں۔

ایک اور نظم کا خلاصہ ہے:

بارش کا موسم آیا اور کلیوں کا راج شروع ہو گیا۔ اب ہری ہری ڈالیوں کے سروں پر پھولوں کے تاج پہنائے جائیں گے۔

مینھ کی بوندوں کا پیالہ ہاتھ میں لے لو کیوں کہ ہر مہ جبین نہایت سج دھج کر آئی ہے۔

جسم ٹھنڈ کی وجہ سے لرز رہے ہیں اور جوبن کپکپا رہے ہیں۔ چاروں طرف گرج کی آواز سنائی دیتی ہے اور مینہہ برستا ہے۔ عشق کے ترانوں سے موروں نے چمنوں کو معمور کر دیا ہے۔

محمد قلی نے اسی طرح موسم سرما پر بھی لکھا ہے وہ اس نظم کو اس طرح شروع کرتا ہے:

ہوا آئی ہے لے کے ٹھنڈ کالا　　پیا بن ستاتا بدن بالے بالا

اے سیتل ہوا منجہ لگے نین پیا بن　　مگر پیو کنٹھ لا کرے منجہ نہالا

ہندوستان کے مشہور تہوار بسنت پر بھی اس نے کئی نظمیں اور قصیدے لکھے ہیں۔ جن میں بسنت کھیلنے اور اس تہوار سے لطف اندوز ہونے کے رنگارنگ و مرقعے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ نظمیں موضوع کی مناسبت سے بہت رنگین اور شوخ ہیں۔

ایک نظم میں وہ اس قسم کے خیالات ظاہر کرتا ہے:

میرے مندر میں بسنت سعادت (خوش نصیبی) کی خبر لے آیا۔ اس کے آنے سے میری آنکھوں کا چمن پھولوں اور پھلوں سے معمور ہو گیا۔ بسنت کے پھول نے دوسرے تمام پھولوں کو مہمان بن کر آنے کی دعوت دی اور اس تقریب میں گلاب کو پیالہ بنا کر خدمت کرنے کی غرض سے لے آیا۔

بسنت کی روشنی سے تمام دنیا میں پھول کھل گئے۔ اور آسمان پر لال رنگ چھا گیا۔ سورج کی دھوپ میں بسنت ہی کا رنگ جھلکتا ہے۔ اور چاند کے حوض کو بسنت نے چندن بھر کے مہکا دیا ہے۔

بسنت کی وجہ سے ہر گھر میں موتیوں اور یاقوتوں کے انبار لگ گئے۔ اے معانیؔ خدا کا شکر بجالا کہ تیرے مندر (محل) میں رات اور دن خوشی اور آنند کے ساتھ بسنت منایا جاتا ہے۔

ہندوستان کے موسموں اور تہواروں کے ساتھ ساتھ محمد قلی قطب شاہ یہاں کے رسم و رواج اور کھیل کود میں ذاتی دلچسپی لیتا تھا۔ ان سے متعلق اس نے اپنی نظموں میں دلچسپ تفصیلات محفوظ کر دی ہیں۔ ہندوستانی شادیوں میں مہندی اور جلوے کی جو رنگارنگ رسمیں ہوتی ہیں، ان کی کیفیتیں کئی نظموں میں بیان کی ہیں۔ جن کے مطالعہ سے دلہنوں کے بناؤ سنگار اور محفلوں کے تکلفات واضح ہوتے ہیں کہ کس طرح ایک طرف بڑے اہتمام سے جلوے کا تخت سجایا جاتا ہے چوکیوں کو چاروں طرف سے موتیوں سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ مشاطائیں دلہن کے ہاتھوں اور پاؤں کو مہندی لگاتیں۔ کندنی کلیوں کے ہار گودے جاتے، سہیلیوں کو بھی موتیوں کے کناروں کی ساڑیاں بندھوائی جاتی۔ سات سہاگنیں مل کر دلہن کے بالوں میں تیل لگاتیں۔ کنگھی کرتیں۔ چوٹی گوندھتیں۔ مانگ میں موتی پروتیں۔ پیشانی پر چاند کا ٹیکہ لگایا جاتا۔

آنکھوں میں کاجل اور سرمے کے خط کھینچے جاتے۔ مہین کپڑے کا ایسا زریں لباس پہنایا جاتا کہ جسم اس میں سے جھلکنے لگتا۔ غرض اس طرح آراستہ و پیراستہ کر کے ساتوں سہاگنیں دلہن کو جلوے کے تخت پر لا کر بٹھاتیں۔ اور اس کے سر پر سہرہ اور گلے میں پھولوں کے ہار پہناتیں۔ دولہا اور دلہن دونوں کو شربت پلایا جاتا اور دونوں کے ہاتھوں میں پان کے بیڑے دیے جاتے۔ تاکہ ایک دوسرے کو کھلائیں۔

رسم و رواج کے سلسلے میں محمد قلی نے ہندوستانی ناٹکوں اور نٹوں کے کھیل اور رقص و سرود کی مجلسوں کی جو دلچسپیاں بیان کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح زری کی ڈوریاں گوٹوں کی طرح باندھ کر ان کے درمیان نٹ تاروں کی طرح رقص کرتے تھے۔ یہ نٹ ایسے چمکدار لباس پہنتے تھے کہ ان کا بدن سورج کی طرف چمکتا تھا۔ کانوں میں آویزے بجلیوں کی طرح چمکتے تھے۔ وہ طرح طرح کے چھند بند کر کے قلابازیاں کھاتے تھے۔ اپنے چہروں کو اس طرح بناتے تھے کہ ان کی آنکھوں کے قریب خط سرمہ ایسا نظر آتا جیسے اژدہا زبانیں نکالے کھڑا ہو۔ ان کے ہاتھ میں جگہ جگہ مہندی کے نقش ایسے نظر آتے جیسے ہرے ہرے پتوں میں لال پھول کھلے ہوں۔ اداکاری کے ساتھ ساتھ یہ ایسی باتیں کرتے کہ گویا موتی جھڑ رہے ہوں۔ قلابازیوں کے وقت ان کی پتلی کمر دیکھ کر لوگ چیتے کی کمر بھول جاتے تھے۔ یہ نٹ بھاری بھرکم ہاتھیوں کی طرح مستی اور تنومندی دکھاتے تھے۔ ان کے قد ایسے سیدھے رہتے جیسے تیر۔ جب وہ آہستہ چلتے تو پانی کی طرح آگے بڑھتے اور تیزی میں آتے تو ہوا بن جاتے تھے۔ یہ ایسے چنچل، چتر اور باکمال تھے کہ انسانوں کے علاوہ فرشتے بھی ان کا کمال دیکھنے آسمان سے اُتر آتے۔ ہندوستانی عورتوں کے کھیلوں میں محمد قلی نے پھوکڑی پھو اور ڈھان ڈھکنی کے کھیلوں پر نظمیں لکھی ہیں۔ ایک نظم میں اس کا آغاز اس طرح کرتا ہے:

سکی تال دے منجہ ٹٹکتی کھڑی
کہ ڈھاں ڈھکنی کھیل کر ہٹکتی کھڑی

آخر میں ان متعدد نظموں اور اشعار کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری ہے جن میں محمد قلی نے ہندوستان اور خاص کر دکن کی عورتوں کے سراپا لکھے ہیں۔ اور ان کے حسن و نزاکت کی مدح سرائی کی ہے اس نے ان کی خوبیوں کی بنا پر انہیں دنیا بھر کی عورتوں میں افضل قرار دیا ہے ایک جگہ لکھتا ہے:

کالیاں گوریاں سکیاں کو جگ میں جو تھیاں سو بسرا
کونلی سکی کون دیکھت میں سدہ بھولیا دکن میں

اس کے دیوان میں یوں تو دکن کی تلنگن اور برہمن مہ جبینوں پر کئی نظمیں ہیں مگر ایک نظم کا عنوان ہندی چھوری ہے جس میں عام ہندوستانی لڑکیوں کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔ اس نظم کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں۔ جن سے ہندوستان سے اس کی دلی محبت جھلکتی ہے:

رنگیلی سائیں تھے تو رنگ بھری ہے
سگڑ سندر سہیلی گن بھری ہے
لٹکنا بجلی نمنے اس سہاوے
وہ ہندی چھوری بہو چند شہ پری ہے

10.2.3 خلاصہ:

اس مضمون میں ڈاکٹر زور نے اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کے حوالے سے اس کی حب الوطنی کا اظہار کیا ہے۔ محمد قلی کتب شاہ 1565ء میں پیدا ہوا۔ 1580ء میں 15 سال کی عمر میں گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کا بادشاہ بنا اور صرف 47 سال کی عمر میں 1612ء میں وفات پا گیا۔ اتنے مختصر عرصے میں ہندوستان کے سرزمین پر جو یادگاریں چھوڑی ہیں وہ اس کے نام کو ہمیشہ یاد رکھنے کے لیے کافی ہیں۔

اس نے شہر حیدرآباد بسایا۔ چارمینار کی تعمیر اس کے اعلی تخیل کا نمونہ ہے۔ شہر حیدرآباد کو اس نے ایک اوپن گارڈن سٹی یعنی کھلے ہوئے شہر باغات کے طور پر بسایا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ نہ صرف اردو کا شاعر تھا بلکہ فارسی اور تلگو میں بھی شاعری کرتا تھا۔

وہ ایک عوامی شاعر تھا اس نے ہندوستان کے موسموں، میلوں، پھلوں، پھولوں، درختوں، تہواروں اور ہندوستانی عوام کے رسم و رواج اور رہن سہن پر عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔

دکن میں جس روز بارش شروع ہوتی ہے اسے "مِرگ کا دن" کہتے ہیں۔ مرگ لگنا یعنی بارش شروع ہونا ایک قومی تہوار ہے۔ جسے عوام و خواص دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ محمد قلی بھی یہ تہوار بڑے شوق سے مناتا تھا۔ اس تہوار پر بھی اس کی نظمیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مشہور تہوار بسنت پر بھی اس نے کئی نظمیں اور قصیدے لکھے ہیں۔

ہندوستان کے رسم و رواج، کھیل کود، شادی کی رسومات جیسے مہندی جلوہ وغیرہ کیفیتوں کو بھی اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔ ہندوستانی عورتوں کے کھیلوں میں پھوکڑی پھوا اور ڈھان ڈھکنی پر بھی اس کی نظمیں ہیں۔

محمد قلی نے اپنی نظموں میں دکنی عورتوں کے سراپا بھی لکھے ہیں۔ جس میں ان کے حسن و نزاکت کی تعریف کرتے ہوئے ان کو دنیا بھر کی عورتوں سے افضل قرار دیا ہے۔

10.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ وہ شہنشاہ اکبر کا ہم عصر تھا۔
- محمد قلی 1565 میں پیدا ہوا 15 سال کی عمر میں 1580 میں قطب شاہی سلطنت کا بادشاہ بنا اور صرف 47 برس کی عمر میں یعنی 1612ء میں انتقال کر گیا۔
- اس نے شہر حیدرآباد کی بنیاد رکھی۔ چارمینار تعمیر کروایا۔
- محمد قلی قطب شاہ نے اردو کے علاوہ فارسی اور تلگو میں بھی شاعری کی ہے۔
- محمد قلی قطب شاہ ایک عوامی شاعر تھا۔ اس نے ہندوستان کے موسموں، پھلوں، پھولوں، درختوں، تہواروں اور ہندوستانی عوام کے رسم رواج اور رہن سہن پر عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔

10.4 مشکل الفاظ

صاحب دیوان	دیوان رکھنے والا	Poet with a published collection of poetry
اجداد	دادا، پردادا، اوپر کی پیڑھیاں	Ancestors / Forefathers
لسانیات	زبان کی ساخت اور بناوٹ کا علم	Linguistics
تصنیف	اپنے ذہن سے کوئی کتاب لکھنا	Authorship / Writing
تالیف	مختلف مصنفوں کی تحریروں کو یکجا کرنا	Compilation / Composition
فوت ہونا	انتقال کر جانا	To die / Demise
بہی خواہ	بھلا چاہنے والا	Well-wisher
تمدن	شائستہ طرز معاشرت	Civilization / Culture
وضع	بناوٹ، رکھ رکھاؤ	Appearance / Attitude
طرز	طریقہ، ڈھنگ، انداز	Style / Manner
دیکھت	دیکھنا، دیکھنے	Looks / Appearance
کوں	کو	To / For
منجہ	مجھے	In / Within
باساں	خوشبوئیں، باس (بو) کی جمع (دکنی قاعدے سے)	With smell / Fragrance
لگیا	لگا	Applied / Attached
دِسے	دکھائی دے	Appears / Seems
ناسک	نازک	Nasik (City in Maharashtra, India)
بھواں	بھوں	Eyebrows
تِس	اس، اُس	Him / Her / That one
اناراں	انار کی جمع (دکنی قاعدے سے)	Pomegranates
سوجوں	جس طرح سے	Therefore / So that
تیوں	اس طرح	From / By

10.5 مشقیں

مشق 1: دیے گئے جملوں میں صحیح اور غلط کی نشاندہی کیجیے۔

i. محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ ( )

ii. اس نے شہر حیدرآباد بنایا۔ ( )

iii. محمد قلی قطب شاہ عوامی شاعر نہیں تھا۔ ( )

iv. حیدرآباد کو اس نے ایک اوپن گارڈن سٹی کے طور پر بسایا تھا۔ ( )

v. اس نے صرف اردو میں شاعری کی۔ ( )

مشق 2: دیے گئے الفاظ کے معنی لکھیے۔

i. اجداد : .....

ii. دیکھت : .....

iii. باساں : .....

iv. دسے : .....

v. تِس : .....

10.6 نمونۂ امتحانی سوالات

10.6.1 معروضی سوالات:

1. ڈاکٹر زور کا پورا نام کیا ہے؟

(a) سید محی الدین قادری (b) رفیع الدین قادری (c) حسیب الدین قادری (d) تقی الدین قادری

2. ادارہ ادبیات اردو کہاں قائم ہے؟

(a) دہلی (b) بنارس (c) علی گڑھ (d) حیدرآباد

3. سیر گولکنڈہ کس کی تصنیف ہے؟

(a) محسن الملک (b) سر راس مسعود (c) ڈاکٹر زور (d) مولوی عبدالحق

4. ڈاکٹر زور کا انتقال کب ہوا؟

1962(a) 1958(b) 1970(c) 1980(d)

5. "ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں" کے مصنف کون ہیں؟

(a) مولوی عبدالحق (b) ڈاکٹر زور (c) ولی دکنی (d) حالی

6. محمد قلی قطب شاہ کس سنہ میں پیدا ہوئے؟

1684(a) 1580(b) 1612(c) 1565(d)

7. شہر حیدرآباد کا بانی کون ہے؟

(a)محمد قلی قطب شاہ (b)جمشید قلی قطب شاہ (c)ابراہیم قطب شاہ (d)عبداللہ قطب شاہ

8. چارمینار کس نے تعمیر کروایا؟

(a)ابراہیم قطب شاہ (b)جمشید قلی قطب شاہ (c)محمد قلی قطب شاہ (d)عبداللہ قطب شاہ

9. مرگ لگنا کسے کہتے ہیں؟

(a)بارش کا پہلا دن (b) بارش کا آخری دن (c)سال کا پہلا دن (d) سورج گہن

10. محمد قلی قطب شاہ کا انتقال کب ہوا؟

1612(a) 1610(b) 1584(c) 1590(d)

10.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. ڈاکٹر زور کا تعارف پیش کیجیے۔
2. مرگ پر لکھی گئی نظموں کے بارے میں لکھیے۔
3. محمد قلی قطب شاہ نے ہندوستانی شادیوں کے رسم ورواج کو اپنی نظموں میں کس طرح پیش کیا ہے؟
4. محمد قلی قطب شاہ کس شہر کو اوپن گارڈن سٹی کے طور پر بسایا؟ چند جملوں میں بیان کیجیے۔
5. ذیل میں دیے گئے اشعار کی تشریح کیجیے۔

سڑک تھے باغ کوں دیکھت کھلے منجہ باغ ک غنچے
سو اس غنچے کے باساں سے لگیا جگمگ جگن سارا
دسے ناسک کلی چنپا بھواں دو پات ہیں تِس کے
بھنور تل دیکھ اس جاگہ ہوا حیران من سارا

10.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. محمد قلی قطب شاہ کے بارے میں لکھیے۔
2. بسنت پر لکھی گئی نظم کا خلاصہ لکھیے۔
3. "ہندوستان محمد قلی قطب شاہ کی نظر میں" کا خلاصہ لکھیے۔

10.6.1 کے جوابات:

B (v)	A (iv)	C (iii)	D (ii)	A (i)
A (x)	A (ix)	C (viii)	A (vii)	D (vi)

اکائی 11: انشائیہ

(انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا: محمد حسین آزاد)

اکائی کے اجزا

11.0		تمہید
11.1		مقاصد
11.2		"انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا"(محمد حسین آزاد)
	11.2.1	محمد حسین آزاد کا تعارف
	11.2.2	محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری
	11.2.3	"انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا"(متن)
	11.2.4	خلاصہ
11.3		اکتسابی نتائج
11.4		مشکل الفاظ
11.5		مشقیں
11.6		نمونۂ امتحانی سوالات

11.0 تمہید

انشا کے معنیٰ "پیدا کرنا، تخلیق کرنا، کسی چیز کو شروع کرنا، ابتدا کرنے کے ہیں۔ ادب میں اس لفظ کے معنی "تخلیق کرنا" کے بیان کیے گئے ہیں۔ لفظ انشا سے انشائیہ بنا ہے جسے انگریزی میں Personal Essay کہا جاتا ہے۔ کسی بھی موضوع سے متعلق شخصی خیالات و تاثرات کو شگفتہ انداز میں پیش کرنا کہ اس کے نئے پہلو سامنے آئیں اور مسرت وانبساط حاصل ہو انشائیہ کہلاتا ہے۔

انشائیہ میں کسی خاص ترتیب کے ساتھ خیالات کو بیان نہیں کیا جاتا ہے بلکہ کسی بھی موضوع پر متفرق خیالات اس انداز سے پیش کیے جاتے ہیں کہ اس سے اس شخصیت کے بارے میں خاطر خواہ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

عام طور پر انشائیہ ایک سے لے کر بیس یا تیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس میں کسی بھی موضوع پر اپنی بات لطیف اور آسان زبان میں پیش کی جاتی ہے۔ انشائیہ کے موضوعات میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔

اردو میں اس صنف کے ابتدائی نقوش ملا وجہی کی داستان "سب رس" میں ملتے ہیں۔ لیکن انشائیہ کا باقاعدہ طور پر آغاز سر سید سے ہوتا ہے۔ اردو کے اہم انشائیہ نگاروں میں "سر سید احمد خاں، محمد حسین آزاد، میر ناصر علی دہلوی، عبد الحلیم شررؔ، سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی ہیں۔

اس اکائی میں آپ مولانا محمد حسین آزاد کے انشائیہ "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" کا مطالعہ کریں گے۔

11.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مولانا محمد حسین آزاد کے بارے میں اظہار خیال کر سکیں۔
- مولانا محمد حسین آزاد کی ادبی خدمات سے واقف ہو سکیں۔
- انشائیہ "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" کے متن کا مطالعہ کر سکیں۔
- انشائیہ "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" کا خلاصہ پیش کر سکیں۔
- متن میں شامل مشکل الفاظ کے معنی سے واقف ہو سکیں۔

11.2 انشائیہ: انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا (محمد حسین آزاد)

11.2.1 محمد حسین آزادؔ کا تعارف:

مولانا محمد حسین آزاد 10 جون 1830ء کو دہلی کے ایک معزز اور صاحب علم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا مولانا محمد اکبر اپنے وقت کے جید عالم اور مجتہد تھے۔ آزاد کے والد مولوی محمد باقر مشہور صحافی اور ادیب تھے۔ انھوں نے 1836 میں ہفت روزہ اخبار "دہلی اخبار" کے نام سے جاری کیا۔ 1840 میں اسی کا نام "دہلی اردو اخبار" رکھا گیا۔ بعد میں اس کا نام "اخبار الظفر" رکھ دیا گیا تھا۔ مولوی محمد باقر محب وطن اور مغلیہ سلطنت کے خیر خواہ تھے اس لیے وہ انگریزوں کے خلاف بھی لکھا کرتے تھے۔ یہ اخبار دہلی کا مقبول ترین اخبار تھا جو 1857 تک جاری رہا۔ 1857 کی جنگ میں ناکامی کے بعد انگریزوں نے اس اخبار کی تمام کاپیاں ضبط کر کے انھیں جلا دیا اور اس کے مدیر مولوی محمد باقر کو مسٹر فرانسس ٹیلر کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرا کر انھیں سزائے موت دے دی۔

مولانا محمد حسین آزادؔ نے ابتدائی تعلیم اپنے دادا اور والد سے حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی کالج میں داخلہ لیا۔ ان کے ہم عصروں میں مولوی نذیر احمد، مولوی ذکا اللہ اور پیارے لال آشوبؔ بھی اسی کالج میں پڑھتے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے بعد آزاد نے اپنے والد کے پریس میں کام کرنا شروع کیا۔ 1857 کی جنگ کے بعد وہ پریس اور اس سے نکلنے والا اردو اخبار بھی بند ہو گیا۔ والد محمد باقر انگریزوں کے عتاب کا شکار ہو چکے تھے۔ مجبوراً محمد حسین آزاد کو دلی چھوڑنا پڑا۔ بیوی، بچوں کو سونی پت میں ایک رشتہ دار کے یہاں ٹھہرا دیا اور خود اپنی جان کی امان پانے اور روزگار کی تلاش میں لکھنؤ، مدراس اور ممبئی ہوتے ہوئے 1859 میں پنجاب پہنچ گئے۔ شروعات میں یہاں محکمہ فوجداری میں ملازمت کی، پھر کچھ دنوں تک ارسطو جاہ بہادر کے پریس میں بھی کام کیا جہاں سے "مجمع البحرین" اخبار نکلتا تھا۔ ارسطو جاہ خان بہادر محمد حسین

آزاد کے والد محمد باقر کے شاگرد تھے۔ جب ان کو محمد حسین آزاد کے بارے میں پتہ چلا کہ یہ ان کے استاد زادے ہیں تو انھوں نے آزاد کی بہت عزت افزائی کی اور انھیں کے کہنے پر آزاد نے اپنے بیوی بچوں کو بھی لاہور میں بلالیا۔ اس دوران انھوں نے کئی چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کی پھر میجر فلر کے توسط سے 1864 میں انھیں محکمہ تعلیم میں ملازمت مل گئی۔ 1864 میں "انجمن پنجاب" کا قیام عمل میں آیا تو محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر کرنل ہالرائڈ نے آزاد کو اس انجمن کا سکریٹری بنا دیا اور اس انجمن کے تحت نکلنے والے رسالے "رہنمائے پنجاب" کے ایڈیٹر بھی بنائے گئے۔ محمد حسین آزاد نے اپنی محنت اور قابلیت سے اس انجمن کو بہت کامیاب بنا دیا اس کے چرچے پورے ہندوستان میں ہونے لگے۔ اسی انجمن کے زیر اہتمام محمد حسین آزاد نے موضوعاتی نظموں کا مشاعرہ شروع کیا۔ کوئی ایک عنوان پہلے ہی بتا دیا جاتا تھا اور اسی عنوان کے تحت شعرا نظمیں لکھ کر پیش کرتے تھے۔ یہ مشاعرہ مہینے میں ایک بار ہوتا تھا جو مئی 1874 سے لے کر جولائی 1875 تک جاری رہا۔ اس مشاعرے کا مقصد شاعری میں حسن و عشق کے فرسودہ موضوعات کے بجائے فطری مناظر اور حقیقت کو پیش کرنا تھا۔ محمد حسین آزاد نے اس میں شب قدر، صبح امید، حب وطن، خواب امن، داد انصاف، گنج قناعت اور مصدر تہذیب جیسی نظمیں پیش کی تھی۔ اس کے کچھ مشاعروں میں الطاف حسین حالی نے بھی شرکت کی اور انھوں نے برکھارت، نشاط امید، حب وطن اور مناظرہ رحم و انصاف جیسی اہم نظمیں پیش کیں۔ مولانا محمد حسین آزد کی ادبی و علمی صلاحیت کے سبھی قائل تھے اسی لیے انھیں 1869 میں گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کا پروفیسر بنایا گیا۔

مولانا محمد حسین آزاد نے مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں "سخن دان فارس، دربار اکبری، دیوان ذوق، قصص ہند، اردو کا قاعدہ اور قواعد بہت اہم ہیں۔ مولانا کی علمی و ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے 1887ء میں انھیں شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا۔ ایک لمبی بیماری کے بعد 22 جنوری 1910 میں وفات پائی اور گامے شاہ کی کربلا لاہور میں دفن کیے گئے۔

11.2.2 محمد حسین آزاد کی انشائیہ نگاری:

مولانا محمد حسین آزاد ایک بہترین انشاپرداز، نقاد، تمثیل نگار، خاکہ نگار اور سیرت نگار ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ نظم گو شاعر اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ جدید اردو ادب کے بانیوں میں محمد حسین آزاد کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ علامہ شبلی نے آزاد کی ادبی خدمات کو مد نظر رکھتے ہوئے انھیں "خدائے اردو" کے لقب سے یاد کیا تھا۔

آزاد اردو ادب میں ایک صاحب طرز نثر نگار اور مشہور انشاپرداز کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کی شاہکار کتاب "آب حیات" ان کی ادبی صلاحیتوں کا آئینہ ہے۔ جس کے ذریعہ آزاد کو ایک نقاد، شاعر، سوانح نگار، تذکرہ نگار، انشاپرداز اور مورخ کی حیثیت سے پہچانا گیا۔ یہ کتاب بیک وقت اردو کی تنقید، تاریخ اور اردو شعرا کا تذکرہ ہے۔

"سخندان فارس" علم السنہ پر آزاد کی ایک اہم کتاب ہے۔ اسی طرح "دربار اکبری" ان کی تاریخ نگاری کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ جس میں شہنشاہ اکبر کے عہد کی مکمل تاریخ ادبی پیرائے میں پیش کی ہے۔

محمد حسین آزاد کی تمام تصانیف میں رنگینی، دل کشی اور شیریں نثر کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ آزاد کا کمال یہ ہے کہ جس چیز کو پیش کرتے ہیں اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ اگر خاکہ تحریر کرتے ہیں تو اس شخصیت کے خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں۔

آزاد ایک خوش فکر، خوش گو اور لطیفہ سنج انسان تھے۔ مزاج کی زندہ دلی اور شگفتگی ان کی نثر میں موجود ہے۔ ان کی تحریر میں بلا کی شوخی، رنگینی، سادگی اور پرکاری پائی جاتی ہے۔ ان کی تحریر تصنع سے پاک ہے۔ عبارت میں سادگی اور بے تکلفی سے ایک حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کے قلم کا جادو یہ ہے کہ گزرے واقعات آنکھوں کے سامنے یوں آجاتے ہیں جیسے سنیما کے پردے پر چلتی اور بولتی تصویریں۔ جذبات نگاری میں انہیں کامل قدرت حاصل ہے۔

"نیرنگ خیال" آزادؔ کے انشائیوں کا مجموعہ ہے جس کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں آٹھ اور حصہ دوم میں پانچ انشائیے ہیں۔ ابتدا میں دیباچہ اور "اُردو اور انگریزی انشاء پردازی پر کچھ خیالات" کے عنوان سے ان کا ایک مضمون شامل ہے۔ یہ مضمون نیرنگ خیال کی اشاعت سے چار سال قبل یعنی 1876ء میں انجمن مفید عام کے رسالے میں شائع ہوا۔

"نیرنگ خیال" کے آغاز میں اپنے "مضمون اُردو اور انگریزی انشا پردازی پر کچھ خیالات" میں انہوں نے یہ بتایا ہے کہ ان کے دور میں بھی اُردو انشا پردازی پر اعتراض کیے جارہے تھے۔ آزاد کے خیال میں کچھ اعتراضات درست تھے مگر کچھ چشم پوشی کے قابل تھے۔ بہر حال انگریزی کے جو مضامین ان کی نظر سے گزرے یا جن کے بارے میں انہوں نے سنا اور متاثر ہوئے انہیں اُردو کے قالب میں ڈھالنے کے لیے انہوں نے ایک اصول کو پیش نظر رکھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "جو سرگذشت بیان کرے، اس طرح ادا کرے کہ سامنے تصویر کھینچ دے اور نشتر اس کا دل پر کھٹکے... بیشک فن انشا اور لطفِ زبان تفریحِ طبع کا سامنا ہے لیکن جس طرح ہمارے متاخرین نے ایک ہی مرض کی دوا سمجھ لیا ہے انگریزی میں ایسا نہیں ہے"

اس اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نیرنگ خیال کے انشائیے لکھتے ہوئے آزاد کو فن انشا کی نزاکتوں کا احساس تھا۔ اہل فرنگ کی طرح وہ ان کی بنیاد کسی مقصد پر رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے ادبی سرمایہ سے بے خبر نہ تھے مگر متاخرین سے اختلاف بھی رکھتے تھے۔ وہ مناسب زبان کے حوالے سے خیالات کو پیش کرنا چاہتے تھے۔

انہوں نے انشا پردازی کا قاعدہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آسان اور سیدھی سادی تشبیہیں اور قریب کے استعارے استعمال کیے جائیں جو سنتے ہی سمجھ میں آجائیں۔ آزاد چاہتے تھے کہ انگریزی باغ سے نئے پودے لے کر اپنا گلزار سجایا جانا چاہیے مگر یہ تصرف خوبصورتی کے ساتھ ہو۔ وہ اپنی مشرقی روایات کو ترک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ خاکے میں اس طرح جان ڈالی جائے کہ ہندوستانی کہیں کہ میرؔ اور سوداؔ کے زمانے نے عمرِ دوبارہ پائی:

> "انگریزی روغن چڑھا کر ایسا خوش رنگ کرو کہ انگریز کہیں کہ ہندوستان میں شیکسپیئر کی روح نے ظہور کیا۔"

آزادؔ اُردو کے اولین محقق، ادبی مورخ، نقاد، رمز نگار، ڈرامہ نویس، لسانی مفکر، موادِ تدریس کے مصنف اور جدید اُردو شاعری کے اولین معمار بھی ہیں۔ ان کی شخصیت کا ہر پہلو لازوال خصوصیات کا حامل ہے لیکن ان کی انشا پردازی ان کی تمام خصوصیات پر فوقیت رکھتی

ہے اور نیرنگ خیال ان کی انشا پردازی کا شاہکار ہے۔

(نیرنگ خیال) آزاد کا یہ گرانقدر ادبی کارنامہ آب حیات کے ساتھ 1880ء میں شائع ہوا جس کے زیادہ تر انشائیے 75 سے 80 کے درمیان لکھے گئے۔ دیباچہ 1875ء میں لکھا گیا۔ مجموعے کا آخری انشائیہ " شہرت عام بقائے دوام کا دربار" جولائی 1876 میں لکھا گیا جب کہ پانچواں انشائیہ "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" جون 1879ء میں شائع ہوا۔ حالانکہ یہ زمانہ آزاد پر بہت سخت گذرا۔ ان کے دو خورد سال بچے محمد باقر اور محمد اکبر نے اسی زمانے میں وفات پائی۔ فروری 1877ء میں آزاد کی پھوپھی کا انتقال ہوا جنھوں نے ان کی پرورش کی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ مجموعہ کافی دیر سے یعنی 1880 میں شائع ہو سکا۔

11.2.3 "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" (متن)

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اب اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔

ایک اور حکیم اس لطیفے کے مضمون کو اور بھی بالاتر لے گیا ہے۔ وہ کہتا کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔

میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا، اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آگئی۔ خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان افلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہل عالم اپنے اپنے رنج والم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں چنانچہ اس مطلب کے لیے ایک میدان کہ میدان خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا تجویز ہوا اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ کھڑا تھا اور ان کے تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے لیکن جو بوجھ گرتا ہے مقدار میں اور بھی بڑا ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا۔

ایک شخص سوکھا سہما۔ دبلاپے کے مارے فقط ہوا کی حالت ہو رہا تھا اس انبوہ میں نہایت چالاکی اور پھرتی سے پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بڑی معلوم ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے تھا۔ جس کا دامن دامن قیامت سے بندھا ہوا تھا اس پر دیوزادوں اور جنات کی تصویریں زردوزی سے کڑھی ہوئی تھیں۔ اور جب وہ ہوا سے لہراتی تھیں تو ہزاروں عجیب وہ غریب صورتیں اس پر نظر آتی تھیں، اس کی آنکھ وحشیانہ تھی مگر نگاہ میں افسردگی تھی، اور نام اس کا وہم تھا۔ ہر شخص کا بوجھ۔ بندھواتا تھا اور لدواتا تھا اور مقام مقررہ پر لے جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جنسوں اور ہم صورت بھائیوں کو جب بوجھوں کے نیچے گڑ گڑاتا دیکھا اور ان مصیبتوں کے انبار کو خیال کیا تو بہت گھبرایا اور دل میں ایسا ترس آیا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اس نے ذرا میرا دل بہلایا۔ صورت بہلاوے کہ یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص پرانے سے چکن کے چغے میں ایک بھاری سی گٹھری لے آتا ہے۔ جب وہ گٹھری انبار میں پھینکی تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دوڑا آتا تھا، بدن سے پسینہ بہتا تھا، اور مارے بوجھ کے ہانپتا جاتا تھا، اس نے بھی وہ بوجھ سر سے پھینکا۔ اور معلوم ہوا کہ اس کی جورو بہت بری تھی۔ اس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔

ان کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جس کی تعداد کا شمار نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے۔ ان کے سروں پر دودِ آہ کی گٹھریاں تھیں کہ انہی میں آہوں کے تیر خیالی اور نالوں کے نیزۂ وبالی دبے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اس طرح درد سے آہیں بھرتے تھے کہ گویا اب سینے ان کے پھٹ جائیں گے لیکن تعجب یہ ہے کہ جب اس انبار کے پاس آئے تو اتنا نہ ہو سکا کہ ان بوجھوں کو سر سے، پھینک دیں۔ کچھ جدوجہد سے سر ہلایا۔ مگر جس طرح لدے ہوئے تھے اسی طرح چلے گئے۔ بہت بڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جھریاں پھینک رہی تھیں۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت کچھ موٹے موٹے ہونٹ۔ اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکتے تھے کہ جنھیں دیکھ کر شرم آتی تھی مگر مجھے یہ ہی حیرت تھی کہ اس پہاڑ میں سب سے زیادہ جسمانی عیب تھے۔ ایک شخص کو دیکھتا ہوں کہ اس کی پیٹھ پر بھاری سے بھاری اور بڑے سے بڑا بوجھ ہے۔ مگر خوشی خوشی اٹھائے چلا آتا ہے۔ جب پاس آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک کبڑا ہے۔ اور آدم زاد کے انبار رنج والم میں اپنے کبڑے پن کو پھینکنے آیا ہے۔ کہ اس کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی مصیبت نہیں، اس انبار میں انواع واقسام کے سقیم اور امراض بھی تھے جن میں بعض اصلی تھے اور بعض ایسے تھے کہ غلط فہموں نے خواہ مخواہ انہیں مرض سمجھ لیا تھا۔ ایک بوجھ مجھے اور نظر آیا جو امراض آدم زاد پر عارض ہوتے ہیں۔ ان سب کا مجموعہ تھا۔ یعنی بہت سے حسین نوجوان تھے کہ اپنے ہاتھوں کی کمائی یعنی امراض نوجوانی ہاتھوں میں لیے آتے تھے۔ مگر میں فقط ایک ہی بات میں حیران تھا، اور وہ یہ تھی کہ اتنے بڑے انبار میں کوئی بیوقوفی یا بد اطواری پڑی ہوئی نہ دکھائی دی۔ میں یہ تماشے دیکھتا تھا اور دل میں کہتا تھا کہ اگر ہوس ہائے نفسانی اور ضعف جسمانی اور عیوب عقلی سے کوئی نجات پانی چاہے تو اس سے بہتر موقع نہ ہاتھ آئے گا۔ کاش کہ جلد آئے اور پھینک جائے۔ اتنے میں ایک عیاش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے بے پرواہ چلا آتا ہے اس نے بھی ایک گٹھری پھینک دی مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک گیا۔ ساتھ ہی ایک چھٹے ہوئے شہدے آئے۔ میں سمجھا کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکیں گے مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم وحیا کو پھینک گئے۔

جب تمام بنی آدم اپنے بوجھوں کا وبال سر سے اتار چکے تو میاں وہم کہ جب سے اب تک اس مصروفیت میں سرگرداں تھے مجھے الگ کھڑا دیکھ کر سمجھے کہ یہ شخص خالی ہے۔ چنانچہ اس خیال سے میری طرف جھکے ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میرے حواس اڑ گئے، مگر انہوں نے جھٹ اپنا آئینہ سامنے کیا مجھے اپنا منھ اس میں ایسا چھوٹا معلوم ہوا کہ بے اختیار چونک پڑا۔ برخلاف اس کے بدن اور قد وقامت ایسا چوڑا چکلا نظر آیا کہ جی بیزار ہو گیا، اور ایسا گھبرایا کہ چہرے کو نقاب کی طرح اتار کر پھینک دیا اور خاص خوش نصیبی اس بات کو سمجھا کہ ایک شخص نے اپنے چہرے کو بڑا اور اپنے بدن پر ناموزوں سمجھ کر اتار پھینکا تھا۔ یہ چہرہ حقیقت میں بہت بڑا تھا، یہاں تک کہ فقط اس کی ناک میرے سارے چہرے کے برابر تھی۔

ہم اس انبوہ پر آفات پر غور سے نظر کر رہے تھے اور اس عالم ہیولائی کی ایک ایک بات کو تاک تاک کر دیکھ رہے تھے۔ جو سلطان افلاک کی بارگاہ سے حکم پہنچا کہ اب سب کو اختیار ہے جس طرح چاہیں اپنے اپنے رنج وتکلیف تبدیل کر لیں، اور اپنے اپنے بوجھ لے کر گھروں کو چلے جائیں۔ یہ سنتے ہی میاں وہم پھر مستعد ہوئے اور پھر بڑی ترت پھرت کے ساتھ اس انبار عظیم کے بوجھ باندھ باندھ کر تقسیم کرنے لگے۔ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ سنبھالنے لگا اور اس طرح کی ریل پیل اور دھکم دھکا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں۔

ایک پیر مرد کہ نہایت معزز محترم معلوم ہوتا تھا درد قولنج سے جان بلب تھا اور لاولدی کے سبب سے اپنے مال و املاک کے لیے ایک وارث چاہتا تھا اس نے درد مذکور کو پھینک کر ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو لیا مگر لڑکے نابکار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دق ہو کر اس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس نالائق نوجوان نے آتے ہی جھٹ بڈھے کی ڈاڑھی پکڑ لی اور سر توڑنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا کہ اب وہ درد قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا۔ چنانچہ بڈھے نے اس سے کہا کہ برائے خدا میرا درد قولنج مجھے پھیر دیجیے اور اپنا لڑکا لیجیے کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ مبادلہ اب پھر نہ سکتا تھا۔

ایک بچارہ جہازی غلام تھا کہ اس نے قید زنجیر اور جہازی محنت کی تکلیف سے دق ہو کر اس عذاب کو چھوڑا تھا اور جھولے کے مرض کو لے لیا تھا۔ اسے دیکھا کہ دو قدم چل کر بیٹھ گیا ہے اور سر پکڑ کر بسور رہا ہے۔

غرض اسی طرح کئی شخص تھے کہ اپنی حالت میں گرفتار تھے، اور اپنے کیے پر پچھتا رہے تھے۔ مثلاً کسی بیمار نے افلاس لے لیا تھا، وہ اس سے ناراض تھا۔ کسی کو بھوک نہ لگتی تھی، وہ اب جوع البقر کے مارے پیٹ کو پیٹ رہا تھا ایک شخص نے فکر سے دق ہو کر اسے چھوڑا تھا اب وہ درد جگر کا مارا لوٹ رہا تھا اور اسی طرح برعکس۔ غرض ہر شخص کو دیکھ کر عبرت اور پشیمانی حاصل ہوئی تھی۔

عورتیں بچاری اپنے ادل بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے تو سفید بالوں کو چھوڑا تھا۔ مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہو گیا تھا کہ لنگڑاتی تھی اور ہائے ہائے کرتی چلی جاتی تھی۔ کسی کی پہلے کمر تخ پتلی تھی مگر چونکہ سینہ اور بازو بھی دبلے تھے، اس لیے پتلی کمر کو چھوڑا تھا۔ اب گول گول باردوں کے ساتھ بڑی سی توند نکالے چلی جاتی تھی۔ کسی نے چہرے کی خوبصورتی لی تھی مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا داغ اور بدنامی کا ٹیکا بھی چلا آیا تھا۔ غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے پہلے نقص کی نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہو رہا ہو۔ ان سب کی حالتوں کو دیکھ کر یہ میری سمجھ میں آیا کہ جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں۔ وہ حقیقت میں ہمارے سہارنے کے بموجب ہوتی ہیں یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے۔

مجھے اس بڈھے کے حال پر نہایت افسوس ہوا کہ ایک خوبصورت سجیلا جوان بن کر چلا۔ مگر مثانہ میں ایک پتھری ہو گئی کہ اب بھی سیدھی طرح نہ چل سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اس نوجوان کے حال پر افسوس آتا تھا کہ بچارا لکڑی ٹیکتا گرتا پڑتا چلا جاتا تھا۔ کمر جھکی ہوئی۔ گردن بیٹھی ہوئی تھی کھوئے ہوئے سر سے اونچے نکل آئے تھے اور جو عورتیں پہلے اس کی سج دھج پر جان دیتی تھیں ان کا غول گرد تھا۔ یہ انھیں دیکھتا تھا اور پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ جب سب کے مبادلے بیان کیے ہیں تو اپنے مبادلے سے بھی مجھے صاف نہ گزرنا چاہیے، چنانچہ اس کی صورت حال یہ ہے کہ بڑے چہرے والے یار میرے چھوٹے چہرے کو لے کر ایسے بدنما معلوم ہونے لگے کہ جب میں نے ان کی طرف دیکھا تو اگرچہ میرا ہی چہرہ تھا۔ مگر میں بے اختیار ہنسا کہ میری اپنی بھی صورت بگڑ گئی اور صاف معلوم ہوا کہ وہ بچارا میرے ہنسنے سے شرما گیا مگر مجھے بھی اپنے حال پر کچھ فخر کی جگہ نہ تھی۔ کیوں کہ جب میں اپنی پیشانی سے عرق ندامت پوچھنے لگا تو وہاں تک ہاتھ نہ پہنچ سکا، چہرہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ ہاتھ رکھتا کہیں تھا اور جا پڑتا کہیں تھا۔ ناک اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ جب چہرے پر ہاتھ پھیرا تو کئی دفعہ ہاتھ نے ناک سے ٹکر کھائی۔ میرے پاس ہی دو آدمی اور بھی تھے کہ جن کے حال پر تمسخر کرنا واجب تھا۔ ایک تو وہ شخص تھا کہ پہلے ٹانگوں کے مٹاپے کے سبب سے چھدرا کر چلتا تھا۔ اس نے ایک لم ٹنگو سے مبادلہ کر لیا تھا کہ جس میں پنڈلی معلوم نہ ہوتی تھی۔ ان دونوں کو جو دیکھتا تھا وہ ہنستا تھا۔ ایک تو ایسا معلوم

ہوتا تھا۔ گویا دو بلیوں پر چلا جاتا ہے، سر کا یہ عالم تھا گویا ہوا میں اڑا جاتا ہے اور دوسرے کا یہ حال تھا کہ دونوں طرف دو دائرے کھینچے چلے جاتے تھے۔ میں نے اس عجیب الخلقت کی حالت غریب کو دیکھ کر کہا کہ میاں اگر دس قدم سیدھے چلے جاؤ تو سوا دمڑی کی ریوڑیاں کھلاتے ہیں۔

غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہو گیا۔ مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا۔ یعنی جان سے بیزار تھے اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے اوپر تلے دوڑتے پھرتے تھے۔ سارا میدان گریہ وزاری نالہ و فریاد آہ و افسوس سے دھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر سلطان افلاک کو بیکس آدم زاد کے حال دردناک پر رحم آیا، اور حکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اتار کر پھینک دیں، پہلے ہی بوجھ انھیں مل جائیں۔ سب نے خوشی خوشی ان وبالوں کو سر و گردن میں سے اتار کر پھینک دیا۔ اتنے میں دوسرا حکم آیا کہ وہم جس نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا وہ شیطان نابکار یہاں سے دفع ہو جائے۔ اس کی جگہ ایک فرشتہ رحمت آسمان سے نازل ہوا۔ اس کی حرکات و سکنات نہایت معقول و باوقار تھیں اور چہرہ بھی سنجیدہ اور خوش نما تھا۔ اس نے بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھایا اور رحمت الٰہی پر توکل کر کے نگاہ کو اسی کی آس پر لگا دیا اس کا نام صبر و تحمل تھا۔ ابھی وہ اس کوہ مصیبت کے پاس آکر بیٹھا ہی تھا جو کوہ مذکور خود بخود سمٹنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ گھٹتے ایک تلث رہ گیا۔ پھر اس نے ہر شخص کو اصلی اور واجبی بوجھ اٹھا اٹھا کر دینا شروع کیا اور ایک ایک کو سمجھاتا گیا کہ نہ گھبراؤ اور بردباری کے ساتھ اٹھاؤ ہر شخص لیتا تھا اور اپنے گھر کو راضی رضامند چلا جاتا تھا۔ ساتھ ہی اس کا شکریہ ادا کرتا تھا کہ آپ کی عنایت سے مجھے اس انبار لاانتہا میں سے اپنا بار مصیبت چننا نہ پڑا۔

(نیرنگ خیال حصہ اول از محمد حسین آزاد، ص57)

11.2.4 خلاصہ:

مولانا محمد حسین آزاد کا یہ انشائیہ "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" ان کی کتاب نیرنگ خیال حصہ اول میں شامل ہے۔ پہلی مرتبہ یہ کتاب 1880ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا پانچواں انشائیہ "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" جون 1877ء میں شائع ہوا ہے جو ہمارے نصاب میں شامل ہے۔

آزاد نے اس انشائیہ کو تمثیلی انداز میں لکھا ہے۔ وہ اپنی بات سقراط حکیم کے اس قول "اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اب اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔" سے شروع کرتے ہیں اور پھر ایک اور مفکر کا قول نقل کرتے ہیں کہ "اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا۔"

وہ کہتے ہیں کہ میں دونوں حکیموں کے افکار کو سمجھنے میں اتنا غرق ہوا مجھے نیند آگئی اور خواب میں دیکھتا ہوں کہ دنیا کے سلطان کا دربار لگا ہوا ہے اور ایک منادی ندا دے رہا ہے کہ تمام لوگ اپنی اپنی مصیبتوں اور غموں کا بوجھ اس میدان میں ڈالتے جائیں۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ دیکھتے دیکھتے میدان لوگوں کے بوجھ سے بھر گیا۔ اور پہاڑ کے مانند نظر آنے لگا۔

آزاد کہتے ہیں کہ آج دنیا میں ہر شخص پریشان ہے۔ ہر ایک کو اپنی مصیبت بڑی اور دوسروں کی پریشانیاں ہلکی نظر آتی ہیں۔ جب

کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے یہ صرف لوگوں کا وہم ہے۔ وہ اپنے ایک خواب کے سہارے لوگوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ کسی کی مصیبت بڑی اور چھوٹی نہیں ہوتی ہے۔ پریشانی اور غم تو زندگی کا حصہ ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد نے اس انشائیے کے ذریعہ ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان پر جو کوئی بھی پریشانی اور بلا آتی ہے وہ اتنی ہی ہوتی ہے جس کو برداشت کرنے کی طاقت قدرت نے اسے عطا کی ہے۔ جب تمام لوگ اپنی اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کا بوجھ لا کر اس میدان میں ڈالنے لگے تو ان مصیبتوں کا ایک پہاڑ بن گیا۔ یعنی دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو پریشاں حال نہیں۔ کوئی مال و دولت نہ ہونے کا شکوہ کر رہا ہے تو کسی کے پاس بیماریوں نے گھر کر لیا ہے۔ کوئی اولاد پا کر پریشان ہے تو کسی کو اولاد کے نہ ہونے کا دکھ ستائے جا رہا ہے۔ کوئی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہا ہے تو کوئی اپنی بیوی کی وجہ سے اذیت میں مبتلا ہے۔ اس میں غور کرنے والی بات یہ ہے کہ لوگ اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کا بوجھ تو لا کر پھینک رہے ہیں لیکن ان بری خصلتوں اور عادت و اطوار کو نہیں پھینک رہے ہیں جس سے کہ وہ تمام مصیبتیں خود بخود آجاتی ہیں۔ لوگ گناہوں کا انبار تو اپنے سر سے ہٹانا چاہتے ہیں لیکن ان حرکت و عمل سے باز نہیں آنا چاہتے جس سے کہ گناہوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کہانی کا جو راوی ہے وہ ایک تمنا بھری نظروں سے لوگوں کی طرف دیکھ رہا ہے اور اپنے دل میں سوچ رہا ہے کہ "اگر ہوس ہائے نفسانی اور ضعف جسمانی اور عیوب عقلی سے کوئی نجات پانی چاہے تو اس سے بہتر موقع نہ ہاتھ آئے گا۔ کاش کہ جلدی آئے اور پھینک جائے۔" لیکن راوی کو مایوسی ہوتی ہے اور ایسا ایک بھی شخص نہیں آتا ہے جو اپنے برے اعمال و کردار کو مصیبت سمجھ کر اس سے چھٹکارا پانا چاہے۔

جب تمام لوگ اپنی اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کا بوجھ ایک جگہ لا کر جمع کر دیتے ہیں تو پھر انھیں یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی اپنی پریشانیوں کو ایک دوسرے سے بدل لیں۔ لوگ ایسا ہی کرتے ہیں پھر تھوڑی ہی دیر میں انھیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ ان کی پہلی والی مصیبت ہی بہتر تھی۔ دوسرے کی مصیبت کو ہلکا سمجھ کر اسے اپنی پہلی مصیبت سے تبدیل کرنے پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے اور وہ پہلے کے مقابلے اور زیادہ پریشان رہنے لگتے ہیں۔ تو پھر انھیں حکم دیا جاتا ہے کہ تم لوگ چاہو تو اپنی پہلی مصیبت اور درد و غم لے لو۔ اس حکم پر سب لوگ خوش ہو جاتے ہیں اور خوش و خرم ہو کر اپنی پہلی مصیبت کو لے کر چلے جاتے ہیں۔

یہ بظاہر ایک خیالی کہانی ہے جو تمثیلی پیرایہ میں پیش کی گئی ہے۔ تمثیلی انداز کی کہانیاں لکھنے کی روایت نہ صرف اردو بلکہ مختلف زبانوں کے قدیم ادب میں بھی رہی ہے۔ اس کا مقصد لوگوں کو نصیحتیں کرنا اور ان کے اخلاق و عادات کو سنوارنا تھا۔ اس انشائیہ کا مقصد بھی وہی ہے۔ تمثیل کا مطلب ہوتا ہے غیر مرئی اشیا کو متشکل کر کے پیش کرنا اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خیالات و احساسات کو کردار کے شکل میں پیش کرنا، جیسے کہ اس انشائیہ میں درد، مصیبت، غم، بھوک، برائی، افلاس جیسے کیفیات کو مجسم کیا گیا ہے اور وہم کو کردار کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

آزاد کا یہ انشائیہ "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" ایک دلچسپ تحریر ہے جو انسان کی فطرت اور عدم اطمینان کی کیفیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ ساتھ ہی انسانوں کو غور و فکر پر مجبور کرتی ہے کہ ہمیں ہر حال میں شکر گزار رہنا چاہیے۔ اور صبر و تحمل سے رہنا چاہیے۔ اس انشائیہ سے ہمیں درس ملتا ہے کہ کس طرح انسان اپنی زندگی کو خوشگوار بنا سکتا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کی زبان نہایت سادہ اور دلکش ہے۔ وہ اپنے خیالات کو بہت ہی سادہ انداز اور خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں، جس سے پڑھنے والے کی دل چسپی بنی رہتی ہے۔ ان کی زبان میں تصنع اور پُرکاری کے باوجود بھی سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔

11.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- مولانا محمد حسین آزاد اردو ادب میں انشائیہ نگار، تذکرہ نگار، ڈرامہ نگار، مضمون نگار، نظم نگار، مکتوب نگار، مورخ اور محقق کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ صاحب طرز انشاپرداز ہیں اور انشاپردازی ان کی شناخت ہے۔
- مولانا محمد حسین آزاد 10 جون 1830ء کو دہلی کے ایک معزز اور صاحب علم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اور ایک طویل بیماری کے بعد 1910 میں ان کا انتقال ہوا۔
- مولانا محمد حسین آزاد نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں "آب حیات، سخن دان فارس، دربار اکبری، دیوان ذوق، قصص ہند، اردو کا قاعدہ اور نیرنگ خیال" بہت اہم ہیں۔
- آزادؔ کی اہم کتابوں میں سے ایک "آب حیات" ہے جو اردو شعرا کے حالات زندگی اور ادبی خدمات پر مشتمل ہے۔
- نیرنگ خیال مولانا محمد حسین آزادؔ کے انشائیوں کا مجموعہ ہے جس کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں آٹھ اور حصہ دوم میں پانچ انشائیے ہیں۔ حصہ اول ان کی زندگی میں ہی شائع ہو گیا تھا جب کہ حصہ دوم ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔
- نیرنگ خیال کے مضامین انگریزی مضامین کا ترجمہ ہیں لیکن محمد حسین آزاد نے اس میں اپنی سحر بیانی اور انشاپردازی کے ایسے جوہر دکھائے ہیں کہ یہ ترجمہ نہ ہو کر تخلیق کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔
- آزاد کا ایک مشہور اور دل چسپ انشائیہ "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" ہے۔ جس میں انہوں نے انسانی فطرت اور اس کی عدم اطمینان کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ جو ہمارے نصاب میں شامل ہے۔
- اس انشائیہ کو آزاد نے تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ انسانی مشکلات کا نہایت دلچسپ اور سلیس زبان میں بیان کیا ہے۔
- مجرد خیالات کو شکل دینے کا نام تمثیل ہے۔ تمثیل کے ذریعہ جو کہانی پیش کی جاتی ہے اس کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔
- 1857 کے بعد محمد حسین آزاد کی زندگی مشکلات سے دوچار رہی۔ پنجاب کے محکمہ تعلیم میں ملازمت کے بعد ان کی زندگی میں سکون آیا اور یہیں سے انھوں نے اپنی علمی و ادبی زندگی کی باقاعدہ شروعات کی۔
- محمد حسین آزاد کا ایک اہم کارنامہ "انجمن پنجاب" کے زیر اہتمام موضوعاتی مشاعرے کا انعقاد کرنا ہے۔ اس کے اردو ادب میں دور رس نتائج مرتب ہوئے۔
- ہر انسان اپنی مصیبت کو بڑی اور دوسروں کی پریشانیوں کو ہلکا سمجھتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اتنی ہی تکلیف دی جاتی ہے جتنی وہ اس کو سہنے کی طاقت و قوت رکھتا ہے۔

- محمد حسین آزاد نے ہمیں یہ پیغام دیا ہے کہ ہر حال میں شکر گزار رہنا چاہیے۔ کبھی بھی کسی پریشانی کو دیکھ کے شکوہ زبان پر نہیں لانا چاہیے بلکہ صبر و تحمل کا دامن تھامے رہنا چاہیے اسی میں انسانوں کی بھلائی ہے۔

11.4 مشکل الفاظ

محقق	تحقیق کرنے والا	Researcher / Scholar
سوانح نگار	لکھنے والا	Biographer
وسعت دینا	پھیلانا	To expand / To broaden
انبوہ	مجمع	Crowd / Multitude
مقام مقررہ	مقرر کی ہوئی جگہ	Fixed place / Appointed spot
انبار	ڈھیر	Heap / Pile
ایک ثلث	ایک تہائی	One third
نابکار	جو کسی کام کا نہ ہو	Wicked / Evil-doer
افلاک	فلک کی جمع، آسمان	Skies / Heavens
تمثیل	کسی فکر و خیال کو شکل دے کے بیان کرنا	Allegory / Simile / Representation
بردبار	برداشت کرنے والا، نرم مزاج والا	Patient / Tolerant
وحشیانہ	وحشیوں کی طرح، غیر مہذب آدمی کی طرح	Brutal / Savage
راوی	کہانی کو بیان کرنے والا، روایت کرنے والا	Narrator / Storyteller
متشکل	شکل اختیار کرنا	Shaped / Formed
مجسم	سراپا، شکل و صورت	Embodied / Incarnate
دردِ قولنج	پیٹ کا شدید درد	Colic pain
دوررس	دور تک اثر انداز ہونے والا	Far-reaching

11.5 مشقیں

مشق 1: ذیل میں دیے گئے اقتباس کو پڑھ کر سوالوں کے جواب دیجیے۔

غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہو گیا۔ مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا۔ یعنی جان سے بیزار تھے

اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے اوپر تلے دوڑتے پھرتے تھے۔ سارا میدان گریہ وزاری نالہ و فریاد آہ وافسوس سے دھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر سلطان افلاک کو بیکس آدم زاد کے حال دردناک پر رحم آیا، اور حکم دیا کہ اپنے اپنے بوجھ اتار کر پھینک دیں، پہلے ہی بوجھ انھیں مل جائیں۔ سب نے خوشی خوشی ان وبالوں کو سر د گردن میں سے اتار کر پھینک دیا۔ اتنے میں دوسرا حکم آیا کہ وہم جس نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا وہ شیطان نابکار یہاں سے دفع ہو جائے۔ اس کی جگہ ایک فرشتہ رحمت آسمان سے نازل ہوا۔ اس کی حرکات و سکنات نہایت معقول و باوقار تھیں اور چہرہ بھی سنجیدہ اور خوش نما تھا۔ اس نے بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھایا اور رحمت الٰہی پر توکل کر کے نگاہ کو اسی کی آس پر لگا دیا اس کا نام صبر و تحمل تھا۔ ابھی وہ اس کوہ مصیبت کے پاس آکر بیٹھا ہی تھا جو کوہ مذکور خود بخود سمٹنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ گھٹتے ایک ثلث رہ گیا۔ پھر اس نے ہر شخص کو اصلی اور واجبی بوجھ اٹھا اٹھا کر دینا شروع کیا اور ایک ایک کو سمجھاتا گیا کہ نہ گھبراؤ اور بردباری کے ساتھ اٹھاؤ ہر شخص لیتا تھا اور اپنے گھر کو راضی رضامند چلا جاتا تھا۔ ساتھ ہی اس کا شکریہ ادا کرتا تھا کہ آپ کی عنایت سے مجھے اس انبار لاانتہا میں سے اپنا بار مصیبت چننا نہ پڑا۔

I. سارا انبار کن لوگوں کے درمیان تقسیم ہو گیا؟

.....

.....

II. سلطانِ افلاک کو کس پر رحم آیا؟

.....

.....

III. رحمت کے فرشتے نے کیا کہا؟

.....

.....

IV. اس اقتباس سے آپ نے کیا سیکھا؟

.....

.....

مشق 2: خالی جگہوں کو پر کیجیے۔

I. مولانا محمد حسین آزاد..... کو دہلی کے ایک معزز اور صاحب علم گھرانے میں پیدا ہوئے۔

II. آزاد کی مشہور کتابوں میں "آب حیات،....، دربار اکبری، دیوان ذوق، قصص ہند، اردو کا قاعدہ اور ....." بہت اہم ہیں۔

III. انسانی مشکلات کا نہایت.....اور سلیس..... میں بیان کیا ہے۔

IV. آزاد نے ہمیں یہ.....دیا ہے کہ ہر حال میں شکر.....رہنا چاہیے۔

مشق 3۔ درج ذیل الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

آب حیات :.....

مشکلات و پریشانی :.....

سوانح نگار :.....

محمد باقر :.....

حکیم سقراط :.....

نیرنگ خیال :.....

11.6 نمونہ امتحانی سوالات

11.6.1 معروضی سوالات:

1۔ محمد حسین آزاد کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی؟

(a) 1930 (b) 1830 (c) 1810 (d) 1880

2۔ محمد حسین آزاد لاہور میں کس زبان کے استاد تھے؟

(a) انگریزی (b) عربی (c) ترکی (d) اردو

3۔ ان میں سے کون سی کتاب محمد حسین آزاد کی نہیں ہے؟

(c) جل ترنگ (b) آب حیات (c) سخن دان فارس (d) نیرنگ خیال

4۔ "نیرنگ خیال" کتنے حصوں پر مشتمل ہے؟

(a) تین (b) چار (c) دو (d) پانچ

5۔ محمد حسین آزاد کے والد کا کیا نام تھا؟

(c) محمد باقر (b) آغا خان (c) ثروت حسین (d) محمد طاہر

6۔ محمد حسین آزاد کے استاد کا کیا نام تھا؟

(c) محمد اقبال (b) شیخ ابراہیم ذوق (c) بہادر شاہ ظفر (d) حیدر علی آتش

7۔ "سخندان فارس" کس کی تصنیف ہے؟

(c) محمد حسین آزاد (b) حبیب تنویر (c) نذیر احمد (d) الطاف حسین حالی

8۔ "نیرنگ خیال" کس صنف کی کتاب ہے؟

(c) ناول (b)داستان (c)انشائیہ (d)افسانہ

9۔ "انشاپردازی" کس کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے؟

(c) مومن خاں مومن (b) شیخ ابراہیم ذوق (c)امام بخش ناسخ (d)محمد حسین آزاد

10۔ محمد حسین آزاد کے معاصر کون نہیں تھے؟

(a)حالی (b)سرسید (c)نذیر احمد (d) ابن انشا

11.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ محمد حسین آزاد کا تعارف پیش کیجیے۔

2۔ "نیرنگ خیال" سے متعلق اپنی معلومات پیش کیجیے۔

3۔ "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" کے موضوع کی وضاحت کیجیے۔

4۔ "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" کے اسلوب پر اظہار خیال کیجیے۔

5۔ "نیرنگ خیال" کے مضامین کو کتنے حصوں میں بانٹا گیا ہے؟ بیان کیجیے۔

11.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ انشائیہ "انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" کا خلاصہ بیان کیجیے۔

2۔ انشائیہ کے فنی خصوصیات پر اظہار خیال کیجیے۔

3۔ محمد حسین آزاد کے تصانیف کا تعارف پیش کیجیے۔

11.6.1 کے جوابات:

A (v)	C (iv)	A (iii)	B (ii)	B (i)
D (x)	D (ix)	C (viii)	A (vii)	B (vi)

اکائی 12: انشائیہ

(جھینگر کا جنازہ: خواجہ حسن نظامی)

اکائی کے اجزا

12.0		تمہید
12.1		مقاصد
12.2		جھینگر کا جنازہ (خواجہ حسن نظامی)
	12.2.1	خواجہ حسن نظامی کا تعارف
	12.2.2	خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری
	12.2.3	"جھینگر کا جنازہ" متن
	12.2.4	خلاصہ
12.3		اکتسابی نتائج
12.4		مشکل الفاظ
12.5		مشقیں
12.6		نمونۂ امتحانی سوالات

12.0 تمہید

خواجہ حسن نظامی کا شمار بیسویں صدی کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک صاحبِ طرز ادیب اور نامور صحافی ہیں۔ اُردو کے ایک اہم انشائیہ نگار کی حیثیت سے بھی انہیں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ان کے انشائیوں کے دو مجموعے (1) چٹکیاں اور گدگدیاں (2) سی پارہ دل، ہیں۔

اس اکائی میں آپ خواجہ حسن نظامی کے انشائیے "جھینگر کا جنازہ" کو پڑھیں گے۔ جس میں انہوں نے آدمی اور جھینگر جیسے معمولی جانور کے درمیان بات چیت کے ذریعہ طنزیہ انداز میں انسانوں کو نصیحت کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ سمجھانے کی کوشش بھی کی ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں پیدا کی گئی ہے۔

12.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- خواجہ حسن نظامی کا تعارف پیش کر سکیں۔
- انشائیہ "جھینگر کا جنازہ" کے متن کو صحیح طریقے سے پڑھ سکیں۔
- اس انشائیہ کا خلاصہ پیش کر سکیں۔
- مشکل الفاظ کے معنیٰ جان سکیں۔

12.2 انشائیہ: جھینگر کا جنازہ (خواجہ حسن نظامی)

12.2.1 خواجہ حسن نظامی کا تعارف:

خواجہ حسن نظامی کا شمار اردو کے اہم انشائیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ 1878ء میں دہلی کی مشہور بستی حضرت نظام الدین میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید عاشق حسین تھا۔ ان کا تعلق نظام الدین درگاہ کے پیرزادوں میں سے تھا۔ خواجہ حسن نظامی کا نام والدین نے قاسم علی رکھا لیکن اردو ادب میں خواجہ حسن نظامی کے نام سے مشہور ہوئے۔

خواجہ حسن نظامی جب پانچ سال کے تھے کہ تو انھیں مکتب میں پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر مشکوٰۃ و جلالین تک کی تعلیم اسی مکتب سے حاصل کی۔ انھیں اُردو، عربی اور فارسی پر عبور حاصل تھا۔

خواجہ حسن نظامی کو لڑکپن کے زمانے ہی سے لکھنے کا شوق تھا۔ وہ اخباروں کا مطالعہ بہت کرتے تھے۔ اور اسی پڑھنے کی عادت نے ان کے اندر لکھنے کا شوق پیدا کیا۔ سب سے پہلا مضمون "انڈیا کی نازک حالت" کے عنوان سے لکھا جس میں انہوں نے اپنا نام سید محمد علی حسن نظامی لکھا۔ بعد میں خواجہ حسن نظامی لکھنا شروع کیا۔ ان کی پہلی کتاب "مفلسی کا مجرب علاج" کے نام سے 1900ء میں شائع ہوئی جو مولانا جلال الدین سیوطی کے ایک عربی رسالہ کا ترجمہ ہے۔

دوستوں کے اصرار پر عبدالحلیم شررؔ کی تقلید میں ناول لکھنا شروع کیا مگر ابتدا میں کامیابی نہیں ملی۔ مگر جو کچھ لکھتے شگفتہ اور مختصر لکھتے تھے۔ انہوں نے 1857ء کی جنگ آزادی کے حالات پر کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ تاریخ اسلام سے متعلق بھی کتابیں تصنیف کیں۔ اسلام کی مشہور شخصیتوں کی سوانح لکھیں۔ معاشرہ کی اصلاح پر کتابیں لکھیں۔ اپنا سفر نامہ مرتب کیا۔ انشائیے بھی لکھے۔

خواجہ حسن نظامی نے تصنیف و تالیف میں بہت نام کمایا۔ سینکڑوں کتابیں اور مضامین لکھے۔ انہوں نے آپ بیتی اور سفر نامہ بھی مرتب کیا۔ روزنامچہ کو باقاعدہ طور پر ایک صنف کے طور پر پہچان دلائی۔ ان کی نگرانی میں کئی اخبارات اور روزنامے شائع ہوئے۔ جن میں "روزنامہ رعیت، نظام المشائخ، ماہانہ دین و دنیا، منادی، آستانہ وغیرہ بہت مشہور ہوئے۔

خواجہ حسن نظامی 1857ء کی پہلی جنگ آزادی کے واقعات کا بھی گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی کئی تصانیف موجود ہیں، جس سے ان کے انقلاب 1857 کے تئیں لگاؤ کا پتا چلتا ہے۔ انہوں ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی یعنی 1857ء کے غدر کے حالات

پر "غدر کے حالات، بیگمات کے آنسو، غدر کے اخبار، غدر کے فرمان، بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ، غدر کی صبح وشام، محاصرہ دہلی وغیرہ اہم کتابیں لکھیں۔ خواجہ حسن نظامی کی اہم کتابیں درج ذیل ہیں:

(1) مفلسی کا مجرب علاج (2) فلسفہ شہادت (3) حیدرآباد کے ڈگری یافتہ
(4) غالب کا روزنامچہ (5) کرشن بیتی (6) دہلی کا زیارت نامہ
(7) اطبائے حیدرآباد (8) بہادر شاہ کا مقدمہ (9) بیچارے انگریزوں کی بپتا
(10) چار درویشوں کا تذکرہ (11) چٹکیاں اور گدگدیاں (12) دہلی کی جان کنی
(13) آخری شمع (14) عید نامہ (15) شہادت نامہ

خواجہ حسن نظامی کا انتقال 1955ء میں دہلی میں ہوا۔ وہ پرانی دہلی کی قدیم بستی حضرت نظام الدین میں دفن ہیں۔

12.2.2 خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری:

خواجہ حسن نظامی اپنے دور کے بہترین انشائیہ نگار تھے۔ ان کی نثر میں سادگی کے ساتھ شگفتگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے بعض ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے کہ جنھیں انشائیہ سے ہی مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ جیسے "گلاب تمہارا کیکر ہمارا"، "جھینگر کا جنازہ"، "مچھر"، "الّو"، "پیاری ڈکار" وغیرہ۔

خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کے دو مجموعے 'سی پارۂ دل' اور 'چٹکیاں اور گدگدیاں' شائع ہوئے۔ ابتدائی دور میں خواجہ حسن نظامی کے جو انشائیے وقتاً فوقتاً شائع ہوئے تھے انہیں 'سی پارۂ دل' میں یکجا کیا گیا تھا۔ یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی۔ اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ حیدرآباد کے محکمہ تعلیم نے اسکولوں کے لیے اس کتاب کو منظور کیا۔

"سی پارہ دل" میں 134 انشائیے شامل ہیں۔ جن کے موضوعات کے انتخاب میں خواجہ حسن نظامی نے اپنے اردگرد کے ماحول اور معاشرے سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ چھوٹے چھوٹے موضوعات پر لکھا۔ اس کتاب کو انہوں نے پانچ منازل میں تقسیم کرکے ہر منزل کو ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی منزل: عبد و معبود کے راز و نیاز۔ دوسری منزل: ذوق و شوق عشق و محبت، سوز و گداز 'ارادت و عقیدت۔ تیسری منزل: سرِّ دلبراں در حدیث دیگراں۔ چوتھی منزل: دین وملت۔ پانچویں منزل: سیاست 'معاشرت 'تمدن اور شذرات کے تحت چند اور انشائیے شامل ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کے زیادہ تر انشائیوں کے عنوانات شاعری سے متعلق ہیں۔ ان میں اقبال کا رنگ نظر آتا ہے۔ بعض میں تصوف کی جھلک ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے انشائیوں میں سائنس اور مذہب کے درمیان پائے جانے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ سائنس کو یکسر نظر انداز نہیں کرتے بلکہ اسے تصوف سے جوڑ دیتے ہیں۔ وہ تصوف کے ذریعہ سے قوم کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ اور ان کے مخاطب بھی عام انسان اور کم پڑھے لوگ تھے۔ وہ عام طبقے کی نفسیات، ذہنی سطح اور تعلیمی استعداد سے بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا انہوں اپنے انشائیوں میں ان کے لیے مسرت کا سامان فراہم کر دیا۔

خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں میں ادبی، علمی اور اخلاقی قدروں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ انشائیے کے ذریعہ قوم کی اصلاح کا کام بھی لیتے ہیں۔ اور سماجی برائیوں پر اچھے انداز میں طنز بھی کرتے ہیں۔ وہ قوم کی تعلیمی پسماندگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:" ہماری قوم میں تعلیم کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ سند مل جائے، چاہے علم ہو یا نہ ہو۔" اس جملے میں نہ صرف تعلیمی نظام پر طنز کیا ہے بلکہ قوم کی صورتحال پر تنقید بھی کی ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے اپنے انشائیوں میں اپنے زمانے کی کئی شخصیات کے خاکے بھی لکھے ہیں۔ وہ مولوی بشیر الدین کی شعلہ بیانی کا بیان اس انداز میں کرتے ہیں۔ "مولوی بشیر الدین جیسے واعظ جب بولتے ہیں تو آواز نہیں، آندھی نکلتی ہے۔ سنتے جاؤ تو دماغ کی کھڑکیاں بند کرنا پڑتی ہیں۔"

خواجہ حسن نظامی کے انشائیے میں جابجا تاریخی شعور بھی پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں تاریخی حوالے بیان کرکے پڑھنے والے کو حال سے جوڑ دیتے ہیں۔ ان کا اسلوب سادہ مگر پر اثر اور مکالماتی ہوتا ہے۔ برجستہ جملے ادا کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پیراگراف تمثیل اور تشبیہ کے سہارے بڑے خوبصورت انداز میں لکھتے ہیں۔ مذہبی اصطلاحات اور تصوف کی زبان اور محاورے پر انھیں عبور تھا۔ وہ اپنے انشائیوں کے ذریعہ صرف ادب ہی کی خدمت نہیں کررہے تھے بلکہ تبلیغ کا فریضہ بھی انجام دے رہے تھے۔

12.2.2 انشائیہ "جھینگر کا جنازہ" کا متن:

میری سب کتابوں کو چاٹ گیا۔ بڑا موذی تھا۔ خدا نے پردہ ڈھک لیا۔ اُفوہ جب اس کی لمبی لمبی دو مونچھوں کا خیال کرتا ہوں۔ جو وہ مجھ کو دکھا کر ہلایا کرتا تھا تو آج اس کی لاش دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ بھلا دیکھو تو قیصر ولیم کی برابری کرتا تھا۔

اس جھینگر کی داستان ہرگز نہ کہتا۔ اگر دل سے عہد نہ کیا ہوتا۔ کہ دنیا میں جتنے حقیر و ذلیل مشہور ہیں۔ میں ان کو چار چاند لگا کر چمکاؤں گا۔

ایک دن اس مرحوم کو میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کیوں رے شریر تو یہاں کیوں آیا۔ اُچھل کر بولا ذرا اس کا مطالعہ کرنا تھا سبحان اللہ۔ بھائی کیا خاک مطالعہ کرتے تھے۔ بھائی یہ تو ہم انسانوں کا حصہ ہے۔ بولا وہ قرآن نے گدھے کی مثال دی ہے کہ لوگ کتابیں پڑھ لیتے ہیں مگر نہ ان کو سمجھتے ہیں نہ ان پر عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ بوجھ اٹھانے والے گدھے ہیں۔ جن پر علم و فضل کی کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہے۔

مگر میں نے اس مثال کی تقلید نہیں کی۔ خدا مثال دینا جانتا ہے۔ تو بندہ بھی اس کی دی ہوئی بلاغت سے ایک نئی مثال پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مثل ایک جھینگر کے ہے۔ جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں۔ سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔

جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔

جھینگر کی یہ بات سن کر مجھ کو غصہ آیا۔ اور میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا، جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر کہنے لگا۔ واہ خفا ہو گئے بگڑ گئے لاجواب ہو کر لوگ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

لیاقت تو یہ تھی، کہ کچھ جواب دیتے۔ لگے ناراض ہونے اور دھتکارنے۔

ہائے کل تو یہ تماشہ دیکھا تھا۔ آج غسل خانہ میں وضو کرنے گیا تو دیکھا، بیچارے جھینگر کی لاش کالی چیونٹیوں کے ہاتھوں پر رکھی ہے۔ اور وہ اس کو دیوار پر کھینچے لیے چلی جاتی تھیں۔

جمعہ کا وقت قریب تھا۔ خطبہ کی اذان پکار رہی تھی۔ دل نے کہا جمعہ تو ہزاروں آئیں گے۔ خدا سلامتی دے۔ نماز پھر پڑھ لینا۔ اس جھینگر کے جنازے کو کندھا دینا ضروری ہے۔ یہ موقعے بار بار نہیں آتے۔

بے چارہ غریب تھا۔ خلوت نشین تھا۔ خلقت میں حقیر و ذلیل تھا۔ مکروہ تھا۔ غلیظ سمجھا جاتا تھا۔ اسی کا ساتھ نہ دیا تو کیا امریکہ کے کروڑپتی راک فیلر کے شریک ماتم ہوں گے۔

اگرچہ اس جھینگر نے ستایا تھا۔ جی دکھایا تھا۔ لیکن حدیث میں آیا ہے کہ مرنے کے بعد لوگوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کیا کرو۔ اس واسطے میں کہتا ہوں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں کسی سوراخ میں بوریئے کے نیچے آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔

نہ بچھو کا سا زہریلا ڈنک تھا، نہ سانپ کا سا ڈسنے والا پھن۔ نہ کوے کی سی شریر چونچ تھی۔ نہ بلبل کی مانند عشق بازی۔ شام کے وقت عبادت رب کے لیے ایک مسلسل بین بجاتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ یہ غافلوں کے لیے صور ہے۔ اور عاقلوں کے لیے جلوۂ طور۔

ہائے آج غریب مر گیا۔ جی سے گذر گیا۔ اب کون جھینگر کہلائے گا۔ اب ایسا مونچھوں والا کہاں دیکھنے میں آئے گا۔ ولیم میدان جنگ میں ہے۔ ورنہ اسی کو دو گھڑی پاس بٹھا کر جی بہلاتے کہ مری مٹی کی نشانی ایک یہی بے چارہ دنیا میں باقی رہ گیا ہے.....۔

ہاں تو" جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے "چیونٹیاں تو اس کو اپنے پیٹ کی قبر میں دفن کر دیں گی۔ میرا خیال تھا کہ ان شکم پرستوں سے اس توکل شعار فاقہ مست کو بچاتا۔ اور ویسٹ منسٹر ایبے یا قادیان کے بہشتی مقبرہ میں دفن کراتا۔ مگر جناب یہ کالی چیونٹیاں بھی افریقہ کے مردم خور سیاہ وحشیوں سے کم نہیں۔ کالی جو چیز بھی ہو۔ ایک بلائے بے درماں ہے اس سے چھٹکارا کہاں ہے۔

خیر تو مرثیے کے دو لفظ کہہ کر مرحوم سے رخصت ہونا چاہئے۔

جھینگر کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
قیصر کا یہ پیارا ہے اسے توپ پہ کھینچو

اے پروفیسر اے فلاسفر۔ اے متوکل درویش۔ اے نغمۂ ربانی گانے والے قوال ہم تیرے غم میں نڈھال ہیں۔ اور توپ کی گاڑی پر تیری لاش اٹھانے کا اور اپنے بازو پر کالا نشان باندھنے کا ریزولیوشن پاس کرتے ہیں۔ خیر اب تو تو شکم مور کی قبر میں دفن ہو جا۔ مگر ہم ہمیشہ ریزولیوشنوں میں تجھے یاد رکھیں گے۔

12.2.3 خلاصہ:

" جھینگر کا جنازہ "خواجہ حسن نظامی کا ایک بہت دلچسپ انشائیہ ہے۔ یہ ان کی کتاب "سی پارہ دل" سے لیا گیا ہے۔ اس انشائیے میں خواجہ حسن نظامی نے جھینگر جیسے معمولی جانور کو موضوع بنایا ہے۔ اور اس کے ذریعہ نصیحت کی باتیں کی ہیں۔ ان کی نثر سادگی اور پرکاری کا

اعلیٰ نمونہ ہے۔ وہ الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس انشائیے میں ایک چھوٹے جاندار کو موضوع بنا کر ہمیں اپنا محاسبہ کرنے کی طرف راغب کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ جھینگر ابن عربی کی لکھی ہوئی کتاب "فتوحات مکیہ" کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا کہ کیوں رے شریر یہاں کیا کر رہا ہے؟ اچھل کر جواب دیا، مطالعہ کر رہا تھا۔ میں نے سبحان اللہ تم کیا خاک مطالعہ کرنے لگے۔ پڑھنا لکھنا ہم انسانوں کا حصہ ہے۔ جھینگر کہنے لگا، ایسے پڑھنے سے کیا فائدہ جس پر عمل نہ کیا جائے۔ قرآن نے ایسے لوگوں کی گدھے سے مثال پیش کی ہے۔ کتابیں تو پڑھ لیتے ہیں لیکن اس پر عمل نہیں کرتے ہیں بالکل ایسے ہی ہے جیسے گدھے کے اوپر کتابوں کا بوجھ ڈال دیا جائے۔

جھینگر بات تو پتے کی کہہ گیا۔ ہم انسانوں کا یہی حال ہے۔ ہماری تعلیم گاہوں کا بھی المیہ یہی ہے۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو علم کو علم سمجھ کے پڑھ رہا ہو۔

جھینگر کی بات سن کر مجھے غصہ آیا۔ میں نے زور سے کتاب پر ہاتھ مارا۔ جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور قہقہہ مار کر کہنے لگا۔ جب انسان کے پاس جواب نہیں ہوتا تو ایسی ہی حرکت کرتا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کبھی کسی انسان کو برے ناموں سے یاد نہیں کرنا چاہیئے۔ اگرچہ جھینگر نے بہت ستایا تمام کتابیں چاٹ کر ختم کر دی لیکن جب مر گیا تو اس کی اچھائی بیان کرنا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں "خدا بخشے بہت سی خوبیوں کا جانور تھا۔ ہمیشہ دنیا کے جھگڑوں سے الگ کونے میں کسی سوراخ میں بوریئے کے نیچے آبخورے کے اندر چھپا بیٹھا رہتا تھا۔"

اسی طرح اس انشائیہ میں آج کل کے طالب علموں پر بھی تنقید کی ہے کہ جس طرح جھینگر کتابوں کو چاٹ چاٹ کر اپنا پیٹ بھرتا ہے اسی طرح آج کل کے طلبا صرف امتحان میں پاس ہونے کے لیے پڑھتے ہیں۔ وہ اپنی صلاحیت کو بہتر بنانے اور علم میں اضافہ کے لیے محنت نہیں کرتے۔ وہ طلبا کے ساتھ یونیورسٹی کے اساتذہ کو جھینگر کی زبانی طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: جتنی یونیورسٹیاں ہیں سب میں یہی ہوتا ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جس نے علم کو علم سمجھ کر پڑھا ہو۔

خواجہ حسن نظامی نے اس انشائیہ میں عام فہم الفاظ اور تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنی بات کہی ہے تاکہ پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی ہو۔

12.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- خواجہ حسن نظامی 1878ء میں دہلی کی مشہور بستی حضرت نظام الدین میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید عاشق حسین تھا۔
- خواجہ حسن نظامی کا بچپن کا نام قاسم علی تھا لیکن اردو ادب میں خواجہ حسن نظامی کے نام سے مشہور ہوئے۔
- خواجہ حسن نظامی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ میں ہوئی۔ عربی، فارسی اور اردو زبان پر مکمل عبور تھا۔

- خواجہ حسن نظامی نے سب سے پہلا مضمون "انڈیا کی نازک حالت" کے عنوان سے لکھا جس میں انہوں نے اپنا نام سید محمد علی حسن نظامی لکھا۔
- خواجہ حسن نظامی کی پہلی کتاب "مفلسی کا مجرب علاج" کے نام سے 1900ء میں شائع ہوئی جو مولانا جلال الدین سیوطی کے ایک عربی رسالہ کا ترجمہ ہے۔
- خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کے دو مجموعے 'سیپارۂ دل' اور 'چٹکیاں اور گدگدیاں' شائع ہو چکے ہیں۔
- "جھینگر کا جنازہ" خواجہ حسن نظامی کا ایک بہت دلچسپ انشائیہ ہے۔ یہ ان کی کتاب "سی پارہ دل" سے لیا گیا ہے۔
- اس انشائیے میں خواجہ حسن نظامی نے جھینگر جیسے معمولی جانور کو موضوع بنایا ہے۔ اور اس کے ذریعہ نصیحت کی باتیں کی ہیں۔
- ان کی نثر سادگی اور پرکاری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ وہ الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔
- "جھینگر کا جنازہ" خواجہ حسن نظامی کے بہترین انشائیوں میں سے ایک ہے۔
- اس انشائیہ میں انہوں نے نثر سادگی اور پرکاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

12.4 مشکل الفاظ

موذی	اذیت دینے والا	Harmful / Malicious
قیصر ولیم	جرمنی کا بادشاہ	Kaiser Wilhelm (German Emperor)
چار چاند لگانا	عزت و مرتبہ کو بڑھانا (محاورہ)	To enhance / To add glory
فتوحات مکیہ	ابن عربی کی کتاب کا نام ہے یہ تصوف اسلامی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی کتاب، اسی میں وحدت الوجود پر بحث ہے	Futuhat al-Makkiyya
مطالعہ	پڑھنا	Study / Reading
پھدکنا	اچھلنا، کودنا	To hop / To jump playfully
خفا ہونا	ناراض ہونا	To be upset / To be displeased
خلوت نشین	اکیلے میں رہنا	Recluse / Hermit
خلقت	پیدائش	Creation / People
مکروہ	بدنما، بدشکل	Abominable / Detestable

آبخورہ	مٹی کا برتن، جس سے پانی یا شربت پیتے ہیں۔	Small drinking pot

12.5 مشقیں

مشق 1: دیے گئے الفاظ کو خالی جگہوں میں بھریئے۔

فتوحات مکیہ، جنازہ چاٹ، غصہ،

(الف) جھینگر میری سب کتابوں کو..... گیا۔

(ب) میں نے دیکھا کہ حضرت ابن عربی کی..... کی ایک جلد میں چھپا بیٹھا ہے۔

(ج) جھینگر کی یہ بات سن کر مجھ کو..... آیا۔

(د) جھینگر کا..... ہے ذرا دھوم سے نکلے ۔

مشق 2: نیچے دیے گئے الفاظ کی مدد سے جملے لکھیے۔

1۔ غریب : .....

2۔ مکروہ : .....

3۔ پھدکنا : .....

4۔ مثال : .....

5۔ سوراخ : .....

مشق 3۔ نیچے دیے گئے جملوں میں صحیح اور غلط کا نشان لگایئے۔

(الف) خواجہ حسن نظامی کی ولادت 1878ء میں دہلی کی بستی حضرت نظام الدین میں ہوئی۔ ( )

(ب) جھینگر پھدک کر دوسری کتاب پر جا بیٹھا اور رو کر کہنے لگا۔ ( )

(ج) فتوحات مکیہ ابن عربی کی کتاب ہے۔ ( )

(د) " جھینگر کا جنازہ" خواجہ حسن نظامی کا ایک بہت دلچسپ انشائیہ نہیں ہے۔ ( )

12.6 نمونۂ امتحانی سوالات

12.6.1 معروضی سوالات:

1۔ خواجہ حسن نظامی کہاں پیدا ہوئے؟

(a) دہلی (b) آگرہ (c) لکھنؤ (d) حیدرآباد

2۔ خواجہ حسن نظامی کے والد کا نام کیا تھا؟

(a)کاظم حسین (b)سید عاشق حسین (c)الطاف حسین (d)اکبر حسین

3۔ سی پارہ دل کس کے انشائیوں کا مجموعہ ہے؟

(a)الطاف حسین حالی (b)محمد حسین آزاد (c)پطرس بخاری (d)خواجہ حسن نظامی

4۔ خواجہ حسن نظامی کے انشائیوں کے کتنے مجموعے شائع ہوئے؟

(a)دو (b)تین (c)پانچ (d)سات

5۔ خواجہ حسن نظامی کے والدین نے ان کا کیا نام رکھا تھا؟

(a)امام علی (b)نظام علی (c)قائم علی (d)قاسم علی

6۔ خواجہ حسن نظامی کا پہلا مضمون کون سا ہے؟

(a)انڈیا کی نازک حالت (b)برما کی تاریخ (c)جانباز مسلم (d)بلاوا

7۔ خواجہ حسن نظامی نے پہلی کتاب کس نام سے تصنیف کی؟

(a)غالب کا روزنامچہ (b)سری کرشن بیتی (c)مفلسی کا مجرب علاج (d)شہادت نامہ

8۔ جھینگر کا جنازہ کس کا انشائیہ ہے؟

(a)شبلی (b)حالی (c)آزاد (d)خواجہ حسن نظامی

9۔ جھینگر کس کتاب میں چھپا بیٹھا تھا؟

(a)فتوحات مکیہ (b)فتح الباری (c)فتوح البلدان (d)نظامی بنسری

10۔ چٹکیاں اور گدگدیاں کس کی کتاب ہے؟

(a)پطرس بخاری (b)رشید احمد صدیقی (c)وزیر آغا (d)خواجہ حسن نظامی

12.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. خواجہ حسن نظامی نے اپنی کتاب "سی پارہ دل" کتنے منازل میں اور کن عنوانات کے تحریر کیا ہے۔
2. خواجہ حسن نظامی کی انشائیہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔؟
3. خواجہ حسن نظامی اور جھینگر کے درمیان جو مکالمے ہوئے ہیں۔چند سطر میں لکھیے۔
4. کتاب "سی پارہ دل" کتنے منازل میں تقسیم کی گئی ہے۔اور ہر باب کے عنوانات کا کیا نام رکھا ہے۔چند جملوں میں بیان کیجیے۔
5. اس عبارت سے آپ کو کیا سبق ملتا ہے؟ بیان کیجیے۔

"انسان مثل ایک جھینگر کے ہے۔جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں۔ سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔"

12.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. خواجہ حسن نظامی کے حالات زندگی بیان کیجیے۔
2. انشائیہ "جھینگر کا جنازہ" میں خواجہ حسن نظامی نے کس چیز پر طنز کیا ہے؟ چند جملوں میں لکھیے۔
3. انشائیہ "جھینگر کا جنازہ" کا خلاصہ اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔

12.6.1 کے جوابات:

A (i)	B (ii)	D (iii)	A (iv)	D (v)
A (vi)	C (vii)	D (viii)	A (ix)	D (x)

بلاک IV

اکائی 13: خاکہ

(نام دیومالی: مولوی عبدالحق)

اکائی کے اجزا

13.0		تمہید
13.1		مقاصد
13.2		خاکہ: نام دیومالی (مولوی عبدالحق)
	13.2.1	مولوی عبدالحق کا تعارف
	13.2.2	مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری
	13.2.3	خاکہ: نام دیومالی: متن
	13.2.4	خلاصہ
13.3		اکتسابی نتائج
13.4		مشکل الفاظ
13.5		مشقیں
13.6		نمونہ امتحانی سوالات

13.0 تمہید

"نام دیو۔مالی" بابائے اردو مولوی عبدالحق کا تحریر کردہ ایک بہترین خاکہ ہے۔ اس خاکے میں خاکے کی تمام فنی خصوصیات موجود ہیں۔ "نام دیو۔مالی" ان کی مشہور زمانہ کتاب "چند ہم عصر" میں شامل ہے، جسے ان کے ایک شاگرد شیخ چاند نے مرتب کیا تھا۔ "نام دیو۔مالی" مقبرہ رابعہ درانی، اورنگ آباد کے ایک باغ میں مالی تھا۔ مولوی عبدالحق جس گھر میں رہتے تھے وہ مقبرہ رابعہ درانی کے باغ کے احاطے میں تھا۔ یہیں سے وہ نام دیومالی کو دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ خاکے میں نام دیومالی کے تمام حرکات و سکنات کو بہت ہی خوبصورتی اور غیر جانب داری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے نام دیومالی کا خاکہ اس طرح کھینچا ہے کہ اس کی پوری تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اس کو

ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے نام دیومالی کی تصویر لفظوں سے اس طرح کھینچی ہے کہ ہمیں لگتا ہے جیسے وہ ہمارے سامنے موجود ہے اور باغ میں کام کر رہا ہے۔ اس اکائی میں ہم خاکہ 'نام دیو۔مالی' کا تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔

13.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مولوی عبدالحق کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کر سکیں۔
- مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کی فنی خوبیوں کو بیان کر سکیں۔
- مولوی عبدالحق کے خاکے "نام دیو۔مالی" کے متن کی قرات کر سکیں۔
- مولوی عبدالحق کے خاکے "نام دیو۔مالی" کے خلاصے کا مطالعہ کر سکیں۔

13.2 خاکہ:نام دیومالی(مولوی عبدالحق)

13.2.1 مولوی عبدالحق کا تعارف:

مولوی عبدالحق کی پیدائش 20/ اگست،1870ء کو سرادہ (ہاپوڑ)، میرٹھ، ضلع اترپردیش، میں ہوئی۔ مولوی عبدالحق کے آباو اجداد ہاپوڑ کے رہنے والے تھے، جن کا تعلق ہندو مذہب کی کائستھ برادری سے تھا، جنہوں نے شاہ جہاں کے عہد (عہدِ مغلیہ) میں اسلام قبول کیا۔ مولوی عبدالحق کا آبائی مکان ہاپوڑ کے محلہ قانون گویاں میں تھا۔ مولوی صاحب کے دادا کا نام شیخ محمد حسین، والد کا نام شیخ علی حسین اور والدہ محترمہ کا نام لطیفن تھا۔ مولوی عبدالحق کے آٹھ بھائی بہن تھے، جن میں چار بھائی ضیاالحق، محمود الحق، عبدالحق، احمد حسن اور چار بہنیں فاطمہ، زمانی، رقیہ اور بلقیس تھیں۔

مولوی عبدالحق کی ابتدائی تعلیم ان کے آبائی گاؤں سرادہ اور ہاپوڑ میں ہوئی۔ جب مولوی عبدالحق کی عمر تقریباً دس برس کی تھی اس وقت ان کے والد کو صوبہ پنجاب کے ضلع فیروز پور میں ملازمت مل گئی۔ مولوی عبدالحق اپنے والد کے ساتھ پنجاب چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ چلے آئے اور ایم اے او کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں کا ماحول مولوی عبدالحق کے لیے بالکل الگ اور نیا تھا۔ یہاں کے طالب علم، ان کی عادات و اطوار، ان کی مصروفیت، یہاں کے اساتذہ، ڈائننگ ہال، مسجد، نمازیں سارا ماحول ہی ان کے لیے نیا اور انوکھا تھا۔ یہاں سے انہوں نے 1893 میں انٹر میڈیٹ اور 1895 میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔

مولوی عبدالحق نے جب بی اے کا امتحان پاس کر لیا تو ان کے والدین نے ان کی شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت مولوی صاحب کی عمر پچیس سال تھی۔ مولوی صاحب ابھی شادی کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، لیکن والدین اپنے ذمے داری سے فارغ ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے خاندان کی ایک لڑکی، جس کا نام زکریا تھا، سے مولوی صاحب کی شادی کر دی۔ کچھ دنوں بعد مولوی عبدالحق نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ مولوی صاحب سے طلاق کے بعد زکریا بیگم کی دوسری شادی مولوی ممتاز سے کر دی گئی۔

مولوی عبدالحق کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ پڑھائی کے علاوہ انہوں نے کبھی کسی چیز میں دلچسپی نہیں لی۔ نہ تو کسی کھیل کود

میں حصہ لیتے تھے، نہ کسی انجمن میں شریک ہوتے تھے اور نہ کالج کی یونین ہی میں دلچسپی لیتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت پڑھنے لکھنے ہی میں گزرتا تھا۔ انہوں نے اپنے علمی اور ادبی کاموں کی وجہ سے بہت جلد علی گڑھ میں اپنی ایک شناخت قائم کر لی۔ یہاں پر انھیں سر سید احمد خاں، مولانا حالی، شبلی نعمانی، مولانا عباس حسین وغیرہ جیسی اہم ادبی شخصیات کی رہنمائی حاصل رہی، جن کے زیر سایہ مولوی صاحب کی شخصیت پروان چڑھی۔

مولوی عبدالحق بی۔ اے کرنے کے بعد تلاش معاش کی غرض سے بمبئی چلے گئے۔ وہاں ریاست حیدرآباد کے نواب محسن الملک سے ان کی ملاقات ہوئی، جو تفریح وسیاحت کے لیے وہاں آئے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب نواب صاحب کے ساتھ حیدرآباد آگئے اور ان کے توسط سے آصفیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ وہاں انہوں نے بارہ سال تک اپنی خدمات انجام دیں۔

جنوری 1902ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے تحت ایک علمی شعبہ قائم کیا گیا جس کا نام انجمن ترقی اردو تھا۔ مولانا شبلی نعمانی اس کے سکریٹری رہے۔ 1905ء میں نواب حبیب الرحمن خان شیروانی اور 1909ء میں عزیز مرزا اس عہدے پر فائز ہوئے۔ عزیز مرزا کے بعد 1912ء میں مولوی عبدالحق سکریٹری منتخب ہوئے جنہوں نے بہت جلد انجمن ترقی اردو کو ایک فعال ترین علمی ادارہ بنادیا۔ مولوی عبدالحق اورنگ آباد (دکن) میں ملازم تھے وہ انجمن کو اپنے ساتھ لے گئے اور اس طرح حیدر آباد دکن اس کا مرکز بن گیا۔ انجمن کے زیر اہتمام ایک لاکھ سے زائد جدید علمی، فنی اور سائنسی اصطلاحات کا اردو ترجمہ کیا گیا۔ نیز اردو کے نادر نسخے تلاش کر کے چھاپے گئے۔ دوسہ ماہی رسائل، اردو اور سائنس جاری کیے گئے۔ ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا گیا۔ حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی انجمن ہی کی کوششوں کی مرہون منت ہے۔ اس یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ انجمن نے ایک دار الترجمہ بھی قائم کیا جہاں سینکڑوں علمی کتابیں تصنیف و ترجمہ ہوئیں۔ اس انجمن کے تحت لسانیات، لغت اور جدید علوم پر دو سو سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں۔ تقسیم ہند کے بعد انہوں نے اسی انجمن کے زیر اہتمام کراچی، پاکستان اردو آرٹس کالج، اردو سائنس کالج، اردو کامرس کالج اور اردو لا کالج جیسے ادارے قائم کیے۔ مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری ہی نہیں مجسّم ترقی اردو تھے۔ ان کا سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، پڑھنا لکھنا، آنا جانا، دوستی، تعلقات، روپیہ پیسہ غرض کہ سب کچھ انجمن کے لیے تھا۔ ان کی انہیں خوبیوں کی وجہ سے 1935ء میں جامعہ عثمانیہ کے ایک طالب علم محمد یوسف نے انہیں بابائے اردو کا خطاب دیا، جس کے بعد یہ خطاب اتنا مقبول ہوا کہ ان کے نام کا جزو بن گیا۔ 23 مارچ، 1959ء کو حکومت پاکستان نے صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

مولوی عبدالحق آخری وقت میں بہت بیمار رہنے لگے تھے۔ ان کی صحت ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ پیچش، یرقان اور سرطان جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے انہیں جناح ہسپتال، کراچی میں داخل کرایا گیا۔ وہاں کچھ دنوں تک وہ زیر علاج رہے اور آخر کار 16/ اگست 1961 کو کراچی میں ان کا انتقال ہو گیا اور انہیں انجمن ترقی اردو کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

13.2.2 مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری:

مولوی عبدالحق نے خاکہ نگاری کے میدان میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اردو خاکہ نگاری میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے بعد مولوی عبدالحق کا نام سر فہرست ہے۔ انہوں نے اردو خاکہ نگاری کو ایک معتبر اور مستقل صنف کا درجہ عطا کیا۔ مولوی صاحب خاکہ نگاری کے فن

میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے جن شخصیات کا خاکہ لکھا ہے ان کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے۔

"چند ہم عصر" مولوی عبدالحق کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کو سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ کے ریسرچ اسکالر شیخ چاند نے 1937 میں مرتب کیا۔ زندگی نے شیخ چاند کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ اس کتاب کو شائع کرا سکیں۔ اسی سال دسمبر 1937 میں شیخ چاند کا انتقال ہو گیا۔ شیخ چاند کے انتقال کے تین سال بعد 1940 میں انجمن ترقی اردو ہند نے اسے شائع کیا۔ اس وقت اس میں چودہ شخصیتوں کے خاکے شامل تھے۔ اس کے بعد اس کو مختلف اصحاب نے مرتب کر کے شائع کیا اور ہر اڈیشن میں خاکوں کا اضافہ ہوتا گیا۔ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی نے جو ایڈیشن 1959 میں شائع کیا ہے، اس میں جملہ چوبیس اشخاص کے خاکے شامل ہیں۔

خاکہ میں سوانح اور خود نوشت کی طرح شخصیت کی سیرت، صورت ان کے اہم واقعات کو ضرور بیان کیا جاتا ہے، مگر خاکہ نگاری سوانح اور خود نوشت سے مختلف ہوتی ہے۔ خاکہ میں کسی شخص کی زندگی اور اس کی شخصیت سے متعلق چند منفرد اور انوکھے پہلوؤں کو اس خوبی کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ اس شخص کی زندہ جاوید تصویر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے اور ہمارے ذہن پر اس کا نقش قائم ہو جاتا ہے۔ ایک اچھا خاکہ نگار جب کسی کا خاکہ لکھتا ہے تو اس شخص کے سوانحی واقعات اور خارجی مشاہدات کے ساتھ ساتھ اپنے تخیلات، تاثرات اور اس شخص کے تئیں اپنے تجربات و مشاہدات کو بھی پیش کرتا ہے۔ اسی لیے خاکے میں ایک جیتی جاگتی تصویر کے ساتھ ساتھ افسانے جیسی دلکشی بھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاکہ پڑھنے والا بیک وقت واقعے اور کہانی دونوں کے فن سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مولوی عبدالحق کے خاکوں میں یہ تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہیں۔ معروف خاکہ نگار کشمیری لال ذاکر مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "میں نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کو صرف ان کے خاکوں سے جانا ہے ورنہ ذاتی طور پر میں انہیں بالکل نہیں جانتا۔ اس کے باوجود میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مولوی صاحب فن خاکہ نگاری پر کمال کی دسترس رکھتے ہیں اور لگتا ہے کہ ہم جس شخص کا خاکہ پڑھ رہے ہیں وہ شخص خود ہمارے سامنے کھڑا ہے اور ہم سے گفتگو کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ کمال اور کیا ہو گا۔"

(خلیق انجم، مرتب، مولوی عبدالحق: ادبی و لسانی خدمات، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، 1993، ص209)

مولوی عبدالحق نے جن شخصیات پر خاکے لکھے ہیں وہ کسی نہ کسی خاص خوبی کے مالک تھے، جو عام طور پر ہر شخص میں نہیں پائی جاتی۔ وہ ایسے ہی شخص سے متاثر ہوتے تھے، جس میں کوئی خاص انفرادیت ہوتی تھی اور وہ عام لوگوں سے ہٹ کر منفرد کام کرتے تھے۔ عبدالحق نے ان خاکوں میں اپنی بھرپور فن کارانہ صلاحیت کو پیش کیا ہے۔ ناقدین کا خیال ہے کہ اگر مولوی عبدالحق صرف یہی دو خاکے، ایک "نام دیو۔ مالی" اور دوسرا "گدڑی کا لال۔ نور خان" تحریر کرتے تب بھی ان کا نام "خاکہ نگاری" کی تاریخ میں زندہ رہنے کے لیے کافی تھا۔

13.2.3 خاکہ: نام دیو مالی: متن

نام دیو مقبرہ رابعہ درانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ ذات کا دھیڑ جو بہت نیچ قوم خیال کی جاتی ہے۔ قوموں کا امتیاز مصنوعی ہے اور رفتہ رفتہ نسلی ہو گیا ہے۔ سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں نیچی ذات والوں میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اونچی ذات والوں میں۔

قیس ہو کوہ کن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

مقبرے کا باغ میری نگرانی میں تھا۔ میرے رہنے کا مکان بھی باغ کے احاطے ہی میں تھا۔ میں نے اپنے بنگلے کے سامنے چمن بنانے کا کام نام دیو کے سپرد کیا۔ میں اندر کمرے میں کام کرتا رہتا تھا۔ میری میز کے سامنے بڑی سی کھڑکی تھی۔ اس میں سے چمن صاف نظر آتا تھا۔ لکھتے لکھتے کبھی نظر اٹھا کر دیکھتا تو نام دیو کو ہمہ تن اپنے کام میں مصروف پاتا۔ بعض دفعہ اس کی حرکتیں دیکھ کر بہت تعجب ہوتا۔ مثلاً کیا دیکھتا ہوں کہ نام دیو ایک پودے کے سامنے بیٹھا اس کا تھانولا صاف کر رہا ہے۔ تھانولا صاف کر کے حوض سے پانی لیا اور آہستہ آہستہ ڈالنا شروع کیا۔ پانی ڈال کر ڈول درست کی اور ہر رُخ سے پودے کو مڑ مڑ کر دیکھا۔ پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا اور مسکراتا اور خوش ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے، بے مزہ کام، کام نہیں بیگار ہے۔

اب مجھے اس سے دلچسپی ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اپنا کام چھوڑ کر اسے دیکھا کرتا۔ مگر اسے خبر نہ ہوتی کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا اس کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے کام میں مگن رہتا۔ اس کے کوئی اولاد نہ تھی وہ اپنے پودوں اور پیڑوں ہی کو اپنی اولاد سمجھتا تھا اور اولاد کی طرح ان کی پرورش اور نگہداشت کرتا۔ ان کو سبز اور شاداب دیکھ کر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے ماں اپنے بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ایک ایک پودے کے پاس بیٹھتا، ان کو پیار کرتا، جھک جھک کے دیکھتا اور ایسا معلوم ہوتا گویا ان سے چپکے چپکے باتیں کر رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑھتے، پھولتے پھلتے اس کا دل بھی بڑھتا اور پھولتا پھلتا تھا، ان کو توانا اور ٹانٹا دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ کبھی کسی پودے میں اتفاق سے کیڑا لگ جاتا یا کوئی اور روگ پیدا ہو جاتا تو اسے بڑا فکر ہوتا۔ بازار سے دوائیں لاتا۔ باغ کے داروغہ یا مجھ سے کہہ کر منگاتا۔ دن بھر اسی میں لگا رہتا اور اس پودے کی ایسی سیوا کرتا جیسے کوئی ہمدرد اور نیک دل ڈاکٹر اپنے عزیز بیمار کی کرتا ہے۔ ہزار جتن کرتا اور اسے بچا لیتا اور جب تک وہ تندرست نہ ہو جاتا اسے چین نہ آتا۔ اس کے لگائے ہوئے پودے ہمیشہ پروان چڑھے اور کبھی کوئی پیڑ ضائع نہ ہوا۔

باغوں میں رہتے رہتے اسے جڑی بوٹیوں کی بھی شناخت ہو گئی تھی۔ خاص کر بچوں کے علاج میں اسے بڑی مہارت تھی۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس بچوں کے علاج کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے باغ ہی میں سے جڑی بوٹیاں لا کر بڑی شفقت اور غور سے ان کا علاج کرتا۔ کبھی کبھی دوسرے گاؤں والے بھی اسے علاج کے لیے بلا لے جاتے۔ بلا تامل چلا جاتا۔ مفت علاج کرتا اور کبھی کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا۔

وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور ایسا ہی اپنے چمن کو بھی رکھتا۔ اس قدر پاک صاف جیسے رسوئی کا چوکا۔ کیا مجال جو کہیں گھاس

پھوس یا کنکر پتھر پڑا رہے۔ روشیں باقاعدہ، تھانولے درست، سینچائی اور شاخوں کی کاٹ جھانٹ وقت پر، جھاڑنا بہارنا صبح شام روزانہ۔ غرض سارے چمن کو آئینہ بنا رکھا تھا۔

باغ کے داروغہ (عبدالرحیم فنیسی) خود بھی بڑے کارگزار اور مستعد شخص ہیں اور دوسرے سے بھی کھینچ تان کر کام لیتے ہیں۔ اکثر مالیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ ذرا بھی نگرانی میں ڈھیل ہوئی، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ یا بیڑی پینے لگے۔ یا سائے میں جا لیٹے۔ عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہو گئی ہے، لیکن نام دیو کو کبھی کچھ کہنے سننے کی نوبت نہ آئی۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں لگا رہتا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔

ایک سال بارش بہت کم ہوئی۔ کنوؤں اور باولیوں میں پانی برائے نام رہ گیا۔ باغ پر آفت ٹوٹ پڑی۔ بہت سے پودے اور پیڑ تلف ہو گئے۔ جو بچ رہے وہ ایسے نڈھال اور مرجھائے ہوئے تھے جیسے دق کے بیمار، لیکن نام دیو کا چمن ہرا بھرا تھا۔ اور وہ دور دور سے ایک ایک گھڑا پانی کا سر پر اٹھا کے لاتا اور پودوں کو سینچتا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قحط نے لوگوں کے اوسان خطا کر رکھے تھے اور انہیں پینے کو پانی مشکل سے میسر آتا تھا۔ مگر یہ خدا کا بندہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی آتا اور اپنے پودوں کی پیاس بجھاتا۔ جب پانی کی قلت اور بڑھی تو اس نے راتوں کو بھی پانی ڈھو ڈھو کے لانا شروع کیا۔ پانی کیا تھا یوں سمجھیے کہ آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی، لیکن یہی گدلا پانی پودوں کے حق میں آب حیات تھا۔

میں نے اس بے مثل کارگزاری پر اسے انعام دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ شاید اس کا کہنا ٹھیک تھا کہ اپنے بچوں کو پالنے پوسنے میں کوئی انعام کا مستحق نہیں ہوتا۔ کیسی ہی تنگی ترشی ہو تو وہ ہر حال میں کرنا ہی پڑتا ہے۔

جب اعلیٰ حضرت حضور نظام کو اورنگ آباد کی خشک آب و ہوا میں باغ لگانے کا خیال ہوا تو یہ کام ڈاکٹر سیّد سراج الحسن (نواب سراج یار جنگ بہادر) ناظم تعلیمات کے تفویض ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوقِ باغبانی مشہور تھا۔ مقبرہ رابعہ دورانی اور اس کا باغ جو اپنی ترتیب و تعمیر کے اعتبار سے مغلیہ باغ کا بہترین نمونہ ہے، مدت سے ویران اور سنسان پڑا تھا۔ وحشی جانوروں کا مسکن تھا اور جھاڑ جھنکار سے پٹا پڑا تھا۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بدولت سرسبز شاداب اور آباد نظر آتا ہے۔ اب دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے اور سیر و تفریح سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آدمی پرکھنے میں بھی کمال تھا وہ نام دیو کے بڑے قدردان تھے، اسے مقبرے سے شاہی باغ میں لے گئے۔ شاہی باغ آخر شاہی باغ تھا۔ کئی کئی نگراں کار اور بیسیوں مالی اور مالی بھی کیسے، ٹوکیو سے جاپانی، تہران سے ایرانی اور شام سے شامی آئے تھے۔ ان کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اوپج تھی۔ وہ شاہی باغ کو حقیقت میں شاہی باغ بنانا چاہتے تھے۔ یہاں بھی نام دیو کا وہی رنگ تھا۔ اس نے نہ فنِ باغبانی کی کہیں تعلیم پائی تھی اور نہ اس کے پاس کوئی سند یا ڈپلوما تھا۔ البتہ کام کی دھن تھی۔ کام سے سچا لگاؤ تھا۔ اور اسی میں اس کی جیت تھی۔ شاہی باغ میں بھی اس کا کام مہا کاج رہا۔ دوسرے مالی لڑتے جھگڑتے، سیندھی شراب پیتے، یہ نہ کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ سیندھی شراب پیتا۔ یہاں تک کہ کبھی بیڑی بھی نہ پی۔ بس یہ تھا اور اس کا کام۔

ایک دن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ شہد کی مکھیوں کی یورش ہوئی۔ سب مالی بھاگ بھاگ کر چھپ گئے۔ نام دیو کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ برابر اپنے کام میں لگا رہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ قضا اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔ مکھیوں کا غضبناک جھلڑ اس غریب پر ٹوٹ

پڑا۔ اتنا کاٹا اتنا کاٹا کہ بے دم ہو گیا۔ آخر اسی میں جان دے دی۔ میں کہتا ہوں کہ اسے شہادت نصیب ہوئی۔

وہ بہت سادہ مزاج بھولا بھالا اور منکسر مزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

گرمی ہو یا جاڑا، دھوپ ہو یا سایہ، وہ دن رات برابر کام کرتا رہا، لیکن اسے کبھی یہ خیال نہ آیا کہ میں بہت کام کرتا ہوں یا میرا کام دوسروں سے بہتر ہے۔ اسی لیے اسے اپنے کام پر فخر یا غرور نہ تھا۔ وہ یہ باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ اسے کسی سے بیر تھا نہ جلاپا۔ وہ سب کو اچھا سمجھتا اور سب سے محبت کرتا تھا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا، وقت پر کام آتا، آدمیوں جانوروں، پودوں کی خدمت کرتا، لیکن اسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ نیکی اسی وقت تک نیکی ہے جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے۔ جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی نیکی نہیں رہتی۔

جب کبھی مجھے نام دیو کا خیال آتا ہے تو میں سوچتا ہوں کہ نیکی کیا ہے اور بڑا آدمی کسے کہتے ہیں۔ ہر شخص میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے۔ اس صلاحیت کو درجہ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے۔ درجہ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے، لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان انسان بنتا ہے۔ یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے، حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہو گی خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تو نے کتنی پوجا پاٹ یا عبادت کی۔ وہ کسی عبادت کا محتاج نہیں۔ وہ پوچھے گا کہ میں نے جو تجھ میں استعداد ودیعت کی تھی اسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔

تھا تو ذات کا دھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔

13.2.4 خلاصہ:

خاکہ "نام دیو۔ مالی" میں مولوی عبدالحق نے نام دیو کی ایمانداری، پودوں سے اس کی محبت، اس کی محنت، اس کے اخلاق، اس کے بڑے پن، اس کی اعلیٰ سوچ، اس کی شرافت وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔ نام دیو مقبرہ رابعہ درانی اورنگ آباد (دکن) کے باغ میں مالی تھا۔ مولوی عبدالحق اکثر اسے اپنے کمرے میں سے دیکھا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ باغ میں پیڑ پودوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا تھا۔ اسے اپنے کام سے بہت محبت تھی۔ وہ بے غرض ہو کر پودوں کی خدمت کرتا تھا۔ اس کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ وہ خود بھی بہت صاف ستھرا رہتا تھا اور باغ کو بھی بالکل صاف ستھرا رکھتا تھا۔

نام دیو کی محنت سے مولوی صاحب بہت متاثر تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ نام دیو بہت محنتی آدمی تھا اور اسے اپنے کام سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ وہ ہر وقت اپنے کام میں مصروف رہتا تھا اور پیڑ پودوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا۔ نام دیو کو اپنے کام سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اس کی جیت بھی تھی، کیوں کہ اس کا باغ اطراف کے تمام باغات سے بہت بہتر اور صاف ستھرا رہتا تھا۔ وہ پودوں کے تھانولا میں ایک کنکر تک نہیں رہنے دیتا تھا۔ اس کی اس خوبی کی وجہ سے ہر کوئی اسے بہت پسند کرتا تھا۔

وہ محنتی اتنا تھا کہ ایک مرتبہ جب بارش بہت کم ہوئی اور پانی کی قلت ہو گئی تو نام دیو دور دور سے ایک گھڑے میں پانی بھر کر لاتا تھا اور پودوں کو سینچتا تھا۔ باغ میں پودے بہت زیادہ تھے اور پانی کی بہت ضرورت پڑتی تھی۔ نام دیو دن میں جو پانی لاتا تھا اس سے پورے پودوں کو پانی نہیں مل پاتا تھا تو اس نے رات کو بھی پانی ڈھوڈھو کر لانا شروع کر دیا۔ نام دیو جو پانی لاتا تھا وہ گدلا ہوتا تھا۔ اس میں آدھا پانی اور آدھی کیچڑ ہوتی تھی، لیکن وہ گدلا پانی پودوں کے لیے بہت مفید ہوتا تھا۔ یہ پانی نام دیو کے پودوں کے لیے آب حیات ثابت ہوتا تھا۔

نام دیو باغ میں رہتے رہتے جڑی بوٹیوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ ان جڑی بوٹیوں سے وہ بچوں کا علاج بھی کرتا تھا۔ ایک مرتبہ شہد کی مکھیوں نے باغ پر حملہ کر دیا۔ سارے مالی اپنی جان بچا کر بھاگ گئے، لیکن نام دیو اپنے کام میں مشغول رہا۔ مکھیوں نے اسے کاٹنا شروع کیا اور وہ وہیں بے جان ہو گیا۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کام کو کس انہماک اور سنجیدگی کے ساتھ انجام دیتا تھا۔ عبدالحق اس کے مزاج اور کام سے عشق کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

> "وہ بہت سادہ مزاج بھولا بھالا اور منکسر مزاج تھا۔ اس کے چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر ایک سے جھک کر ملتا۔ غریب تھا اور تنخواہ بھی کم تھی اس پر بھی اپنے غریب بھائیوں کی بساط سے بڑھ کر مدد کرتا رہتا تھا۔ کام سے عشق تھا اور آخر کام کرتے کرتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ "

نام دیو کے اندر ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی صلاحیت سے سب کو فائدہ پہنچاتا تھا۔ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچانا ایک بڑے آدمی کا کام ہوتا ہے۔ بڑا آدمی وہ نہیں ہوتا، جس کے پاس بہت سارا مال و دولت ہو بلکہ بڑا آدمی وہ ہوتا ہے، جو اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچائے، دوسروں کی مدد کرے۔ ' نام دیو۔مالی' ایسا ہی تھا، جو اپنی ذات سے ہمیشہ دوسروں کو فائدہ پہنچاتا تھا۔

"نام دیو۔مالی" فنی نقطۂ نظر سے ایک عمدہ خاکہ ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس خاکے میں اپنی فن کارانہ چابکدستی کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ "نام دیو۔مالی" کی فنی خوبیوں کو واضح کرنے کے لیے یہاں ہم خاکہ نگاری کے اجزائے ترکیبی کی رو سے اس کا تجزیہ کریں گے۔

خاکہ کے فنی لوازم میں واقعہ نگاری کی ایک خاص اہمیت ہوتی ہے۔ خاکے کی تعمیر میں واقعات سے مدد لی جاتی ہے، لیکن اس میں واقعات کی بہتات نہیں ہوتی۔ کسی بھی شخصیت سے متعلق چند اہم اور منفرد واقعات ہی بیان کیے جاتے ہیں، جس سے اس شخص کے اندر چھپے ہوئے گوشے سامنے آتے ہیں اور اس کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مولوی عبدالحق نے خاکہ "نام دیو۔مالی" میں نام دیو کی شخصیت کے انہیں پہلوؤں کو موضوع بحث لایا ہے، جس سے نام دیو کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے اور اس کی انفرادیت ہمارے سامنے واضح ہو جاتی ہے۔ ان میں پودوں کی دیکھ بھال، باغ کی جڑی بوٹیوں سے بچوں کا علاج، نام دیو کی ایمانداری، اس کی پودوں سے بے پناہ محبت، اس کی نیکی اور بڑائی، اس کی شرافت وغیرہ واقعات شامل ہیں۔ مولوی عبدالحق ' نام دیو۔مالی' کی نیکی اور شرافت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

> " اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو نام دیو نیک بھی تھا اور بڑا بھی۔
> تھا تو ذات کا دھیڑ پر اچھے اچھے شریفوں سے زیادہ شریف تھا۔"

کردار نگاری کے لحاظ سے "نام دیو۔مالی" ایک عمدہ خاکہ ہے۔ مولوی عبدالحق نے 'نام دیو۔مالی' پر خاکہ لکھ کر اس کے کردار کو زندہ و جاوید بنا دیا ہے۔ اس خاکے میں انہوں نے نام دیو کے جذبات و احساسات اور اس کی ذہنی کیفیات کی بہترین عکاسی کرتے ہوئے اس کے عادات و اطوار اور حرکات و سکنات کی ایسی موثر جھلک دکھائی ہے کہ مانو نام دیو اپنی تمام ظاہری و باطنی خصوصیات کے ساتھ ہمارے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور ہمارے ذہن پر اپنا گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ ایک عمدہ کردار کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ قاری پر اپنا نقش چھوڑ جائے۔

خاکے میں وحدت تاثر کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ وحدت تاثر سے مراد یہ ہے کہ خاکہ نگار شروع سے آخر تک واقعات کی کڑی کو اس فنی ہنر مندی سے ملائے کہ خاکے میں تسلسل بنا رہے اور قاری کے اندر خاکے کو پڑھنے میں دلچسپی پیدا ہو جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ خاکہ نگار خاکے کے تینوں حصوں تمہید، درمیانی حصے اور خاتمے کو اس خوبی سے ایک دوسرے میں پیوست کر کے پیش کرے کہ اس میں ایک خاص تاثر شروع سے آخر تک قائم رہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو خاکہ 'نام دیو۔مالی' میں تمام واقعات ایک دوسرے سے پوری طرح مربوط ہیں۔

خاکے کا ایک اہم وصف ایجاز و اختصار ہے۔ اختصار کا یہ مطلب نہیں کہ خاکہ مختصر ہونا چاہیے۔ یہاں اختصار کا مطلب یہ ہے کہ خاکے میں انہیں واقعات کو پیش کیا جائے، جو اس شخص کی زندگی کے منفرد اور انوکھے واقعات ہوں۔ خاکہ میں غیر ضروری واقعات کو پیش کرنے میں احتراز کرنا چاہیے۔ یہ خوبی خاکہ "نام دیو۔مالی" میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مولوی عبدالحق نے نام دیو کے اہم اور انوکھے واقعات کو دل کش انداز میں پیش کر کے اس خاکے کو عمدہ اور کامیاب بنا دیا ہے۔ اس خاکے کی یہی خوبی اسے اردو کے دوسرے خاکوں سے ممتاز بناتی ہے۔

کسی بھی ادبی صنف میں زبان و بیان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ خاکہ ایک ادبی صنف ہے۔ اس کا تعلق نثری بیانیہ سے ہے۔ زبان و بیان ہی کی مدد سے خاکہ نگار کسی شخص کی مکمل تصویر کھینچتا ہے اور واقعات کی پیش کش میں جان پیدا کرتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس خاکے میں نام دیو کا مختصر سا تعارف پیش کر کے اس کے اہم واقعات بیان کیے ہیں۔ عبدالحق نے اس خاکے میں موزوں الفاظ، حسین تشبیہات، دل کش استعارات وغیرہ کا موزوں استعمال کیا ہے، جس سے اس خاکے کے حسن اور دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے۔

13.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- اردو ادب میں مولوی عبدالحق کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ اردو کے محسن، نامور محقق، ماہر دکنیات، مترجم، قواعد نویس، لغت نویس اور عمدہ انشا پرداز تھے۔
- مولوی عبدالحق کی پیدائش 20/ اگست، 1870ء کو سرادہ (ہاپوڑ)، میرٹھ ضلع، اتر پردیش، میں ہوئی۔ مولوی عبدالحق کے آباو اجداد ہاپوڑ کے رہنے والے تھے، جن کا تعلق ہندو مذہب کے کائستھ برادری سے تھا، جنہوں نے شاہ جہاں کے عہد (عہدِ مغلیہ)

میں اسلام قبول کیا۔

- مولوی صاحب کے دادا کا نام شیخ محمد حسین، والد کا نام شیخ علی حسین اور والدہ محترمہ کا نام لطیفن تھا۔ عبدالحق کے آٹھ بھائی بہن تھے، جن میں چار بھائی ضیاالحق، محمود الحق، عبدالحق، احمد حسن اور چار بہنیں فاطمہ، زمانی، رقیہ اور بلقیس تھیں۔
- مولوی عبدالحق کی ابتدائی تعلیم ان کے آبائی گاؤں سرادہ اور ہاپوڑ میں ہوئی۔ پنجاب سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ علی گڑھ کے ایم اے او کالج سے انہوں نے 1893 میں انٹر میڈیٹ اور 1895 میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔
- مولوی عبدالحق بی اے کرنے کے بعد تلاش معاش کی غرض سے بمبئی چلے گئے۔ وہاں ریاست حیدرآباد کے نواب محسن الملک سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ وہ حیدرآباد آگئے اور ان کے توسط سے آصفیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ وہاں انہوں نے بارہ سال تک اپنی خدمات انجام دیں۔
- مولوی عبدالحق آخری وقت میں بہت بیمار رہنے لگے تھے۔ ان کی صحت ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ پیچش، یرقان اور سرطان جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوگئے تھے۔ 16/ اگست 1961 کو کراچی میں ان کا انتقال ہوگیا اور انہیں انجمن ترقی اردو کے احاطے میں دفن کیا گیا۔
- مولوی عبدالحق کی تصنیفی و تالیفی کاموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ انہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ بہت سی تالیف کیں، سینکڑوں کتابوں کے دیباچے لکھے، ان کے بہت سے خطبات اور مکاتیب موجود ہیں۔
- "چند ہم عصر" مولوی عبدالحق کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کو سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ کے ریسرچ اسکالر شیخ چاند نے 1937 میں مرتب کیا۔ اس وقت اس میں چودہ شخصیتوں کے خاکے شامل تھے۔ اس کے بعد اس کے ہر اڈیشن میں خاکوں کا اضافہ ہوتا گیا۔
- مولوی عبدالحق جن شخصیات پر خاکہ لکھتے تھے پہلے ان کے حالات و واقعات بیان کرتے تھے۔ اس کے بعد ان کے کاموں یا تصانیف پر مکمل تبصرہ بھی کرتے تھے۔
- خاکہ "نام دیو۔ مالی" میں مولوی عبدالحق نے نام دیو کی ایمانداری، پودوں سے اس کی محبت، پودوں کے تئیں اس کی محنت، اس کی خوش اخلاقی، اس کے بڑے پن، اس کی اعلیٰ سوچ، اس کی شرافت وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔
- "نام دیو۔ مالی" فنی نقطۂ نظر سے ایک عمدہ خاکہ ہے۔ اس خاکے میں فنِ خاکہ نگاری اپنی عروج پر ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس خاکے میں اپنی فن کارانہ چابک دستی کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

13.4 مشکل الفاظ

مقبرہ	مزار	Tomb / Mausoleum
دھیڑ	نیچ، چھوٹی ذات	Widow

احاطہ	چار دیواری سے گھرا میدان	Enclosure / Compound
سپرد	حوالے	Entrusted / Handed over
ہمہ تن	سر بسر، سب کا سب	Wholeheartedly / Entirely
تعجب	حیرانی	Surprise / Amazement
نگہداشت	حفاظت	Care / Protection
راگ	دکھ، درد، تکلیف	Melody / Tune
شناخت	پہچان	Recognition / Identity
جتن	کوشش	Effort / Endeavor
مہارت	ہنر، لیاقت	Skill / Expertise
شفقت	پیار، محبت	Kindness / Affection
بلا تامل	بغیر سوچے سمجھے	Without hesitation
بشاشت	خوشی، مسرت	Cheerfulness / Joy
جلاپا	رنج، جلن	Quarrel / Dispute
صلاحیت	لیاقت	Ability / Capability
کندن	خالص سونا	Pure gold / Tested
ستائش	تعریف	Praise / Appreciation
تلف	ضائع، ختم کرنا	Destroy / Waste
نڈھال	کمزور	Exhausted / Weary
قحط	اناج کی کمی	Famine
اوس-ان	ہوش و حواس	Composure / Sense
مسکن	رہنے کی جگہ	Residence / Abode
قدردان	قدر جاننے والا	Appreciative / Admirer
یورش	حملہ	Attack / Assault

منکسر المزاج	غریب مزاج	Humble / Modest
میراث	وراثت جو باپ، دادا سے ملے	Inheritance / Legacy
موروثی	ورثے میں ملی ہوئی	Hereditary
دنیاومافیہا	دنیااور جو کچھ اس میں ہے	The world and all it contains
حسن	خوبصورتی	Beauty
مصنوعی	بنایاہوا، جو قدرتی نہ ہو	Artificial
خصائص	خاصیت کی جمع	Characteristics / Features
آبِ حیات	امرت، ایسا پانی جسے پینے سے موت نہ آئے	Elixir of life
مصائب	مصیبت کی جمع، پریشانی	Hardships / Calamities

13.5 مشقیں

مشق 1: دیے گئے الفاظ کی مدد سے جملے بنائیں۔

1۔ مقبرہ .....

2۔ آب حیات .....

3۔ مسکن .....

4۔ نڈھال .....

5۔ قدردان .....

مشق 2: دیے جملوں میں صحیح اور غلط کی نشاندہی کیجیے۔

1۔ مولوی عبدالحق کی پیدائش میرٹھ میں ہوئی۔ ( )

2۔ خاکہ نام دیومالی رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے۔ ( )

3۔ مولوی عبدالحق آٹھ بھائی بہن تھے۔ ( )

4۔ مقبرہ رابعہ درانی حیدرآباد میں واقع ہے۔ ( )

5۔ مولوی عبدالحق کا انتقال کراچی میں ہوا۔ ( )

مشق 3: دیے گئے الفاظ کے معنی لکھیے۔

1۔ نگہداشت .....

2۔ بشاشت .....

3۔ دنیاومافیہا .....

4۔ مسکن .....

5۔ آبِ حیات .....

13.6 نمونہ امتحانی سوالات

13.6.1 معروضی سوالات:

1۔ مولوی عبدالحق کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی؟

1840(a) 1850(b) 1860(c) 1870(d)

2۔ مولوی عبدالحق کے والد محترم کا نام کیا تھا؟

(a) شیخ علی حسین (b) شیخ محمد حسین (c) ضیاالحق (d) احمد حسن

3۔ خاکہ "نام دیو۔مالی" مولوی عبدالحق کی کس کتاب میں شامل ہے؟

(a) اردوئے معلیٰ (b) چند ہم عصر (c) قدیم اردو (d) ہماری زبان

4۔ مقبرہ رابعہ درانی کہاں واقع ہے؟

(a) حیدرآباد (b) مرادآباد (c) اورنگ آباد (d) نظام آباد

5۔ مولوی عبدالحق کے کتنے بھائی بہن تھے؟

(a) آٹھ (b) پانچ (c) تین (d) سات

6۔ کتاب "چند ہم عصر کو پہلی مرتبہ کس نے مرتب کیا؟

(a) شیخ چاند (b) انوارالحق (c) خلیق انجم (d) شہاب الدین ثاقب

7۔ مولوی عبدالحق کی والدہ محترمہ کا نام کیا تھا؟

(a) جمیلن (b) سلیمن (c) لطیفن (d) کریمن

8۔ نام دیومالی کی موت کس وجہ سے ہوئی تھی؟

(a) شہد کی مکھیوں کے کاٹنے سے (b) سرطان (c) سانپ کے ڈسنے سے (d) چیتے کے حملے سے

9۔ مولوی عبدالحق کو بابائے اردو کا خطاب کس نے دیا؟

(a) محمد ساجد (b) محمد طارق (c) محمد یوسف (d) محمد ناظم

10۔ مولوی عبدالحق کا انتقال کہاں ہوا؟

(a)لاہور (b)کراچی (c)اورنگ آباد (d)میرٹھ

13.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ خاکہ "نام دیومالی" کا تعارف پیش کیجیے۔

2۔ مولوی عبدالحق کی تعلیمی زندگی پر روشنی ڈالیے۔

3۔ مولوی عبدالحق کی عملی زندگی کا حال لکھیے۔

4۔ مولوی عبدالحق کی کتاب "چند ہم عصر" کا تعارف پیش کیجیے۔

5۔ خاکہ "نام دیومالی" کی فنی خوبیوں کو اجاگر کیجیے۔

13.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ مولوی عبدالحق کے حالات زندگی بیان کیجیے۔

2۔ مولوی عبدالحق کی خاکہ نگاری پر روشنی ڈالیے۔

3۔ خاکہ "نام دیومالی" کا خلاصہ بیان کیجیے۔

13.6.1 کے جوابات:

D (i)	A (ii)	B (iii)	C (iv)	A (v)
A (vi)	C (vii)	A (viii)	C (ix)	B (x)

اکائی14: خاکہ

(مخدوم محی الدین: مجتبیٰ حسین)

اکائی کے اجزا

14.0		تمہید
14.1		مقاصد
14.2		مخدوم محی الدین (مجتبیٰ حسین)
	14.2.1	مجتبیٰ حسین کا تعارف
	14.2.2	مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری
	14.2.3	مخدوم محی الدین۔ "یادوں میں بسا آدمی" (متن)
	14.2.4	خلاصہ
14.3		اکتسابی نتائج
14.4		مشکل الفاظ
14.5		مشقیں
14.6		نمونہ امتحانی سوالات

14.0 تمہید

خاکہ اردو ادب کی ایک دلچسپ اور اہم صنف ہے۔جس کے معنیٰ کچا نقشہ' ڈھانچہ' یا لکیروں کی مدد سے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں۔خاکے کو انگریزی میں Profiles, Pen Portrait, Literary sketch, Pen Sketch, Sketch ناموں سے جانا جاتا ہے۔اردو میں اس لیے مرقع' شخصی مرقع' چہرہ بشرہ' قلمی تصویر' جیتی جاگتی تصویر جیسی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔

ادبی اصطلاح میں خاکے سے مراد وہ تحریر ہے جس میں نہایت مختصر طور پر اشارے کنائے میں کسی شخصیت کا ناک نقشہ' عادات و اطوار اور کردار کو سیدھے سادے انداز میں مبالغے کے بغیر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس کی چلتی پھرتی تصویر ساتھ ساتھ اس کے افکار و خیالات بھی ابھر کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

محمد حسین آزاد کی "آب حیات" میں اس صنف کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں لیکن مرزا فرحت اللہ بیگ اردو کے پہلے خاکہ نگار ہیں

جنھوں نے خاکہ "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" لکھا۔ بلاشبہ یہ اردو کا ایک مکمل اور بہترین خاکہ ہے۔مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، محمد طفیل، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین وغیرہ اردو کے چند اہم خاکہ نگار ہیں جنھوں نے اس صنف کو آگے بڑھایا۔ اس اکائی میں آپ اردو کے مشہور خاکہ نگار مجتبیٰ حسین کے اہم خاکہ "مخدوم محی الدین: یادوں میں بسا آدمی" کے متن کا مطالعہ کریں گے اور اس کی تشریحات سے بھی واقف ہوں گے۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- خاکہ نگار مجتبیٰ حسین سے واقف ہو سکیں۔
- خاکہ "مخدوم محی الدین: یادوں میں بسا آدمی" کے منتخب متن کا مطالعہ کر سکیں۔
- خاکہ "مخدوم محی الدین: یادوں میں بسا آدمی" کے خلاصے کو ذہن نشین کر سکیں۔

14.2 خاکہ "مخدوم محی الدین: یادوں میں بسا آدمی"

14.2.1 مجتبیٰ حسین کا تعارف:

خاکہ "مخدوم محی الدین: یادوں میں بسا آدمی" کے مصنف مجتبیٰ حسین ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی پیدائش 15 / جولائی 1936ء کو تحصیل چنچولی، ضلع گلبرگہ (کرناٹک) میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ 1953ء میں گلبرگہ انٹر میڈیٹ کالج سے انٹر میڈیٹ کا امتحان کامیاب کیا پھر 1956ء میں آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے بی اے کی سند لی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد کچھ دنوں محکمۂ مال میں ملازمت کی۔ پھر یہ ملازمت چھوڑ دی اور روز نامہ "سیاست" حیدرآباد سے وابستہ ہوئے۔ 12/ اگست 1962ء سے اسی اخبار میں اپنے بڑے بھائی محبوب حسین جگر کے کہنے پر مقبول مزاحیہ کالم "شیشہ و تیشہ" لکھنا شروع کیا۔ ابتدا میں 'کوہ پیما' کے فرضی نام سے یہ کالم لکھتے رہے۔

1964ء میں انہوں نے ماہنامہ "صبا" میں اپنے اصلی نام سے پہلا مزاحیہ مضمون "ہم طرف دار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں" شائع کیا۔ یہ مضمون ادبی حلقوں میں بہت مشہور ہوا۔ مجتبیٰ حسین زندہ دلان حیدرآباد کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ 1962ء میں حکومت آندھرا پردیش کے محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ میں ملازم ہوئے اور 1972ء تک اس محکمے سے وابستہ رہے۔ 1972ء میں حیدرآباد سے دہلی منتقل ہوئے اور نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کے پبلی کیشن ڈپارٹمنٹ سے وابستہ ہوئے جہاں سے 1991ء میں بحیثیت ایڈیٹر وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ 1993ء میں وہ پھر سے "سیاست" میں مزاحیہ کالم نگاری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر 2011ء میں یونیورسٹی آف حیدرآباد میں بحیثیت وزیٹنگ پروفیسر ایک سال کے لیے ان کا تقرر عمل میں آیا۔

مجتبیٰ حسین نے اپنے ادبی سفر کا آغاز مزاحیہ کالم نگاری سے کیا تھا بعد ازاں انھوں نے کئی مزاحیہ مضامین، خاکے اور سفر نامے وغیرہ لکھے۔ انھیں مختلف اکادمیوں، تنظیموں اور اداروں نے مختلف انعامات و اعزازات سے نوازا۔ 2007ء میں حکومت ہند کی جانب سے

انھیں "پدم شری" کا اعزاز حاصل ہوا۔ مجتبیٰ حسین کو مختلف ممالک جیسے جاپان، برطانیہ، فرانس، امریکہ، کنیڈا، روس، ازبکستان، پاکستان، سعودی عرب، سلطنت عمان اور متحدہ عرب امارات کی سیاحت کا موقع بھی ملا- مجتبیٰ حسین کا انتقال 27/ مئی 2020ء کو حیدرآباد، تلنگانہ میں ہوا۔ مجتبیٰ حسین کی چند اہم کتابیں درج ذیل ہیں:

(1) تکلف برطرف (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
(2) قطع کلام (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
(3) قصہ مختصر (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
(4) بہر حال (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
(5) آدمی نامہ (خاکے)
(6) بالآخر (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
(7) جاپان چلو جاپان چلو (سفر نامہ)
(8) الغرض (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
(9) سو ہے وہ بھی آدمی (خاکے)
(10) چہرہ در چہرہ (خاکے)
(11) سفر لخت لخت (سفر نامہ)
(12) آخر کار (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)
(13) ہوئے ہم دوست جس کے (خاکے)
(14) میرا کالم (کالموں کا انتخاب)
(15) آپ کی تعریف (خاکے)
(16) مہرباں کیسے کیسے (خاکے)
(17) اور امریکہ گھاس کاٹ رہا ہے (سفر نامہ اور امریکہ کے بارے میں کالموں کا انتخاب)۔ ان کے انشائیوں، سفر ناموں اور خاکوں کے ترجمے کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں-

14.2.2 مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری:

مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ خاکوں کے چھ مجموعے آدمی نامہ (1981)، سو ہے وہ بھی آدمی (1987)، چہرہ در چہرہ (1993)، ہوئے ہم دوست جس کے (1999)، آپ کی تعریف (2005) اور مہرباں کیسے کیسے (2009) شائع ہو چکے ہیں۔ درج بالا آخر الذکر دو مجموعے سید امتیاز الدین کے مرتب کردہ ہیں۔ ان کے علاوہ کئی خاکے ان کے مضامین، کالموں اور سفر ناموں میں بھی پورے یا ادھورے درج ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے تقریباً دو سو خاکے لکھے ہیں جو ان کے مختلف مجموعوں اور مختلف رسائل میں شامل ہیں۔ بہت سے خاکے دوست احباب کی فرمائش یا اصرار پر کسی نہ کسی تقریب یا جلسوں کے کیے لکھے گئے جیسے کسی کتاب کی رسم اجرا کسی کی تہنیتی تقریب اور بعض خاکے کسی کے داغ مفارقت دیے جانے پر تحریر کیے۔ ایسے خاکوں کی تعداد بھی خاصی ہے جن میں انھوں نے کسی شخصیت سے متاثر ہو کر اپنے حقیقی جذبات اور تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے اپنی خاکہ نگاری کی ابتدا اپنے ایک بزرگ دوست حکیم یوسف حسین خاں کی فرمائش پر کی۔ 1969ء میں ان کے شعری مجموعہ "خواب زلیخا" کی تقریب رسم اجرا میں پڑھنے کے لیے لکھا تھا جسے صاحب خاکہ اور سامعین خاکہ دونوں نے بے حد پسند کیا۔ یہ مجتبیٰ حسین کا پہلا خاکہ تھا۔

مجتبیٰ حسین کے خاکے سنجیدگی، تناسب، توازن، غیر جانب داری اور ایمانداری جیسی خصوصیات موجود ہیں۔ وہ انسانی نفسیات کے نباض بھی ہیں، نہ صرف شخصیات کی خوبیوں، کوتاہیوں اور خامیوں پر نظر رکھتے ہیں بلکہ خود اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔

اور ہنستے ہنساتے خاکہ کے مرکزی کردار کی سچی مرقع کشی کی ہے۔ مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری کی اہم خوبی یہ ہے کہ وہ مختصر مگر جامع طور پر کسی شخصیت کی بھرپور، جاندار اور متحرک تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ان کے خاکوں کے ذریعہ اس عہد کے حالات اور کرب و اضطراب، تہذیب، وضع قطع، مشاعروں کے آداب اور دوسرے تہذیبی مرقعوں کے علاوہ اس دور کی معاشی، تہذیبی، ادبی اور لسانی زبوں حالی کو بڑی خوش اسلوبی سے طنزیہ و مزاحیہ پیرائے میں پیش کیا ہے۔ان خاکوں سے خود مجتبیٰ حسین کے ذہنی میلان کا بھی اندازہ ہوتا ہے وہ اپنے خاکوں میں بات میں بات پیدا کرتے ہوئے، مختلف چھوٹے چھوٹے واقعات اور مثالوں کے ذریعہ شخصیات کے مختلف گوشوں کو اشارے اور کنائے میں دلچسپ اور پر لطف انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جس سے قاری کو نہ صرف صاحب خاکہ سے مجتبیٰ کے تعلقات کا علم ہوتا ہے بلکہ اردو ادب کے بعض پہلو بھی نمایاں ہوتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین بر صغیر کے معروف اور ہر دلعزیز طنز و مزاح نگار ہیں۔ انھوں نے مزاح کے میدان میں کالم نویسی کے وسیلے سے قدم رکھا۔ان کی شخصیت کے ہمہ گیر پہلو ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے کالموں، مضامین اور سفر ناموں میں طنز و مزاح کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ انھوں نے خاکہ نگاری میں بھی ایک ممتاز و منفرد مقام پیدا کیا۔ انھوں نے اپنی مزاح نگاری سے نئے نئے پہلو نکالتے ہیں، جس کے پس پردہ انسانی اقدار، انسانی بھلائی اور درد و الم پوشیدہ ہے۔

مجتبیٰ حسین کی فطرت نے نہایت سنجیدہ شخصیت میں بھی مزاح کا گوشہ ڈھونڈ لیا ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ خلاف فطرت پہلو ان پر بالکل فطری انداز میں جھلکتا ہے۔ان کے خاکوں میں طنز بڑا خوشگوار اور نصیحت آمیز معلوم ہوتا ہے۔ اور طنز و مزاح کا امتزاج لطیف انداز اور ہم آہنگی بھی ملتی ہے۔ ان کے اسلوب میں کسی بھی طرح کا کوئی تکلف یا بناوٹ کی تکرار نہیں دکھائی دیتی ہے۔ مہارت کے ساتھ شخصی کمزوریوں کو بھی دوستانہ اور ہمدردانہ رویہ کے ساتھ اسے دلچسپ پیرائے میں بیان کر دیتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کا مطالعہ اور زاویۂ نگاہ وسیع ہے۔ان کی قوت مشاہدہ بہت تیز ہے کسی بھی شخص کا مطالعہ کرتے ہوئے ژرف نگاہی سے کام لیتے ہیں اور شخصیت کی خامیوں اور کمزوریوں کو بڑی دلچسپ مزاحیہ اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ اپنے مزاح کے ذریعے ان کی بڑی سے بڑی خامی کو شگفتہ اور خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی تحریر میں روانی، شگفتگی، شائستگی اور بے ساختگی ہوتی ہے۔ وہ بات کو بے تکلفی کے ساتھ روزمرہ کی گفتگو کے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کا اپنا ایک کا پر مزاح، دل چسپ اور منفرد اسلوب ہے وہ لطیفہ ڈھالنے کا فن بخوبی جانتے ہیں مزاح اور سنجیدگی کا امتزاج بڑی فن کاری سے کرتے ہیں ان کے خاکے زندگی کی گہری بصیرت کا پتا دیتے ہیں۔

14.2.3 مخدوم محی الدین۔"یادوں میں بسا آدمی "کا متن:

پچیس چھبیس برس اُدھر کی بات ہے۔ مخدوم محی الدین "انڈر گراؤنڈ" تھے اور میں مڈل اسکول کا طالب علم تھا۔ اُن دنوں بھی مجھے اتنی ہی انگریزی اور اردو آتی تھی جتنی کہ آج آتی ہے۔ لہٰذا میں اپنے تئیں "انڈر گراؤنڈ" کا آسان ترجمہ "زیر زمین" کر کے گھنٹوں حیران رہا کرتا تھا کہ مخدوم بھائی آخر زیر زمین رہ کر کیا کرتے ہیں۔ مجھے تو وہ "یکے از معدنیات" قسم کی کوئی چیز لگتے تھے۔۔۔ جن دنوں "بتّے بھائی" یعنی سجاد ظہیر پاکستان میں پارٹی کی سرگرمیوں کے سلسلے میں روپوش تھے۔ تاجکستان کے مشہور شاعر مرزا ترسون زادہ پاکستان کے دورے پر آئے اور ایک پاکستانی شاعر سے فارسی میں پوچھا "سجاد ظہیر کجا است؟"

پاکستانی شاعر نے بڑی روانی کے ساتھ فارسی میں ترکی بہ ترکی جواب دیا" سجاد ظہیر زیر زمین است" یہ سنتے ہی مرزا ترسون زادہ کی آنکھوں میں کم و بیش اتنی ہی روانی کے ساتھ آنسو آ گئے۔ بولے "یہ کب ہوا؟ ہمیں تو کچھ بھی پتہ نہ چلا، آخر انھیں کیا بیماری ہو گئی تھی۔"

"پاکستانی شاعر کو اچانک اپنی فارسی دانی کا احساس ہوا تو ہاتھوں اور بھنوؤں کے اشارے سے مابقی فارسی بولتے ہوئے مرزا ترسون زادہ پر "زیر زمین" اور "روپوش" ہونے کے نازک فرق کو واضح کیا۔ اسی طرح مخدوم بھی میرے لیے ایک عرصہ تک "زیر زمین" ہی رہے اور کسی نے میری غلط فہمی دور نہیں کی۔

پھر جب ہم نے شعور سنبھالنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ مخدوم بڑی تیزی سے ہمارے شعور کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ پھر حصہ بنتے بنتے وہ مکمل شعور ہی بن گئے۔ مخدوم سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ میرے ایک دوست مخدوم کے مجموعہ کلام "سرخ سویرا" کو رحل پر رکھ کر نہ صرف پڑھا کرتے تھے بلکہ مطالعے کے دوران میں آگے اور پیچھے جھولتے بھی تھے۔ ہے کوئی شاعر جس کا کلام اس طرح پڑھا گیا ہو؟

ہمارا سوشلزم وہی تھا جو مخدومؔ اور فیضؔ کی شاعری، کرشن چندر کے افسانوں، سجاد ظہیر اور سردار جعفری کی تحریروں کے وسیلے سے ہم تک پہنچا تھا۔ گویا یہ خالصتاً اُردو سوشلزم تھا۔ مگر ہم حیدر آبادیوں کے لیے مخدومؔ صرف شاعر اور دانشور نہیں تھے بلکہ بہت کچھ تھے۔ مخدوم کی زیر زمین رہنے کی عادت کی وجہ سے ان کی شخصیت کے اطراف ایک عجیب سا سحر پیدا ہو گیا تھا۔ یار لوگوں نے ان کے بارے میں باتیں بھی کچھ ایسی ہی پھیلا رکھی تھیں کہ کبھی کبھی مخدومؔ ایک مافوق الفطرت شے دکھائی دیتے تھے، کہا جاتا تھا کہ مخدومؔ بیک وقت چار مختلف مقامات پر موجود رہتے ہیں۔ مخدومؔ کے بارے میں اس قسم کے انکشافات کو سن کر ہمارے کمسن اور نوخیز خون کی جو حالت ہوتی ہو گی اس کا اندازہ آپ خود بھی لگا سکتے ہیں، خون رگوں میں ابلا پڑتا تھا جسے بعد میں مخدومؔ کے کلام کے ذریعے ہی ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔ علاج بالمثل اسی کو کہتے ہیں۔ اس وقت تک مخدومؔ کو نہیں دیکھا تھا حالانکہ ان کے ہر جگہ (OMNI PRESENT) ہونے کی اتنی ساری افواہیں سن رکھی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ مخدوم جب قید سے رہا ہوئے تو ہمیں اطلاع ملی کہ وہ شاہ آباد میں مزدوروں کے ایک جلسے سے خطاب کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ ان دنوں میں گلبرگہ انٹر میڈیٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ میں اور میرا وہ دوست جو "سرخ سویرا" کو رحل پر رکھ کر پڑھا کرتا تھا اسٹیشن کی طرف بھاگے۔ معلوم ہوا کہ شاہ آباد جانے والا مدراس میل ابھی جا چکا ہے، انکوائری سے پوچھا کہ شاہ آباد کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہے۔ جواب ملا" 25 کلو میٹر"۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ آج عشق، آتش نمرود میں کود پڑے گا اور 25 کلو میٹر کا فاصلہ پیدل طے کرے گا۔ یہ ہماری زندگی کی پہلی اور آخری "لانگ مارچ" تھی۔ مگر شاہ آباد پہنچے تو معلوم ہوا کہ مخدومؔ آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ماتھے پیٹ کر چپ ہو رہے۔

پھر میں حیدرآباد آیا۔ مخدوم سے ان گنت ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر یوں ہوا کہ کئی برس بعد ایک دن میں، پروفیسر حسن عسکری اور مخدومؔ حیدر آباد کے ویکاجی ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ مجھے مخدوم سے ملنے کا وہ پہلا اور اچھوتا اشتیاق یاد آیا۔ میں نے مخدوم سے کہا "مخدوم بھائی! آپ کو پتہ نہیں کہ کئی برس پہلے آپ سے ملنے کے لیے میں اور میرے ایک ساتھی نے گلبرگہ سے شاہ آباد تک پیدل سفر کیا تھا۔"

یہ سنتے ہی نہایت رازداری کے انداز میں بولے "اچھا تو اب ملو۔ بتاؤ کیا کام تھا تمہیں مجھ سے؟ کوئی خاص بات تھی کیا؟"

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ میں نے کہا" مخدوم بھائی! اب تو مجھے یاد نہیں رہا کہ میں اس وقت آپ سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ زندگی کے سفر میں بہت سی باتیں، بہت سی خواہشیں اور بہت سے کام یونہی اوجھل ہو جاتے ہیں۔"

بولے" یاد کر کے بتانا۔ تمہارا حافظہ خاصا کمزور ہوتا جارہا ہے۔ اور ہاں آئندہ کبھی پیدل چلنے کی غلطی نہ کرنا۔" یہ کہہ کر مخدوم نے زور دار قہقہہ لگایا (مجھے آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ مخدوم نے یہ قہقہہ مجھ پر لگایا تھا یا اپنے آپ پر۔ بعض قہقہوں کے مبدا کا سراغ لگانا بہت دشوار ہوتا ہے) اپنی بات کو ختم کر کے مخدوم نے مجھ سے اور حسن عسکری سے زور دار مصافحے کیے۔ ان کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی چبھتا ہوا فقرہ کہتے، جو وہ اکثر کہتے تھے اور مذاق کی کوئی بات کہتے، جو وہ اکثر کرتے تھے تو مخاطب سے مصافحہ ضرور کر لیا کرتے تھے۔

مخدوم کی بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کے بے شمار واقعات مجھے یاد ہیں۔ اپنا مذاق آپ اڑانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

ان کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی نئی غزل کہتے تو اسے سنانے کے لیے دوڑ پڑتے تھے۔ اپنی اس عادت سے متعلق خود ہی ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے۔ ایک دن اُن سے غزل ہو گئی تو فوراً اورینٹ ہوٹل چلے آئے کہ کوئی مائی کا لال مل جائے تو اسے غزل سنائیں۔ یہاں کوئی نہ ملا تو" صبا" کے دفتر چلے گئے۔ وہاں بھی کوئی نہ ملا۔ تھک ہار کے چائنیز بار میں چلے گئے۔ بار کے بیرے قاسم کو بلا کر کہا۔" اچھا قاسم آؤ میرے پاس بیٹھو۔ میں تمھیں اپنی تازہ غزل کے کچھ شعر سنانا چاہتا ہوں۔" اپنی ہوشمندی کے ہزار ثبوت پیش کرنے کے باوجود قاسم نے اس رات ان کی غزل نہیں سنی یہ لطیفہ سنا کر خود ہی ہنستے تھے اور مخاطب سے زور دار مصافحہ کرتے تھے۔

وہ چھوٹوں کے ساتھ بہت شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ حیدر آباد کے کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی تربیت انہوں نے کی۔ سلیمان اریب، عزیز قیسی، اقبال متین، وحید اختر، جیلانی بانو، انور معظم، آمنہ ابوالحسن، شاذ تمکنت، عاتق شاہ، عوض سعید اور مغنی تبسم یہ سب مخدومؔ سے متاثر تھے۔ وہ میری بھی ہر قدم پر ہمت افزائی کرتے تھے۔ چنانچہ مجھے "مسخرا" کہہ کر پکارتے تھے۔ اب اس سے زیادہ کوئی میری ہمت افزائی کر کے دکھا دے۔ اُردو کے مسخروں یعنی مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس ہوئی تو اس کا افتتاح انھوں نے ہی فرمایا۔ میرے مضامین کے پہلے مجموعے کی رسم اجرا بھی انھوں نے ہی از راہ تمسخر انجام دی تھی۔

مجھے اس وقت مخدوم کا وہ مضمون یاد آرہا ہے جو انھوں نے حیدر آباد کے اُردو ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بہ زبان انگریزی "السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا" میں لکھا تھا۔ مضمون کا چونکہ پہلے سے اعلان ہو چکا تھا اس لیے جس دن ویکلی کا شمارہ حیدر آباد پہنچا اردو ادیبوں اور شاعروں نے دھڑا دھڑ اس کی کاپیاں خرید لیں۔ نیوز پیپر اسٹال والا سخت حیران کہ اُردو شاعروں کو آج کیا ہو گیا کہ انگریزی کا رسالہ خریدے چلے جارہے ہیں۔ میں عابد روڈ سے گزر رہا تھا کہ حیدر آباد کے ایک بزرگ شاعر ویکلی کا شمارہ ہاتھ میں پکڑے میرے پاس آئے اور کہنے لگے "بھئی! اس میں مخدوم کا مضمون کہاں ہے بتاؤ؟"

میں نے مخدوم کا مضمون نکال کر بتایا تو بولے "اچھا اب یہ بتاؤ کہ اس میں میرا نام کہاں ہے؟" پہلے تو میں بڑی دیر تک اپنا نام مضمون میں تلاش کرتا رہا۔ یہ نہ ملا تو شاعر موصوف کا نام تلاش کرنے لگا۔ حسب توقع یہ بھی وہاں موجود نہ تھا۔ مگر اسی بیچ مجھے ایک شرارت سوجھی۔ میں نے سلیمان اریب کے نام کے نیچے ایک لکیر کھینچتے ہوئے شاعر موصوف سے کہا" لیجئے قبلہ! یہ رہا آپ کا نام۔"

شاعر موصوف ویکلی کے شمارے کو سینے سے لگائے خوش خوش چلے گئے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد مخدومؔ انہیں مل گئے تو انھوں

نے بڑی احسان مندی کے ساتھ مضمون میں اُن کا نام شامل رکھنے کا شکریہ ادا کیا۔

مخدوم نے کہا" قبلہ! آپ کو کس نے بتایا کہ آپ کا نام مضمون میں شامل ہے"

وہ بولے "ابھی ابھی مجتبیٰ نے مجھے بتایا ہے۔"

مخدومؔ بولے "مولانا! مجتبیٰ کو بھی اتنی ہی انگریزی آتی ہے جتنی کہ آپ کو آتی ہے۔ جایئے جایئے، آپ کا نام میں نے نہیں لکھا ہے۔"

اس مضمون کے بعد حیدر آباد کے کئی نوجوان ادیبوں کو مخدوم سے شکایت ہوگئی۔ ایک دن اورینٹ ہوٹل میں یہی مضمون زیر بحث تھا۔ مخدوم بولے بھئی! ادیب اور شاعر کو اپنے نام اور شہرت سے بے نیاز رہنا چاہیے۔ اس کا نام یا کلام کہیں چھپے یا نہ چھپے اسے تو بے تعلق رہنا چاہئے۔" اس کے بعد بحث ختم ہوگئی اور دوسرے مسائل زیر بحث آگئے۔ مگر اسی بیچ مجھے پھر ایک شرارت سوجھی، میں نے بالکل ہی بے نیاز ہو کر کہا" مخدومؔ بھائی! آپ کی ایک نظم دلّی کے ایک رسالے کے تازہ شمارے میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔"

پوچھا" کونسے رسالے میں؟"

میں نے کہا" مجھے نام تو یاد نہیں مگر عابد روڈ کے بس اسٹاپ والے بک اسٹال پر ابھی ابھی میں یہ رسالہ دیکھ کر آرہا ہوں۔"

مخدومؔ تھوڑی دیر تو انجان اور بے تعلق بنے رہے۔ پھر اچانک کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے جیسا کہ ان کی عادت تھی۔ پھر بولے "اچھا اب چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

میرے ساتھ کچھ احباب بھی بیٹھے تھے۔ میں نے کہا" مخدوم بھائی یہاں سے سیدھے بک اسٹال پر جائیں گے۔ چلو ہم بھی چلیں۔"

ہم لوگ بک اسٹال پر پہنچے تو مخدوم سچ مچ وہاں موجود تھے اور رسالوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ جونہی ہم پر ان کی نظر پڑی، انھوں نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولے "کیوں بے مسخرے۔ ہم سے بدمعاشی کرتا ہے۔"

میں نے کہا" مخدوم بھائی میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ شاعر اپنے کلام سے کس حد تک بے نیاز رہ سکتا ہے۔"

مخدومؔ کو حیدر آباد سے بے پناہ پیار تھا جسے وہ ہمیشہ "وطن مالوف" کہا کرتے تھے۔ حیدر آباد مخدوم کے اندر تھا اور مخدوم حیدر آباد کے اندر۔ حیدر آباد کی گلی گلی میں ان کے چرچے تھے۔ حیدر آبادیوں نے انھیں ٹوٹ کر چاہا بھی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے تو اپنے گھر کا نام ہی" چنبیلی کا منڈوا" رکھ چھوڑا تھا جو مخدوم کی ایک مشہور نظم کا عنوان ہے۔ لوگ اپنے گھروں کے نام رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر گوڑ نے اپنے گھر کا عنوان رکھا تھا۔ اگرچہ اپنے گھر میں معنویت پیدا کرنے کے لیے چنبیلی کی بیل بھی لگا رکھی تھی مگر اب بھی ان کے گھر میں "چنبیلی کا منڈوا" کم اور مخدوم کی نظم زیادہ نظر آتی ہے۔

وہ ڈسپلن کے بڑے پابند تھے۔ سارا دن پارٹی کا کام کرتے اور شام کو تھوڑا سا وقت دوستوں میں گزارتے تھے۔ جہاں احساس ہوا کہ وقت ضائع ہو رہا ہے جھٹ سے اٹھ جاتے تھے اور محفل سے غائب۔ وہ دنیا سے گئے بھی اسی طرح یعنی ایک دن چٹ سے چلے گئے۔

مخدوم کے جنازے میں ہزاروں لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔۔۔ اور یوں وہ پھر "زیر زمین" چلے گئے۔ مگر اس بار وہ "زیر زمین" جاتے ہوئے اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے گئے۔

مخدوم کے بارے میں اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ مخدومؔ ایک انسان نہیں تھے، جیتا جاگتا سانس لیتا ہوا شہر تھے۔ اس شہر کی ہم نے برسوں سیر کی۔ ہم سب اسی شہر میں آباد تھے۔

مخدومؔ کے انتقال کے بعد پہلی بار احساس ہوا کہ "غریب الوطنی" کس کو کہتے ہیں۔ اس شہر میں کتنی سڑکیں تھیں، کتنی گلیاں تھیں، کتنے موڑ تھے اور یہ سب راستے انسانیت اور سچائی کی طرف جاتے تھے۔

14.2.4 خلاصہ:

خاکہ "مخدوم محی الدین۔ یادوں میں بسا آدمی" مجتبیٰ حسین کے خاکوں کے پہلے مجموعے "آدمی نامہ" (1981ء) میں شامل ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اس مجموعے کے ہر خاکے کے عنوان میں صاحب خاکہ کا نام لکھ کر اس کا بنیادی وصف بھی لکھ دیا ہے جیسے کنہیالال کپور: لمبا آدمی، راجندر سنگھ بیدی: سوہے وہ بھی آدمی، مخدوم محی الدین: یادوں میں بسا آدمی وغیرہ۔ مجتبیٰ حسین کے خاکوں کی قابل ذکر خوبی یہ ہے کہ وہ جس شخصیت پر بھی قلم اٹھائیں اپنی شگفتہ بیانی اور منفرد مزاحیہ انداز سے اس کو دلچسپ اور موثر بنادیتے ہیں۔ ان کا خاکہ "مخدوم محی الدین" بھی اسی طرح کا ایک دلچسپ خاکہ ہے۔

مجتبیٰ حسین نے بے شمار خاکے تحریر کیے ہیں۔ ان میں صحافی، سیاست داں، ادیب، شاعر اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیتیں شامل ہیں۔ انھوں نے حیدرآباد کے مشہور شاعر مخدوم محی الدین پر نہایت دلچسپ خاکہ لکھا ہے۔

مخدوم محی الدین کی آزادانہ اور انقلابی روش ملازمت کی زنجیروں کو زیادہ دنوں تک برداشت نہ کرسکی اور وہ ملازمت سے مستعفی ہو کر کمیونسٹ پارٹی کے ہمہ وقتی رکن بن گئے۔ وہ تلنگانہ کے مزدوروں اور کسانوں کی لڑائیوں میں شریک رہے اور ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے رہے۔ متعدد بار گرفتار ہوئے اور روپوش بھی ہوتے رہے۔ مخدوم ترقی پسند انقلابی شاعر تھے۔

مجتبیٰ حسین نے اس خاکے میں چند واقعات اور تاثرات اور اپنی یادداشتوں کی مدد سے مخدوم محی الدین کی شخصیت کی قلمی تصویر بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ خاکہ نہ بہت زیادہ طویل ہے نہ مختصر۔ بلکہ میانہ روی اور اعتدال پسندی کا نمونہ ہے۔ اس خاکے کی اہم خوبی یہ ہے کہ انھوں نے جس طرح مخدوم کو دیکھا اور سمجھا بالکل اسی طرح تحریر کیا ہے اس خاکہ میں ان کا حلیہ درج نہیں ہے پھر بھی قاری کو اس میں کسی بات کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ مجتبیٰ حسین نے بڑی چابکدستی سے یہ خاکہ تراشا ہے۔ جس میں ان کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخدوم کی وضع قطع، اخلاق وعادات، رہن سہن کے طور طریق سب کچھ مجتبیٰ حسین کی گرفت میں ہیں۔ ان میں سے منتخب اوصاف، باتوں یا واقعات یا لطیفے کو مناسب وقت پر پیش کردیتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے اس خاکہ میں اکثر مخدوم سے ہوئی مختلف ملاقاتوں کے احوال کو واقعات کے وسیلے سے بیان کیا ہے۔ اس خاکہ کے مطالعہ سے مخدوم کی انقلاب پسندی، بذلہ سنجی، خوش مذاقی اور زندہ دلی کی تصویریں ہماری آنکھوں میں پھر جاتی ہیں۔

خاکہ لکھتے وقت مجتبیٰ حسین اپنے موضوع کی شخصیت کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں۔ اور جب اس کا خاکہ لکھتے ہیں تو چند ہی جملوں میں غیر جانب داری کے ساتھ اس کی خوبیوں اور خامیوں کو پوری صداقت اور سچائی سے خاکے میں سمیٹ لیتے ہیں مثلاً:

"ہم حیدرآبادیوں کے لیے مخدوم صرف شاعر اور دانشور نہیں تھے بلکہ بہت کچھ تھے۔ مخدوم کی زیر زمین رہنے کی عادت کی وجہ سے ان کی شخصیت کے اطراف ایک عجیب سا سحر پیدا ہو گیا تھا۔ یار لوگوں نے ان کے بارے میں باتیں بھی کچھ ایسی ہی پھیلا رکھی تھیں کہ کبھی کبھی مخدوم ایک مافوق الفطرت سے دکھائی دیتے تھے، کہا جاتا تھا کہ مخدوم بیک وقت چار مختلف مقامات پر موجود رہتے ہیں۔"

اس خاکے میں جہاں مخدوم محی الدین کی شخصیت کے کئی واقعات بیان کیے ہیں وہیں مخدوم کی روپوشی کے بارے میں اپنے مزاحیہ انداز میں مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

"پچیس چھبیس برس ادھر کی بات ہے۔ مخدوم محی الدین "انڈر گراؤنڈ' تھے اور میں مڈل اسکول کا طالب علم تھا۔ ان دنوں بھی مجھے اتنی ہی انگریزی اور اردو آتی تھی جتنی کہ آج آتی ہے۔ لہٰذا میں اپنے تئیں "انڈر گراؤنڈ" کا آسان ترجمہ "زیر زمین" کر کے گھنٹوں حیران رہا کرتا تھا کہ مخدوم بھائی آخر زیر زمین رہ کر کیا کرتے ہیں۔ مجھے تو وہ "یکے از معدنیات" قسم کی کوئی چیز لگتے تھے۔"

"انڈر گراؤنڈ" کا ترجمہ زیر زمین کر کے مجتبیٰ حسین نے دلکش مزاح پیدا کیا۔ اور جب مخدوم کا انتقال ہوا اور حقیقت میں وہ زیر زمین چلے گئے تب اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مجتبیٰ حسین لکھتے ہیں:

"مخدوم کے جنازے میں ہزاروں لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔۔۔ اور یوں وہ پھر "زیر زمیں" چلے گئے مگر اس بار وہ "زیر زمیں" جاتے ہوئے وہ اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے گئے۔"

مجتبیٰ نے اس خاکے میں مختلف اوصاف، عادتوں اور روزمرہ کے احوال و کوائف کے ذریعہ مخدوم محی الدین کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

مخدوم کا شعری مجموعہ "سرخ سویرا" کی شہرت اور اس سے عقیدت کو مجتبیٰ حسین نے بڑے ہی والہانہ انداز میں پیش کیا ہے اور مخدوم سے ملنے کے شوق و جستجو اور تگ و دو کے مختلف مراحل کو انھوں نے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ پھر ملاقات کے بعد مخدوم محی الدین کی بذلہ سنجی نظریے اور اپنے کام کاج کے پابند ہونے کے مختلف واقعات بھی پیش کیے ہیں۔

حیدرآباد میں مخدوم محی الدین کے زیر سایہ کئی ادبا و شعرا نے اپنی لیاقتوں اور صلاحیتوں اور اپنے کلام کو جلا بخشتے تھے۔ مخدوم کے اندر انسانیت، سچائی، ہمدردی، حب الوطنی اور جبر و استعداد کے خلاف لڑنے والے سپاہی کے اوصاف موجود تھے جس کا اندازہ مجتبیٰ حسین کے اس خاکے سے ہوتا ہے۔ انھوں نے مخدوم کی شخصیت کو ایک شہر سے تعبیر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"مخدوم ایک انسان نہیں تھے، جیتا جاگتا سانس لیتا ہوا شہر تھے۔ اس شہر کی ہم نے برسوں سیر

کی۔ ہم سب اسی شہر میں آباد تھے۔اس شہر میں کتنی سڑکیں تھیں، کتنی گلیاں تھیں، کتنے موڑ تھے اور یہ سب راستے انسانیت اور سچائی کی طرف جاتے تھے۔"

مخدوم سے مجتبیٰ حسین کو بڑی قربت رہی ہے۔ان کی ایک عادت کا بڑی خوبی سے ذکر یوں کرتے ہیں:

"ان کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی چبھتا ہوا فقرہ کہتے، جو وہ اکثر کہتے تھے اور مذاق کی کوئی بات کہتے، جو وہ اکثر کہتے تھے تو مخاطب سے مصافحہ ضرور کر لیا کرتے تھے۔"

مجتبیٰ بخوبی واقف ہیں کہ ہر ادیب اور شاعر اپنا مضموں اور کلام سنانے اور اپنی تعریف سننے کا مشتاق ہوتا ہے۔ مخدوم محی الدین بڑے شاعر تھے اور بہت اچھے انسان بھی، مگر وہ بھی اس بات سے عاری نہیں تھے، بظاہر مخدوم خود کو بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش کرتے اور اپنی گفتگو میں کہا کرتے تھے کہ "ادیب اور شاعر کو اپنے نام اور شہرت سے بے نیاز رہنا چاہیے۔اس کا نام یا کلام کہیں چھپے یا نہ چھپے اسے تو بے تعلق رہنا چاہیے۔ مجتبیٰ حسین کو شرارت سوجھی اس شرارت کا ماجرا اس خاکے میں بڑے ہی شگفتہ انداز میں پیش کیا ہے۔ایک دن مخدوم محی الدین سے مجتبیٰ حسین نے کہا:

"مخدوم بھائی! آپ کی ایک نظم دلی کے ایک رسالے کے تازہ شمارے میں بڑے اہتمام بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہے:" مجھے رسالہ کا نام تو یاد نہیں مگر عابد روڈ کے بس اسٹاپ والے بک اسٹال پر ابھی ابھی میں یہ رسالہ دیکھ کر آرہا ہوں۔" مخدوم تھوڑی دیر تو انجان اور بے تعلق بنے رہے۔پھر اچانک کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔۔۔ ہم لوگ (مجتبیٰ حسین اور کچھ احباب) بک اسٹال پر پہنچے تو مخدوم وہاں موجود تھے۔۔۔ جونہی ہم پر ان کی نظر پڑی، انھوں نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔۔۔ میں نے کہا" مخدوم بھائی میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ شاعر اپنے کلام سے کس حد تک بے نیاز رہ سکتا ہے۔"

مجتبیٰ حسین نے مخدوم کی مرقع کشی جس انداز میں کی ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجتبیٰ حسین نے اپنے دل و دماغ سے عقیدت، دوستی اور تعلقات کے سارے جذبات و خیالات محو کر کے یہ خاکہ قلم بند کیا ہے۔کیونکہ جہاں انھوں نے مخدوم کے اوصاف، اچھائیوں اور خوبیوں کو دکھائے ہیں وہیں ان کی خامیوں اور کمزوریوں کو بھی بے نقاب بھی کیا۔ تاکہ ایک جیتی جاگتی تصویر ہماری نظروں کے سامنے عیاں ہو جائے۔

مجتبیٰ حسین کو واقعہ نگاری اور مرقع کشی میں کمال حاصل ہے۔ان کا انداز بیان سادہ، بے حد لطیف، شگفتہ اور بے ساختہ ہے۔ انھوں نے اپنے منفرد مزاحیہ وطنزیہ اسلوب میں مخدوم کی خوبیوں، خامیوں اور کوتاہیوں کا ذکر کچھ اس بے ساختگی اور والہانہ انداز میں کیا ہے کہ قاری بھی اس پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔اس خاکے میں انجانے طور پر خود مجتبیٰ حسین کی زندگی اور شخصیت کے بعض پہلو بھی عیاں ہیں، جو ایک اچھے خاکہ کا تقاضہ ہے۔

14.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- اردو کے مشہور خاکہ نگاروں میں ایک اہم نام مجتبیٰ حسین کا ہے۔
- خاکہ "مخدوم محی الدین۔ یادوں میں بسا آدمی" مجتبیٰ حسین کا لکھا ہوا ہے۔
- مجتبیٰ حسین کا یہ خاکہ ان کے خاکوں کے پہلے مجموعے "آدمی نامہ" میں شامل ہے۔
- مخدوم محی الدین حیدرآباد کے مشہور شاعر تھے۔
- وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ اور کمیونسٹ نظریات کے حامل تھے۔
- انہوں نے جاگیر دارانہ نظام کے خلاف جدوجہد کی اور تلنگانہ تحریک میں حصہ لیا۔
- مخدوم کو مہینوں روپوش ہونا پڑا۔
- 1951ء میں مخدوم کو گرفتار کر لیا گیا۔ 1952ء میں قید سے رہا ہوئے۔
- "سرخ سویرا" مخدوم محی الدین کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔
- مجتبیٰ حسین نے اپنے خاکے میں مخدوم کو جس طرح دیکھا اور سمجھا بالکل اسی طرح تحریر کیا ہے۔
- اس خاکہ کے مطالعہ سے مخدوم کی انقلاب پسندی، بذلہ سنجی، خوش مذاقی اور زندہ دلی کی تصویریں ہماری آنکھوں میں پھر جاتی ہیں۔
- مجتبیٰ حسین نے اس خاکے میں مخدوم کی مختلف عادتوں اور روزمرہ کے احوال کے ذریعہ ان کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔
- مخدوم کے اندر انسانیت، سچائی، ہمدردی، حب الوطنی اور ظلم کے خلاف لڑنے والے سپاہی کے اوصاف موجود تھے۔
- مجتبیٰ حسین اپنے منفرد مزاحیہ اسلوب میں مخدوم کی خوبیوں، خامیوں اور کوتاہیوں کا ذکر کچھ اس بے ساختگی اور دلچسپ انداز سے کرتے ہیں کہ قاری بھی اس پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

14.4 مشکل الفاظ

زیرزمین	زمین کے نیچے	Underground
روپوش	منہ چھپائے ہوئے، گرفتاری سے بچنے کے لیے چھپ جانا	Hidden / Disappeared
کجااست	کہاں ہے	Where is
شعور	سمجھ بوجھ، عقل، احساس	Consciousness / Awareness
سوشلزم	اجتماعیت	Socialism
مافوق الفطرت	جو عام عادت سے بالا ہو	Supernatural

نوخیز	کم عمر، چھوٹی عمر کا	Budding / Young
انکشافات	انکشاف کی جمع، پوشیدہ باتیں یا نئی باتیں ظاہر کرنا	Revelations / Discoveries
آتش نمرود	نمرود کی آگ	Fire of Nimrod
اچھوتا	انوکھا، نیا	Unique / Untouched
اشتیاق	شوق، آرزو	Eagerness / Desire
مبدا	اصل، بنیاد	Origin / Source
سراغ	کھوج، پتا، دریافت	Clue / Trace
بذلہ سنجی	خوش طبعی	Wit / Humour
ازراہ تمسخر	مزاح کے طور پر	Mockingly
حسب توقع	امید کے مطابق	As expected
بے نیاز	بے غرض، بے پروا	Independent / Unconcerned
فلک شگاف	زوردار	Sky-shattering
وطن مالوف	پیارا وطن	Native land
معنویت	حقیقت، اصلیت	Significance / Meaningfulness
غریب الوطنی	وطن سے جدائی، وطن سے دوری	Exile / Living away from homeland

14.5 مشقیں

مشق 1: متن اور خلاصے کی مدد سے خالی جگہ کو پر کیجیے۔

vii. مخدوم کو.....سے بے پناہ پیار تھا۔

viii. مجتبیٰ حسین کے مضامین کے پہلے مجموعے کی رسم اجرا.....نے انجام دی تھی۔

ix. مخدوم ایک انسان نہیں تھے، جیتا جاگتا سانس لیتا ہوا.....تھے۔

x. ایک دن مخدوم سے غزل ہو گئی تو فوراً.....چلے آئے۔

xi. مجتبیٰ حسین مخدوم محی الدین کو.....میں بسا آدمی کہتے ہیں۔

مشق2: صحیح جملوں کے سامنے صحیح اور غلط کے آگے غلط کا نشان لگائیں۔

1. مخدوم نے شاہ آباد میں نوجوانوں کے ایک جلسے سے خطاب کیا۔ ( )
2. کرشن چندر نے تو اپنے گھر کا نام ہی "چنبیلی کا منڈوا" رکھ چھوڑا تھا۔ ( )
3. مجتبیٰ حسین اور ان کے ایک ساتھی نے گلبرگہ سے شاہ آباد تک پیدل سفر کیا۔ ( )
4. "سرخ سویرا" علی سردار جعفری کا شعری مجموعہ ہے۔ ( )
5. پروفیسر حسن عسکری اور مخدوم حیدرآباد کے ویکاجی ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے ( )

14.6 نمونہ امتحانی سوالات

14.6.1 معروضی سوالات:

1۔ آب حیات کے مصنف کون ہیں؟

(a)مولوی عبدالحق (b)رشید احمد صدیقی (c)محمد حسین آزاد (d)شوکت تھانوی

2۔ مولوی نذیر احمد پر خاکہ کس نے لکھا؟

(a)مرزا فرحت اللہ بیگ (b) مجتبیٰ حسین (c) مولوی عبدالحق (d) مشتاق احمد یوسفی

3۔ مجتبیٰ حسین نے بی۔اے کہاں سے پاس کیا؟

(a)علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (b)جامعہ عثمانیہ (c)جامعہ ملیہ اسلامیہ (d)مدراس یونیورسٹی

4۔ مجتبیٰ حسین حیدرآباد کے کس اخبار سے وابستہ تھے۔؟

(a)سیاست (b)رہنما (c)منصف (d)ہمارا عوام

5۔ مجتبیٰ حسین نے وزٹینگ پروفیسر کی حیثیت سے کس یونیورسٹی میں کام کیا؟

(a)عثمانیہ یونیورسٹی (b)مانو حیدرآباد (c)دہلی یونیورسٹی (d)یونیورسٹی آف حیدرآباد

6۔ ان میں سے کون سی کتاب مجتبیٰ حسین کی تصنیف ہے؟

(a)سائے ہم سائے (b)تکلف برطرف (c)سائیڈ سے چلیے (d)الف تماشا

7۔ مخدوم محی الدین کے مجموعہ کلام کا کیا نام ہے؟

(a) پہلی بارش (b)تراشیدہ (c)سرخ سویرا (d)نقش فریادی

8۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اپنے گھر کا نام کیا رکھا تھا؟

(a)چنبیلی کا منڈوا (b)حویلی (c)چند تاروں کا بن (d)سرخ سویرا

9۔ مخدوم کو دیکھنے کے لیے مجتبیٰ حسین کتنے کلو میٹر پیدل چل کر گئے تھے؟

(a) دس (b) پندرہ (c) بیس (d) پچیس

10۔ مجتبیٰ حسین مخدوم محی الدین سے پہلی مرتبہ کس ہوٹل میں ملے؟

(a)اشوکا (b)ویکاجی (c)اورینٹ (d)تاج اوبرائے

14.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. خاکہ کسے کہتے ہیں۔اس کے ابتدائی نقوش بیان کیجیے۔
2. مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری کے بارے میں لکھیے۔
3. مجتبیٰ حسین کے چند سفر ناموں کے نام تحریر کیجیے۔
4. مجتبیٰ حسین کی چند تصانیف کے نام لکھیے۔
5. مخدوم سے ملنے کے لیے مجتبیٰ حسین نے کیا صعوبتیں برداشت کیں۔چند جملوں میں بیان کیجیے۔

14.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. مجتبیٰ حسین کے حالات زندگی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
2. مجتبیٰ حسین کا خاکہ "مخدوم محی الدین–یادوں میں بسا آدمی" کا خلاصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے۔
3. مجتبیٰ حسین کے اس خاکہ کی امتیازی خصوصیات بیان کیجیے۔

14.6.1 کے جوابات:

D (v)	A (iv)	B (iii)	A (ii)	C (i)
B (x)	D (ix)	A (viii)	C (vii)	B (vi)

اکائی 15: خطوط

(انتخاب خطوط غالب)

اکائی کے اجزا

15.0		تمہید
15.1		مقاصد
15.2		انتخاب خطوط غالب
	15.2.1	مرزا غالب کا تعارف
	15.2.2	مرزا غالب کی خطوط نگاری
	15.2.3	غالب کے خطوط کا مطالعہ
	15.2.3.1	خط بنام علاء الدین خاں علائی
	15.2.3.2	خط بنام منشی ہر گوپال تفتہؔ
	15.2.3.3	خط بنام منشی ہر گوپال تفتہؔ
	15.2.3.4	خط بنام میر سرفراز حسین
	15.2.3.5	خط بنام میر مہدی مجروح
15.3		اکتسابی نتائج
15.4		مشکل الفاظ
15.5		مشقیں
15.6		نمونہ امتحانی سوالات

15.0 تمہید

خطوط نگاری کی اہمیت دنیا کی ہر زبان و ادب میں یکساں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خطوط سے آراء و افکار ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ زندگی کے پوشیدہ گوشے بھی بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ خط میں وہ آزادانہ باتیں ہوتی ہیں جو مکتوب نگار کی سیرت و شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ خط کی باتیں بڑی سادہ اور صاف ہوتی ہیں۔ اس میں دل کی بات دل کی زبان میں کہی جاتی ہے اور پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتی

ہیں۔ خط سے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ "ذہن میں کوئی خیال ہو یا نہ ہو، خط لکھا جا سکتا ہے جس طرح بات چیت کے لیے کسی موضوع کا نہ ہونا اس کے ہونے سے زیادہ دلچسپ ہوتا ہے اسی طرح خط کے لیے نہ کسی اصول کی ضرورت ہے اور نہ خیال کی۔ زندگی اپنی راہیں خود بنا لیتی ہے۔ خط اپنی باتیں خود پیدا کر لیتا ہے۔ اس کے باوجود خطوط نگاری بڑا نازک فن ہے"۔

یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ اردو زبان میں باقاعدہ طور پر خطوط نگاری کا آغاز کب سے ہوا۔ کیوں کہ خط بالکل نجی اور شخصی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ خطوط نگار کو ادبی صنف کا درجہ اس وقت حاصل ہوا جب مرزا غالبؔ نے خطوط نگاری کو ایک نیا انداز و اسلوب دیا۔ اسی لیے غالبؔ کو جدید اردو خطوط نگاری کا باوا آدم مانا جاتا ہے۔ اس اکائی میں مرزا غالب کی خطوط نگاری کا جائزہ لیا جائے گا۔ نمونے کے طور پر مرزا غالب کے پانچ خطوط کا بھی مطالعہ کیا جائے گا۔

15.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مرزا غالب کے واقعاتِ حیات کو بیان کر سکیں۔
- مرزا غالب کی خطوط نگاری کا جائزہ لے سکیں۔
- غالب کے خطوط کی خصوصیات بیان کر سکیں۔
- مرزا غالب کے خطوط کا تجزیہ کر سکیں۔

15.2 انتخاب خطوط غالب

15.2.1 مرزا غالب کا تعارف:

غالب کا اصل نام اسد اللہ خاں، عرفیت مرزا نوشہ، تخلص غالب تھا۔ بہادر شاہ ظفر انہیں نجم الدولہ' دبیر الملک اور بہادر نظام جنگ جیسے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ مرزا غالب کی پیدائش 1797ء میں آگرہ میں عبد اللہ بیگ خان کے گھر ہوئی۔ غالب کے والد عبد اللہ بیگ خان فوج میں سپاہی کی حیثیت سے ملازم تھے اور اسی سے گھر کا خرچ آرام سے چلتا رہتا تھا۔ ابھی غالب کی عمر پانچ سال تھی کہ والد عبد اللہ بیگ کی وفات ہو گئی۔ اس کے بعد مرزا غالب کی پرورش کا ذمہ ان کے چچا نے اپنے سر لے لیا لیکن دو تین سال بعد چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد انگریزی حکومت کی طرف سے ان کے خاندان کے لیے ایک خاص ماہانہ پنشن مقرر کی گئی۔ کچھ عرصہ تک غالبؔ آگرہ میں ہی مقیم رہے اور پھر 1810ء کے قریب انھوں نے دہلی کا رخ کیا اور باقی زندگی کا تمام حصہ یاس و حسرت، خوشی و غم ہر رنگ میں گزار دیا۔ یہاں تک کہ اپنے چھوٹے بھائی یوسف مرزا کو بھی آگرہ سے دہلی لے آئے۔

غالب نے ابتدائی تعلیم شیخ معظم سے حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ فارسی کی تعلیم انہوں نے عبد الصمد سے حاصل کی جو اپنے دور کے فارسی دان تھے۔ غالب کو فارسی زبان میں کمال حاصل تھا۔ ان کی شادی تیرہ سال کی عمر میں امراؤ بیگم سے ہوئی۔ ان کو پے در پے سات اولادیں ہوئیں لیکن کوئی زندہ نہ رہ سکی اور آخر کار انھوں نے اپنے بھانجے کے دو بیٹوں کو گود لیا اور ان سے بھی زیست نے وفا نہ کی اور وہ بھی

مالک حقیقی سے جا ملے۔

مرزا غالب ایک خود دار انسان تھے۔ امراء اور روساء کی خدمت میں کلام بھی پیش کرتے مگر یہ شرط عائد کرتے کہ وہ ان کی تعظیم کریں۔ ایک دفعہ دلی کالج میں استاد کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ وہ کالج کے باب الداخلے پر پہنچے اور پرنسپل کو اپنے آنے کی اطلاع دی جب انگریز پرنسپل ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے نہیں آیا تو کچھ دیر انتظار کر کے لوٹ گئے۔

غالب' ایک شگفتہ مزاج انسان تھے۔ ان کی شگفتہ مزاجی کے کئی لطیفے مشہور ہیں۔ ان کی حسِ مزاح اللہ کی دین تھی۔ وہ اپنی تنگ دستی اور غربت میں بھی مزاح کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔ پہلی جنگ آزادی (1857ء) کے بعد مرزا کے معاشی حالات حد درجہ تکلیف دہ تھے لیکن مرزا کی حس مزاح میں کہیں بھی اور کبھی بھی فرق نہیں آیا۔ ذوقؔ کے انتقال کے بعد غالب بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے۔ بادشاہ نے انہیں خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا اور اس کے لیے غالب کو ماہانہ پچاس روپیے تنخواہ مقرر کی۔ غالب خاندان تیموریہ کا پہلا حصہ لکھ پائے جس کا نام انہوں نے "مہر نیم روز" رکھا۔

غالب کی تصانیف میں "دیوان غالب" جو ان کی زندگی میں ہی شائع ہوا۔ ان کے خطوط کا پہلا مجموعہ "عود ہندی" بھی ان کی زندگی میں شائع ہوا البتہ ان کے خطوط کا دوسرا مجموعہ "اردوے معلیٰ" ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں قاطع برہان' دستنبو' پنج آہنگ اور فارسی میں دیوان بھی قابل ذکر ہیں۔

آخری زمانے میں غالب کی صحت بہت متاثر ہو گئی تھی' چلنا پھرنا بھی دشوار ہو چکا تھا۔ اس حالت میں بھی وہ خطوط کا جواب دیا کرتے تھے۔ اسی کمزوری اور بیماری کی حالت میں 1869ء میں مرزا غالب کا انتقال ہوا۔

15.2.2 مرزا غالب کی خطوط نگاری:

جدید ٹیکنالوجی نے وہ مواصلاتی وسائل پیدا کر دیے ہیں کہ آج ہم ہندوستان کے کسی چھوٹے سے گاؤں میں بیٹھ کر دنیا کے کسی بھی فرد سے گفت و شنید کر سکتے ہیں یا کسی بھی ملک کی سیر کر سکتے ہیں۔ برقی مواصلات نے انسانوں کو ایک دوسرے کے بے حد قریب کر دیا ہے۔ جب تک ترسیل کے یہ برقی ذرائع مہیا نہیں تھے تب تک عام طور پر ترسیل کا کام خطوط سے لیا جاتا تھا۔ اردو میں باقاعدہ خطوط نگاری کی روایت اٹھارویں صدی کی پانچویں دہائی میں سامنے آتی ہے۔ خطوط نگاری کے میدان میں جس خطوط نگار نے سب سے بڑا نام پیدا کیا وہ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ ہیں۔ غالبؔ کے خطوط نگاری کی انفرادیت کے بنیادی عناصر یہ ہیں:

1۔ سادہ و سلیس زبان: غالبؔ سے پہلے اردو نثر کے لکھنے کے دو طرز مقبول تھے۔ ایک "نو طرز مرصع" کا طرز اور دوسرا "باغ و بہار" کا طرز۔ ان میں سے پہلے طرز کی بنیاد مقفیٰ و مسجع نثر پر موقوف تھی جبکہ دوسرے طرز کا منبع سادہ و سلیس نثر تحریر کرنا تھا۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں دوسرے طرز کو اپنایا بلکہ اس کو مزید چاشنی، سادگی اور سلاست کی راہ دکھائی۔ سیدھی سادی زبان کے علاوہ ان کے خطوط میں ایسے اسلوب کا استعمال ہوا ہے جیسے کہ دو لوگ آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔ گویا مرزا غالب نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔

2۔ بے تکلفی: غالبؔ نے جب اردو میں خطوط نگاری شروع کی تو اس وقت یہ رواج عام تھا کہ مخاطب کو بڑے بڑے القابات و اعزازات سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ مرزا نے اس تکلف کو بر طرف کرتے ہوئے ایک ایسی نئی روش کی بنیاد ڈالی کہ بہت جلد خطوط نگاری میں اس نئی روش

کی پیروی کی جانے لگی۔ لیکن، یہ طرز اور بے تکلفی شاید ہی کسی دوسرے خطوط نگار کو میسر آئی ہو۔ خطوط میں غالب اپنے مخاطبین کو بالکل سیدھے سادھے اور بے تکلف انداز میں مخاطب کرتے نظر آتے ہیں۔

3۔ خطوط کی تکنیک میں تبدیلی: مرزا سے پہلے خطوط لکھنے کی ایک خاص تکنیک کی پیروی کی جاتی تھی لیکن مرزا نے جب خطوط لکھنے شروع کیے تو اپنے لیے ایک نئی تکنیک کا انتخاب کیا۔ جہاں ان کا دل کرتا ہے تاریخ لکھتے ہیں، جہاں دل چاہے وہیں مدعو کو بلاتے ہیں، جہاں دل چاہے اپنا تعارف پیش کرتے ہیں۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا ہے کہ اپنا نام ہی نہیں لکھا اور مخاطب سے سوال کرتے ہیں کہ مجھے پہچان کر بتاؤ۔ مرزا کے خطوط میں جہاں سنجیدگی ہے وہیں ظرافت بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

4۔ مضمون: غالبؔ کے خطوط میں مختلف اقسام کے مضمون دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے خطوط نجی، فلسفیانہ، علمی اور ادبی نوعیت کے مضامین سے لبریز ہیں۔ ہر مضمون کے خطوط کی زبان اور بیان کا انداز مختلف اور جداگانہ ہے۔ ان کے نجی خطوط میں روزمرہ اور محاورے کا استعمال سب سے زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے اور بے تکلفی بھی خوب ہے۔ اس کے علاوہ جتنے بھی موضوعات کے خطوط ہیں ان میں علمی اور ادبی زبان کا استعمال دیکھنے کو ملتا ہے۔ غالب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مخاطب کو دیکھ کر زبان اور انداز کا انتخاب کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ غالبؔ نے اردو خطوط نگاری کی روایت کو اتنا پختہ بنا دیا کہ آج اردو نثر کے آغاز و ارتقاء میں جب تک غالبؔ کے خطوط کا ذکر نہ آئے تب تک نثر کا آغاز و ارتقاء ادھورا معلوم ہوتا ہے۔

15.2.3 غالب کے خطوط کا مطالعہ:

مرزا غالب نے بے شمار خط لکھے۔ وہ ہر خط کا جواب دیتے تھے خواہ انہیں خط لکھنے والا اجنبی ہی کیوں نہ ہو۔ مرزا نے اپنی زندگی میں ہی خطوط کا پہلا مجموعہ "عود ہندی" شائع کروایا تھا البتہ خطوط کا دوسرا مجموعہ "اردوے معلیٰ" ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔ مرزا نے اپنے آخری ایام میں بھی خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ بیماری کی حالت میں ان کے ہاتھوں میں رعشہ آگیا تھا اور انہیں خط لکھنا دشوار ہو رہا تھا تو دوسروں سے خط کا جواب لکھواتے رہے۔ حالی کا کہنا ہے کہ انتقال سے ایک دن پہلے جب وہ عیادت کے لیے گئے تو تب بھی وہ کسی خط کا جواب لکھوا رہے تھے جس میں ایک فقرہ یہ تھا کہ "میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو ایک آدھ روز میں ہم سایوں سے پوچھنا ہوگا"۔ اس کے دوسرے دن مرزا کا انتقال ہوا۔ مندرجہ ذیل خطوط 'خلیق انجم کی مرتبہ کتاب "انتخابِ خطوطِ غالب" سے لیے گئے ہیں۔

15.2.3.1 خط بنام علاء الدین خاں علائی: (متن)

جانِ غالب!

یاد آتا ہے کہ تمھارے عم نامدار سے سنا ہے کہ "لغاتِ دساتیر" کی فرہنگ وہاں ہے، اگر ہوتی تو کیوں نہ بھیج دیتے۔ تم ثمر نورس ہو اس نہال کے کہ جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشیں اس نہال کا رہا ہوں کیوں کر تم مجھ کو عزیز نہ ہوگے۔

رہی دید وادید، اس کی دو صورتیں، تم دلی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور، میں معذور۔ خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو، جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے۔

سنو عالم دو ہیں: ایک عالم ارواح اور ایک عالمِ آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے لِمَنِ المُلکُ الیومُ اور پھر آپ جواب دیتا ہے للہ الوَاحِدِ القھّار ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چناچہ میں آٹھویں رجب 1212ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ 13 برس حوالات میں رہا۔ 7 رجب 1225ھ کو میرے واسطے حکمِ دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا گیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس میں بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی، طاقت یک قلم زائل ہوگئی۔ بے حیا ہوں، سالِ گذشتہ بیڑی کو زاویہ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مرادآباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا، کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا، بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ 1277ھ میں چھوٹ جاؤں۔ بہ ہر تقدیر، بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔

تجزیہ:

غالب نے یہ خط علاالدین خاں علائی کے نام تحریر کیا ہے۔ اس خط میں غالب نے جہاں فلسفیانہ اندازِ بیان اختیار کیا ہے وہیں ظرافت کی پھلجھڑیاں بھی بکھیری ہیں۔ وہ زندگی کو ایک قید خانہ تصور کرتے ہیں اور خاص طور پر شادی کو سزا کے برابر گردانتے ہیں۔ آگرہ میں گزارے گئے 13 برسوں کو انھوں نے حوالات سے موسوم کیا ہے اور اور پوری دنیا کو ایک ایسی زنداں کے مماثل قرار دیا ہے جس میں قیدی آزاد گھوم تو سکتے ہیں لیکن یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کب اہلکار آئیں اور واپس حوالات میں ڈال دیں۔ وہ بیوی کو پاؤں کی بیڑی کے مماثل قرار دیتے ہیں اور پوتوں کو ہتھکڑی سے موسوم کرتے ہیں۔ ان تمام باتوں میں غالبؔ کی ظرافت نگاری کے اعلیٰ نمونے دیکھے جاسکتے ہیں اور یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ وہ زندگی جینے کے ڈھنگ سے اچھی طرح سے واقف تھے اور زندگی جینا جانتے تھے۔

اس خط میں ان کے "رام پور کے سفر" کے حوالے بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ سفر کلکتہ کا ذکر بھی اس خط میں آیا ہے لیکن اس کا ذکر سرسری انداز میں کیا گیا ہے۔ وہ کہاں سے ہوتے ہوئے کہاں گئے اور وہاں پر کتنے دن رکے ان تمام باتوں کی تفصیل بھی اس خط میں درج کی

گئی ہے۔ ساتھ میں آگرہ سے دہلی ہجرت کرنے کا ذکر بھی خط میں موجود ہے۔ اس خط میں زیست و موت کی ایک کشمکش بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ غالبؔ کی سخن دانی کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ انھوں نے زندگی اور موت کے اتنے بڑے فلسفے کو ایک خط کی چند سطور میں قید کر دیا ہے۔ انھوں نے طنز اور ظرافت دونوں کے سروں کو ہاتھ میں پکڑے رکھا اور انسانی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت سے بھی روشناس کرا دیا۔ یہی وہ انداز ہے جس نے مرزا اسد اللہ خاں کو غالبؔ بنا دیا اور جو آج تک زندہ و جاوید ہے۔

15.2.3.2 خط بنام منشی ہر گوپال تفتہؔ: (متن)

صاحب!

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کی ہم میں تم میں معاملاتِ مہر و محبت در پیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمھارے دوستِ دلی تھے اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ، نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اس کا جواب مجھ کو آیا۔ اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہر گوپال و متخلص بہ تفتہؔ ہو، آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں، اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے، لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈھنے کو مسلمان، اس شہر میں نہیں ملتا، کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

اب پوچھو کہ تو کیوں کر مسکنِ قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ! میں حکیم محمد احسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجا نریندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کے۔ راجا نے صاحبانِ عالی شان سے عہد لے لیا تھا کہ بروقتِ غارتِ دہلی، یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح، راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچا محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔ جاگیر دار، پنس دار، دولت مند، اہلِ حرفہ، کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر

دس دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں، خواہی اس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں، میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر، شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے، مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی لہذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیر دار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نکل نہیں سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر گھر کے بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک، یعنی شنبہ پنجم دسمبر 1857ء تک بہ دستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجامِ کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے، مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہ ہر حال، منشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمھارا خط پہنچا۔ اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دیا۔

شنبہ 5 دسمبر 1857 اسد اللہ

تجزیہ:

یہ خط غالبؔ نے 5 دسمبر 1857 کو منشی ہرگوپال تفتہؔ کے خط کے جواب میں لکھا ہے۔ اس خط سے ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کا حال آسانی سے معلوم ہو رہا ہے کہ کمپنی کے حکام اور فوجی اہلکاروں نے دہلی کا کیا حال کر دیا تھا۔ خاص طور پر اس وقت دہلی کے مسلمانوں نے جن آفات و آلام کا سامنا کیا ان کا حال آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کمپنی کے حکام نے دہلی کے چنندہ اشخاص کو اٹھایا اور بغاوت کی پاداش میں کچھ کو پھانسی کی سزا سنا دی اور کچھ کو قید میں ڈال دیا۔ کچھ لوگ کمپنی کے خوف سے شہر کو چھوڑ کر دوسرے مقامات کو منتقل ہو گئے۔ دہلی بالکل ویران ہو گئی۔ غالب چونکہ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے جڑے ہوئے تھے اور تاریخ نگاری اور بادشاہ کی اصلاحِ سخن کے کام پر مامور تھے اس لیے ان کو بھی ان حالات کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان کو جیل میں نہیں ڈالا گیا، بلکہ صرف کچھ عرصے کے لیے ان کی پنشن روک دی گئی۔ جب غدر ختم ہوا تو جانچ کے بعد جب غالبؔ بے قصور پائے گئے تو پنشن بھی بحال کر دی گئی۔ اس خط میں جن ایام کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کا شمار

لگ بھگ دس مئی 1857 سے پانچ دسمبر 1857 تک کا ہے۔ اس خط میں منشی ہر گوپال تفتہ کے علاوہ جن اشخاص کا ذکر آتا ہے کے نام درج ذیل ہیں:

1۔ منشی نبی بخش حقیر 2۔ حکیم محمد حسن خاں 3۔ راجا نریندر سنگھ

15.2.3.3 خط بنام منشی ہر گوپال تفتہؔ: (متن)

کیوں صاحب!

روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں۔ یعنی جس کا خط آیا، میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا، جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آرہتے ہوں بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو اور ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کو پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب دس دس بارہ بارہ دن میں تمھارا خط نہیں آیا۔ یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو، صاحب۔ نہ لکھنے کی وجہ لکھو، آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔

سوموار 27 دسمبر 1858ء غالبؔ

تجزیہ:

غالب نے یہ خط تفتہ کے نام لکھا ہے۔ جس دور میں غالب نے یہ خط لکھا اس سے کچھ ہی عرصہ قبل 1857ء کی بغاوت نے دلی کے حالات کو تباہ و برباد کر رکھا تھا جس کا حال ہم نے اس سے پچھلے خط میں بھی دیکھا ہے اور غالبؔ کے دوسرے بے شمار خطوط میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہاں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ غدر کے دور میں ان کا سب سے پسندیدہ مشغلہ خطوط نگاری تھا۔ اس خط میں غالب کی انشا پردازی اور زبان دانی کا خوب اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس خط کے ذریعے غالب کی ذاتی زندگی کا کچھ حصہ بھی ہمارے سامنے آجاتا ہے اور ان کی شخصیت کو پہچاننے میں کچھ حد تک آسانی ہو جاتی ہے۔ غالبؔ بناوٹ اور دکھاوے سے دور رہتے تھے جس کا پرتو ہمیں اس خط میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ غالبؔ نے اس خط میں بے ساختہ ہو کر اس انداز میں بات کی ہے کہ دو انسان آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ بلکہ وہ خود اس خط میں لکھتے ہیں کہ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ وہ مکالمے بھی اس انداز سے تحریر کرتے ہیں کہ کوئی خط نہیں لکھا جا رہا بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو انسان آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس سارے معاملے میں جس کو سب سے زیادہ فائدہ ملا وہ اردو زبان ہے۔

15.2.3.4 خط بنام میر سرفراز حسین: (متن)

میری جان!

خدا تجھ کو ایک سو بیس برس کی عمر دے۔ بوڑھا ہونے آیا۔ ڈاڑھی میں بال سفید آگئے، مگر بات

سمجھی نہ آئی۔ پنشن کے باب میں الجھے ہو اور کیا بے جا الجھے ہو۔ یہ تو جانتے ہو کہ دلی کے سب پنشن داروں کو مئی 1857ء سے پنشن نہیں ملا۔ یہ فروری 1859ء بائیسواں مہینا ہے ،۔ چند اشخاص کو اس بائیس مہینے میں سال بھر کا روپیہ بہ طریقِ مدد خرچ مل گیا۔ باقی چڑھے ہوئے روپیے کے باب میں اور آیندہ ماہ بہ ماہ ملنے کے واسطے ابھی کچھ کم حکم نہیں ہوا۔ تم اب اپنے سوال کو یاد کرو کہ اس واقعے سے اس کو کچھ نسبت ہے یا نہیں؟ یہ حضرت کا سوال امیر خسرو کی انملی ہے۔ چیل بسولا لے گئی تو کاہے سے پٹکوں راب۔

علی بخش خاں پچاس روپئے مہینا پاتے تھے۔ بائیس مہینے کے گیارہ سو ہوتے ہیں۔ ان کو چھ سو روپیے مل گئے۔ باقی روپیا چڑھا رہا۔ آیندہ ملنے میں کچھ کلام نہیں۔ غلام حسن خاں سو روپے مہینے کا پنشن دار۔ بائیس مہینے کے بائیس سو ہوتے ہیں۔ اس کو اٹھارہ سو ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپے مہینا، بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو ہوتے ہیں۔ اس کو اٹھارہ سو ملے۔ متاجماعہ دار دس روپے مہینے کا سک لمبر۔ سال بھر کے ایک سو بیس لے آیا۔ اسی طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔ آیندہ کے واسطے کسی کو کچھ حکم نہیں۔ مجھ کو پھر مدد خرچ نہیں ملا۔ جب کئی خط لکھے تو اخیر خط پر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ سائل کو بہ طریقِ مدد خرچ سو روپے مل جائیں۔ میں نے وہ سو روپے نہ لیے اور پھر صاحب کمشنر بہادر کو لکھا کہ میں باسٹھ روپئے آٹھ آنے مہینا پانے والا ہوں۔ سال بھر کے ساڑھے سات سو روپئے ہوتے ہیں۔ سب پنشن داروں کو سال سال بھر کا روپیہ ملا، مجھ کو سو روپئے کیسے ملتے ہیں؟ مثل اوروں کے مجھے بھی سال بھر کا روپیہ مل جائے۔ ابھی اس میں کچھ جواب نہیں ملا۔

آبادی کا یہ رنگ ہے کہ ڈھنڈورا پٹوا کر، ٹکٹ چھپوا کر اجرٹن صاحب بہادر بہ طریق ڈاک کلکتے چلتے گئے۔ دلی کے حمقا، جو باہر پڑے ہوئے ہیں، منھ کھول کر رہ گئے۔ اب جب وہ معاودت کریں گے، تب شاید آبادی ہو گی یا اور کوئی نئی صورت نکل آئے۔

میر سرفراز اور میر نصیر الدین اور میرن صاحب کو دعائیں پہنچیں۔

فروری 1859ء

تجزیہ:

یہ خط غالبؔ نے میر سرفراز حسین کے نام 1859ء کے دوسرے مہینے میں لکھا ہے۔ غالبؔ کے اس خط سے عیاں ہے کہ جو لوگ کمپنی سے پنشن پاتے تھے ان کی پنشن غدر کے آغاز میں ہی بند کر دی گئی تھی۔ اور بائیس مہینے تک بہت کم لوگوں کو پنشن کا پیسا مل سکا۔ اس سے یہ بات بھی پختہ ہو جاتی ہے کہ غالب کو کمپنی سے سالانہ ساڑھے سات سو روپے ملتے تھے۔ لیکن بائیس مہینے سے یہ رقم بند کر دی گئی تھی۔

اور آخر جب پنشن بحال ہوئی تو پہلے غالبؔ کی جانچ کی گئی کہ کہیں یہ غدر میں شامل تو نہیں تھے۔ یہاں پر غالبؔ نے کئی دوسرے پنشن داروں کا حال بھی بیان کیا ہے اور یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ تمام پنشن داروں کو غدر کے دوران مالیاتی طور پر کس کس طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے ۔اس خط میں غدر کے دو سال بعد کی دلی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غدر میں جس طرح سے دلی اجڑی تھی واپس نہیں بس سکی۔

اس خط میں غالب کی ظرافت کے کچھ نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جیسا کہ میر سرفراز حسین کو "ایک سو بیس" کی عمر کی دعا دیتے ہیں۔ وہ زیادہ کم بھی کہہ سکتے تھے لیکن ظرافت پیدا کرنے کے لیے انھوں نے صرف ایک سو بیس سال ہی کی دعا دی۔ اس خط میں جن اشخاص کا ذکر آیا ہے ان کے اسم گرامی درج ذیل ہیں:

1۔ امیر خسرو 2۔ علی بخش خاں 3۔ غلام حسن خاں 4۔ دیوان کشن لال

5۔ متاجماعہ دار 6۔ اجرٹن صاحب 7۔ میر سرفراز حسین 8۔ میر نصیر الدین

9۔ میرن صاحب

15.2.3.5 خط بنام میر مہدی مجروح: (متن)

او میاں سید زادہء آزادہ۔ دلی کے عاشق دلدادہ، ڈھے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے ۔حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے، نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنونؔ کہاں، ذوقؔ کہاں، ؟ مومن خاںؔ کہاں ؟ ایک آزردہؔ سو خاموش، دوسرا غالبؔ وہ بے خود و مدہوش ۔نہ سخن وری رہی، نہ سخن دانی، کس برتے پر تتاپانی ؟ ہائے دلی ؟ وائے دلی، بھاڑ میں جائے دلی۔

سنو صاحب! پانی پت کے رئیسوں میں ایک شخص ہیں احمد حسین خاں ولد سردار خاں، ولد دلاور خاں اور نانا اس احمد حسین خاں کے غلام حسین خاں ولد مصاحب خاں۔ اس شخص کا حال از روئے تحقیق مشرح اور مفصل لکھو۔ قوم کیا ہے، عمر کیا ہے ؟ معاش کیا ہے ؟ طریق کیا ہے ؟ احمد حسین خاں کی لیاقت ذاتی کا کیا رنگ ہے ؟ طبعیت کا کیا ڈھنگ ہے ؟ بھائی! خوب چھان کر لکھ اور جلد لکھ۔

پنجشنبہ 23 مئی 1861ء

تجزیہ:

یہ خط غالب نے میر مہدی مجروح کے نام لکھا ہے۔ اس خط میں غالب کی بے تکلفی اور ظرافت دونوں کی بھرپور جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ اتنے بڑے سخن ور اور سخن دان ہو کر اپنے منہ سے مجروحؔ کو اپنے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ نہ میں سخن ور ہوں اور نہ ہی سخن دان، یہ بات غالب کی مثبت شخصیت کا ایک پہلو بھی ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اور پہلے پیراگراف کے آخر میں دلی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ پہلے دہلی

کے تباہ و برباد ہونے پر غم کھاتے ہیں اور آخر پر اپنا دھیان ہٹانے کے لیے کہتے ہیں کہ دلی جائے بھاڑ میں۔

اس خط میں مجروحؔ سے کسی شخص احمد حسین خاں کی بابت دریافت کر رہے ہیں جو کہ پانی پت کا رہنے والا ہے۔ اس حال دریافت کرنے سے بھی غالب کی ذات کا یہ پرتو ہم پر کھلتا ہے کہ وہ کام کرنے سے پہلے اس کی جڑیں تلاش کرتے تھے اور مفصل تحقیق کرتے تھے۔

15.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- غالب نام اسد اللہ خاں، عرفیت مرزا نوشہ، تخلص غالب تھا۔ بہادر شاہ ظفر نے نجم الدولہ' دبیر الملک اور بہادر نظام جنگ جیسے خطاب سے نوازا۔
- غالب کے والد عبد اللہ بیگ خان فوج میں سپاہی کی حیثیت سے مامور تھے۔ غالب ابھی پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ جس کی وجہ سے غالب کا بچپن پریشانیوں میں گزرا۔
- 1810ء کے قریب انھوں نے دہلی کا رخ کیا اور باقی زندگی کا تمام حصہ یاس و حسرت، خوشی و غم میں گزار دیا اور کبھی مڑ کر بھی آگرہ کی طرف نہ دیکھا۔
- غالب کی تصانیف میں "دیوان غالب" جو ان کی زندگی میں ہی شائع ہوا۔ ان کے خطوط کا پہلا مجموعہ "عود ہندی" بھی ان کی زندگی میں شائع ہوا البتہ ان کے خطوط کا دوسرا مجموعہ "اردوے معلیٰ" ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں قاطع برہان' دستنبو' پنج آہنگ اور فارسی میں دیوان غالب بھی غابل ذکر ہیں۔
- اردو خطوط نگاری کی تاریخ کا ایک اہم مقام ہے۔ انہوں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ ان کے بے شمار خطوط پائے جاتے ہیں جو انہوں نے اپنے دوستوں، جاننے والوں، رشتہ داروں اور حکام وقت کو لکھے ہیں۔
- اس اکائی کا پہلا خط غالب نے اپنے دوست علاالدین خاں علائی کے نام تحریر کیا ہے۔ اس خط میں غالب نے جہاں فلسفیانہ اندازِ بیان اختیار کیا ہے وہیں ظرافت کی پھلجھڑیاں بھی بکھیری ہیں۔
- دوسرا خط اسد اللہ خاں غالبؔ نے 5 دسمبر 1857ء کو منشی ہرگوپال تفتہؔ کے خط کے جواب میں لکھا ہے۔ اس خط سے ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کا حال آسانی سے معلوم ہو رہا ہے کہ کمپنی کے حکام اور فوجی اہلکاروں نے دہلی کا کیا حال کر دیا تھا۔ خاص طور پر اس وقت دہلی کے مسلمانوں نے جن آفات و آلام کا سامنا کیا ان کا حال آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کے علاوہ منشی نبی بخش حقیر، حکیم محمد حسن خاں، راجا نرندر سنگھ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔
- چوتھا خط غالب نے میر سرفراز حسین کو اپنی پنشن کے سلسلے میں لکھا تھا۔
- اس اکائی کا آخری خط غالب نے میر مہدی مجروح کے نام لکھا ہے۔ اس خط میں غالب کی بے تکلفی اور ظرافت دونوں کی بھرپور جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

15.4 مشکل الفاظ

زیست	زندگی	Life
مقفّٰی	قافیہ پیمائی، وہ عبارت جس میں قافیہ پیمائی کی گئی ہو	Rhymed
مسجع	وہ نثر جس کے دو جملے یا دو فقرے ہم وزن و ہم قافیہ ہوں	Rhythmic / Prose with Rhyme
مرصع	وہ نظم و نثر جن میں لفظ نگینے کی طرح جڑے ہوں	Adorned / Bejeweled
سلیس	آسان اور غیر مبہم نثر	Simple / Fluent
عم	چچا	General / All
ثمر	پھل	Fruit / Result
اختلاط	میل جول، ربط ضبط	Mixing / Association
انبساط	خوشی، سرور	Joy / Cheerfulness
بخل	کنجوسی	Stinginess / Miserliness

15.5 مشقیں

مشق 1: اکائی کو پڑھ کر درج ذیل سوالوں کے جواب لکھیے۔

1۔ مرزا غالب کی پیدائش کس شہر میں ہوئی؟ ( )

2۔ غالب کی عرفیت کیا تھی؟ ( )

3۔ غالب نے دہلی کا رخ کس سنہ میں کیا؟ ( )

4۔ غالب کے خطوط کا پہلا مجموعہ کا نام کیا ہے؟ ( )

5۔ غالب کے کتنے اردو دیوان شائع ہوئے؟ ( )

مشق 2: خالی جگہوں کو پُر کیجیے۔

6۔ پہلی جنگ آزادی (غدر)..... سنہ میں واقع ہوئی۔

7۔ غالب کے خطوط کے دوسرا مجموعے کا نام..... ہے۔

8۔ غالب کے والد کا نام ..... ہے۔

9..... کے انتقال کے بعد غالب' بادشاہ کے استاد مقرر ہوے۔

15.6 نمونہ امتحانی سوالات

15.6.1 معروضی سوالات:

1۔ مرزاغالب کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟

(a)1797ء (b) 1780 (c) 1800 (d) 1799

2۔ غالب کا کس کالج میں استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا؟

(a)علی گڑھ کالج (b)دہلی کالج (c)کانوین کالج (d)آگرہ کالج

3۔ مرزاغالب کس بادشاہ کے استاد مقرر ہوے؟

(a)شاہجہاں (b)جہانگیر (c)اورنگ زیب (d)بہادر شاہ ظفر

4۔ مرزاغالب کا انتقال کس سنہ میں ہوا؟

(a) 1900 (b) 1872 (c) 1869ء (d) 1860

5۔ غالب کو کس خاندان کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا گیا؟

(a)خلجی خاندان (b)خاندان تیموریہ (c)تغلق خاندان (d)ایبک خاندان

6۔ غالب نے ابتدائی تعلیم کس استاد سے حاصل کی؟

(a)شیخ سعدی (b) شیخ معظم (c) شیخ حزیں (d) شیخ سلیم

7۔ غالب کے خطوط کے پہلے مجموعے کا نام کیا ہے

(a) اردوئے معلیٰ (b) مکاتیب غالب (c) عود ہندی (d) خطوط غالب

8۔ غالب نے خط نمبر1 کس کے نام لکھا ہے؟

(a) میر مہدی مجروح (b) نواب رام پور (c) علاءالدین علائی (d) میر سرفراز حسین

9۔ غالب نے کس خط میں رام پور اور کلکتہ کے سفر کا ذکر کیا ہے؟

(a) خط نمبر1 (b) خط نمبر2 (c) خط نمبر3 (d) خط نمبر5

10۔ خط نمبر2 غالب نے کس کے خط کے جواب میں لکھا ہے؟

(a) انگریز حکام (b) مہدی مجروح (c) منشی ہرگوپال تفتہ (d) حالی

15.6.2 مختصر جواب کے حامل سوالات:

1۔ خطوط نگاری کی اہمیت بیان کیجیے۔

2۔ غالب نے مراسلہ کو مکالمہ کیسے بنادیا؟

3۔ غالب کے خطوط کی تکنیک کیا تھی؟

4۔ غالب نے میر سرفراز حسین کو جو خط لکھا۔ اس میں کس چیز کا ذکر کیا ہے؟

5۔ سادہ و سلیس نثر کی مثال دیجیے۔

15.6.3 طویل جواب کے حامل سوالات:

1۔ مرزا غالب کی حالات زندگی پر روشنی ڈالیے۔

2۔ غالب کی خطوط نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔

3۔ مرزا غالب کے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھے گئے خط کا خلاصہ لکھیے۔

15.6.1 کے جوابات:

B (v)	C (iv)	D (iii)	B (ii)	A (i)
C (x)	A (ix)	C (viii)	C (vii)	B (vi)

اکائی16: خطوط

(انتخاب خطوط اقبال)

اکائی کے اجزا

16.0		تمہید
16.1		مقاصد
16.2		خطوط اقبال
	16.2.1	علامہ اقبال کا تعارف
	16.2.2	علامہ اقبال کی خطوط نگاری
	16.2.3	علامہ اقبال کے منتخب خطوط
16.3		اکتسابی نتائج
16.4		مشکل الفاظ
16.5		مشقیں
16.6		نمونہ امتحانی سوالات

16.0 تمہید

علامہ اقبال اردو ادب کی ایک بڑی علمی اور فکری شخصیت ہیں۔ ان کی شاعری اور نثر پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ان کے فلسفہ نے ہمیں کئی پہلوؤں سے رہنمائی دی ہے۔ اقبال نے اپنے زمانے کے مشہور لوگوں کو کئی خطوط لکھے، جیسے اکبر الہ آبادی اور سید سلیمان ندوی۔ ان خطوط سے ہمیں علامہ اقبال کے خیالات، دلچسپیوں اور اُس دور کے مسائل کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ ان مسائل کے حل کے لیے کیا سوچتے اور کیا کوششیں کرتے تھے۔

جب ہم کسی شخصیت کے خطوط پڑھتے ہیں تو ہمیں ان کی اصل سوچ، احساسات اور رویے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، کیونکہ خط ایک ذاتی تحریر ہوتی ہے۔ اس میں انسان کے دل کی باتیں ہوتی ہیں جو عام تحریروں میں نہیں ملتیں۔ خطوں میں وقت، موقع اور تعلق کے مطابق باتوں کا انداز اور موضوعات بدلتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر، جب علامہ اقبال جواہر لال نہرو کو خط لکھتے تھے، تو ان میں سیاست، برصغیر کے مسلمانوں کے حالات اور ان کے مستقبل کے مسائل زیر بحث آتے تھے۔ لیکن جب وہ سید سلیمان ندوی کو خط لکھتے تھے تو مذہبی اور دینی

باتیں ہوتی تھیں۔ اسی طرح، مولانا غلام قادر گرامی کو لکھے گئے خطوط میں دوستی اور شاعری کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے۔ سید نذیر نیازی کو لکھے گئے خطوط میں علامہ اقبال کی بیماری اور علاج کی باتیں ملتی ہیں۔ خان نیاز الدین خاں کے نام خطوط میں دوستی، کبوتروں کا شوق، دینی اور روحانی باتیں شامل ہیں۔ اس اکائی میں ہم علامہ اقبال کے منتخب خطوط کا تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔

16.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- خطوط کی روشنی میں اقبال کی سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی، علمی و ادبی فکر کو واضح کر سکیں۔
- خطوط کے آئینے میں اقبال کی سیرت و شخصیت کو بیان کر سکیں۔
- علامہ اقبال کے خط لکھنے کے طریقے سے واقف ہو سکیں۔
- علامہ اقبال کے منتخب خطوط کی قرات کر سکیں۔
- علامہ اقبال کے خطوط کی اہمیت بیان کر سکیں۔

16.2 خطوط اقبال

16.2.1 علامہ اقبال کا تعارف:

علامہ اقبال 9 نومبر 1877 کو سیالکوٹ (اب پاکستان میں) میں ایک مذہبی اور تعلیم یافتہ کشمیری خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ نور محمد ایک دیندار اور سیدھے سادے انسان تھے، جب کہ والدہ امام بی بی نہایت نیک اور صابر خاتون تھیں۔ اقبال نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی۔ انہوں نے مرے کالج، سیالکوٹ سے انٹر میڈیٹ کیا اور پھر لاہور کے گورنمنٹ کالج سے فلسفہ میں بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

1905 میں علامہ اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ میں ڈگری حاصل کی، پھر جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ (Ph.D) کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا تحقیقی مقالہ "The Development of Metaphysics in Persia" کے عنوان سے شائع ہوا۔

اقبال نے اردو اور فارسی میں شاعری کی۔ ان کی شاعری صرف جذباتی اظہار نہیں بلکہ ایک فکری دعوت تھی۔ ان کے شعری مجموعے بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز ہیں۔ فارسی میں لکھے گئے ان کے مجموعے مثلاً اسرارِ خودی، رموزِ بیخودی، زبورِ عجم وغیرہ عالمی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کا انتقال 21 اپریل 1938 کو لاہور میں ہوا۔

16.2.2 علامہ اقبال کی خطوط نگاری:

اقبال نہ صرف ایک عظیم شاعر اور فلسفی تھے بلکہ گہرے محسوسات رکھنے والے حساس انسان بھی تھے۔ ان کی علمی، فکری اور روحانی زندگی کے کئی پہلو ہمیں اُن کے خطوط میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔ خطوط نگاری کے فن میں علامہ اقبال کو ایک خاص مقام حاصل ہے،

کیونکہ ان کے خطوط محض رسمی پیغامات نہیں، بلکہ فکری مکالمے، دلی جذبات کے اظہار، دورِ حاضر کے مسائل کی تفہیم اور ذاتی زندگی کی جھلک پیش کرتے ہیں۔

علامہ اقبال کے خطوط مختلف موضوعات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ کہیں دینی و فلسفیانہ گفتگو ہوتی ہے، کہیں ادبی مسائل پر تبادلہ خیال، اور کہیں خالص ذاتی اور دوستانہ جذبات کا اظہار۔ اُن کے مخاطبین میں وقت کے بڑے بڑے اہلِ علم، سیاستدان، دانشور اور دوست شامل ہیں، جیسے اکبر الٰہ آبادی، سید سلیمان ندوی، مولانا غلام قادر گرامی، سید نذیر نیازی، عطیہ فیضی، مہاراجہ کشن پرشاد وغیرہ۔

علامہ اقبال کے خطوط کا لب و لہجہ مخاطب کی شخصیت، رشتہ اور حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ بعض خطوط میں ان کی فکری گہرائی اور نظریاتی بصیرت نمایاں ہوتی ہے، جب کہ بعض میں ان کی عاجزی، انسان دوستی اور لطیف مزاح بھی جھلکتا ہے۔ ان خطوط سے ہمیں نہ صرف اقبال کی نجی زندگی کے کئی پہلو معلوم ہوتے ہیں بلکہ برصغیر کے سیاسی، مذہبی اور سماجی حالات پر ان کے ردِ عمل اور تجاویز بھی سامنے آتی ہیں۔ خطوط کی یہی خصوصیات انہیں محض ذاتی تحریریں نہیں رہنے دیتیں بلکہ ایک عہد کی فکری دستاویز بنا دیتی ہیں۔

علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف گوشے اور ان کے فکر و فن کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے نیز ان کی شاعری کے فکری پس منظر کو جاننے کے لیے خطوط اقبال کا مطالعہ بے حد مفید ہو گا۔ علامہ اقبال کے خطوط کے مختلف مجموعے تاریخی ترتیب کے ساتھ شائع کیے جا چکے ہیں، لیکن ان میں تصحیح اور کلیات مکاتیب کو زمانی تسلسل سے پیش کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ اسی کے پیش نظر سید مظفر حسین برنی نے علامہ اقبال کے تمام خطوط کو "کلیاتِ مکاتیب اقبال" کے نام سے چار جلدوں (مع حواشی و تعلیقات) میں مرتب کیا ہے۔

کلیاتِ مکاتیب اقبال کی چاروں جلدوں میں 1624 خطوط جمع کیے گئے ہیں، جن میں اردو، انگریزی، جرمن، عربی اور فارسی تمام زبانوں میں لکھے گئے خطوط شامل ہیں۔ یہاں آپ اسی کلیات سے منتخب خطوط کا مطالعہ کریں گے۔

16.2.3 علامہ اقبال کے منتخب خطوط:

(1)

سید سلیمان ندوی کے نام:

لاہور

10/ نومبر، 1919ء

مخدومی۔۔۔ السلام علیکم! کئی دنوں سے آپ کو خط لکھنے کا قصد کر رہا تھا۔

دریافت طلب امر یہ ہے کہ موکلین وکلاء کے پاس جب مقدمات کی پیشی کے لیے آتے ہیں تو ان میں سے بعض پھل، پھول یا مٹھائی کی صورت میں ہدیہ لے آتے ہیں۔ یہ ہدایا فیس مقررہ کے علاوہ ہوتے ہیں اور وہ لوگ اپنی خوشی سے لاتے ہیں۔ کیا یہ مسلمان کے لیے حلال ہے؟

مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ آپ کی نظر سے گذرا ہو گا۔ بہت دلچسپ کتاب ہے، مگر دیباچہ میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ "اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال کی آوازِ بازگشت

ہیں۔ "شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں ان کو برابر 1907ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم و نثر انگریزی و اردو میں موجود ہیں جو غالباً مولوی صاحب کے پیش نظر نہ تھیں بہر حال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انہوں نے ایسا لکھا مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے نہ نام آوری البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریکِ الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا۔ تحریک الہلال نے اسے مسلمان کیا۔ ان کی عبارت سے ایسا مترشح ہوتا ہے، ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سنے گئے ان میں اور مثنویوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ معلوم نہیں انہوں نے کیا سنا تھا اور سنی سنائی باتوں پر اعتبار کر کے ایسا جملہ لکھنا جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ کسی طرح ان لوگوں کے شایانِ شان نہیں جو اصلاح کے علمبر دار ہوں۔ مجھے معلوم نہیں مولوی فضل الدین صاحب کہاں ہیں ورنہ یہ موخر الذکر شکایت براہ راست ان سے کرتا اگر آپ سے ان کی ملاقات ہو تو میری شکایت ان تک پہنچایئے۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ والسلام!

آپ کا خادم

محمد اقبال، لاہور

(2)

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام:

لاہور

3/ اکتوبر، 1918ء

مخدوم مکرم جناب مولانا السلام علیکم!

آپ کا نوازش نامہ مل گیا ہے جس کے لیے نہایت ممنون ہوں۔ مجھے اس سے بہت فائدہ پہنچے گا۔ میں چند روز کے لیے شملہ گیا تھا وہاں معلوم ہوا کہ آپ بھی وہاں تشریف رکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مجھے ایک ضروری کام درپیش تھا، جس میں

مصروفیت رہی۔ البتہ معنوی طور پر آپ کی صحبت رہی کیوں کہ رات کو سیرت نبویؐ کا مطالعہ رہتا تھا۔ مولانا مرحوم نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے، جس کا صلہ دربارِ نبوی سے عطا ہو گا۔

قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا بالکل بجا ہے مگر چوں کہ شاعری اس مثنوی سے مقصود نہ تھی اس واسطے میں نے بعض باتوں میں عمداً تساہل برتا۔ اس کے علاوہ مولانا روم کی مثنوی میں قریباً ہر صفحہ پر اس قسم کے قوافی کی مثالیں ملتی ہیں اور ظہوری کے ساقی نامہ کے چند اشعار بھی زیر نظر تھے۔ غالباً اور مثنویوں میں بھی ایسی مثالیں ہوں گی۔

اصول تشبیہ کے متعلق کاش آپ سے زبانی گفتگو ہو سکتی۔ قوت واہمہ کے عمل کی رو سے بیدلؔ اور غنیؔ کا طریق زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ گو کتبِ بلاغت کے خلاف ہے۔ زمانۂ حال کے مغربی شعرا کا بھی یہی طرز عمل ہے تاہم آپ کے ارشادات نہایت مفید ہیں اور میں ان سے مستفید ہونے کی پوری کوشش کروں گا۔

بحرؔ تلخ رو کلمہ (بہ سکونِ لام) باریکؔ تر از جو (بہ معنی کم در عرض و عُمق) کوریؔ ذوق، محفل از ساغر رنگین کردن، سرمۂ او دیدۂ مروم شکست۔ سازؔ برقِ آہنگ از گل غربت (بہ معنی شر) نوآبالیدن۔ صبح آفتاب اندر قفس وغیرہ کی مثالیں اساتذہ میں موجود ہیں۔ مگر اس خیال سے کہ آپ کا وقت ضائع ہو گا نظر انداز کرتا ہوں۔ البتہ اگر آپ اجازت دیں تو لکھوں گا۔ محض یہ معلوم کرنے کے لیے کہ میں نے غلط مثالیں تو انتخاب نہیں کیں۔

ایک امر دریافت طلب ہے اس سے آگاہ فرما کر ممنون کیجیے۔ "قطرۂ از نرگس شہلا ستی" پر جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے میں نہیں سمجھ سکا۔ کیا آپ کا یہ مقصود ہے کہ قطرہ کا لفظ شہلا کے لیے (یعنی قطرۂ شہلا) موزوں نہیں یا کچھ اور؟ علیٰ ہٰذا القیاس "خیمہ بر زد در حقیقت از مجاز"، "نعرۂ زد شیرے از دامانِ دشت"، "باز بانت کلمۂ توحید خواند" پر بھی جو ارشادات ہیں، میری سمجھ میں نہیں آئے۔ اس زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ جب فرصت ملے اس جزئیات سے بھی آگاہ فرمائیں۔ اس احسان کے لیے ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔ بعض خیالات زمانہ حال کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کا نتیجہ ہیں۔ ان کے ادا کرنے کے لیے قدیم فارسی اسلوب بیان سے مدد نہیں ملتی بعض تاثرات کے اظہار کے لیے الفاظ ہاتھ نہیں آتے۔ اس واسطے مجبوراً ترکیب اختراع کرنی پڑتی ہے جو ضروری ہے کہ اہل زبان کو ناگوار ہو کہ دل و دماغ اس سے مانوس نہیں ہیں۔ بعض اشعار کے لکھنے میں تو مجھے اس قدر روحانی تکلیف ہوئی کہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی تاہم اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ کاش چند روز کے لیے آپ سے ملاقات ہوتی اور آپ کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملتا۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

(3)

خان محمد نیاز الدین خاں کے نام:

لاہور

4/ نومبر، 1917

مخدومی جناب خاں صاحب! السلام علیکم

آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے، الحمد للہ کہ خیریت ہے۔

گرامی صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ محرم میں تشریف لائیں گے، مگر الکوفی لایوفی اب معلوم نہیں کہاں تشریف رکھتے ہیں، عرصہ سے ان کا خط بھی نہیں آیا۔

پنڈت چھجوم رام صاحب کی رائے سے کوئی تعجب مجھے نہیں ہوا۔ ہر شخص ہر کتاب کو اپنے خیالات کی روشنی میں پڑھتا ہے اور اس کے مضامین سے وہی نتائج نکالتا ہے جن کی اس کی دماغی تربیت مقتضی ہوتی ہے۔ سیاسیات مسلمانوں میں کوئی علاحدہ شے نہیں ہے، بلکہ خالص مذہبی نکتۂ خیال سے کچھ شے ہی نہیں، اور اگر کچھ ہے تو مذہب کی لونڈی ہے۔ کعبہ آباد است الخ والا مصرعہ اس وقت لگا گیا تھا جب موجودہ حالات کا نام ونشان بھی نہ تھا۔

دوسرا حصہ ان شا اللہ اس سال سے پہلے ختم ہو جائے گا، صرف چند اشعار کی کسر باقی ہے اگر آج وہ اشعار لکھے جائیں تو ایک ہفتے کے اندر نقل کر کے کتاب مطبع میں دی جا سکتی ہے، مگر میں انتظار میں ہوں کہ وہ اشعار آئیں تو ان کو مثنوی میں داخل کروں۔ دوسرے حصے کے مضامین سے پہلے حصہ پر کافی روشنی پڑے گی اور بہت سی تشریحات جو پہلے حصہ کے اشعار کی جا رہی ہے، خود بخود غلط ہو جائے گی۔ اسلامی NATIONALISM کی حقیقت اس سے واضح ہو گی اور یہ کہنے میں کوئی مبالغہ یا خودستائی نہیں ہو گی کہ اس رنگ کی کوئی نظم یا نثر اسلامی لٹریچر میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ باقی خدا کے فضل وکرم سے خیریت ہے۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

گرامی صاحب تو امام غائب ہو گئے، معلوم نہیں اس غیبتِ صغریٰ کا زمانہ کب ختم ہو گا۔

خاکسار

محمد اقبال

(4)

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے نام:

لاہور

27/ ستمبر، 1936ء

مخدومی جناب مولیٰنا! نوازش نامہ ابھی ملا ہے۔ اس سے پہلے بھی آپ کا خط مع تجویز ملا تھا۔ مگر میں علالت کے باعث جلد جواب نہ لکھ سکا۔ پہلے سے اچھا ہوں، مگر افسوس ہے کہ ابھی سفر کے لائق نہیں ہوں، خصوصاً جب کہ سفر 12 گھنٹے سے زیادہ ہو۔ رات بھر ریل میں سفر قبض ہو جاتی ہے، جو سخت تکلیف دیتی ہے اور یہ سلسلہ کئی دن رہتا ہے۔ بہر حال اگر اردو کانفرنس کی تاریخوں تک میں سفر کرنے کے قابل ہو گیا تو انشا اللہ ضرور حاضر ہوں گا۔ لیکن اگر حاضر نہ بھی ہو سکا تو یقین جانیے کہ اس اہم معاملے میں کلیۃً آپ کے ساتھ ہوں۔ اگر چہ میں اردو زبان کی بحیثیت زبان خدمت کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ تاہم میری لسانی عصبیت دینی عصبیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

آپ کی تجویز میں اختلاف کی کوئی زیادہ گنجائش نہیں۔ میرے خیال میں صرف دو باتیں زیر بحث آئیں گی:

اول یہ کہ فنڈ کہاں سے آئے گا۔ عام مسلمانوں کی حالت اقتصادی اعتبار سے حوصلہ شکن ہے۔ امرا توجہ کریں تو کام بن سکتا ہے مگر افسوس کہ اکثر مسلمان امرا مقروض ہیں۔

دوم یہ کہ صدر انجمن کا مستقر کہاں ہو میرے خیال میں اس کا مستقر لاہور میں ہونا چاہیے اور اس کے لیے ایک سے زیادہ وجوہ ہیں:

(i) مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لیے جو لڑائیاں آئندہ لڑنا پڑیں گی ان کا میدان پنجاب ہو گا۔ پنجابیوں کو اس میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی۔ کیوں کہ اسلامی زمانہ میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ رزم گاہ یہی سرزمین معلوم ہوتی ہے!

(ii) آپ انجمن اردو کے متعلق ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی کامیابی بھی لاہور ہی میں ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ! ایک بڑا پبلشنگ سنٹر ہے اور بہت سا طباعت کا کام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ انگریزی پبلشنگ کی طرف بھی یہاں کے مسلمان توجہ کر رہے ہیں۔

(iii) یہاں کے لوگوں میں اثر قبول کرنے کا مادہ زیادہ ہے۔ سادہ دل صحرائیوں کی طرح ان میں ہر قسم کی باتیں سننے اور ان سے متاثر ہو کر ان پر عمل کرنے کی صلاحیت اور مقامات سے بڑھ کر ہے۔ ایک معمولی جلسے کے لیے آٹھ دس ہزار مسلمانوں کا جمع ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ بلکہ بیس بیس ہزار کا مجمع بھی غیر معمولی نہیں۔ یہ بات پنجاب کے ہندوؤں میں بھی نہیں پائی جاتی۔

باقی رہا آپ کے خط کا آخری فقرہ! سو میں اس کے لیے آپ کا بہت شکر گزار ہوں ،انسان جب تک زندہ ہے افکار و تردد ات لازمہ حیات ہیں:

مرتا ہوں جو بے چین گھڑی بھی نہیں ہوتا

معنوی اعتبار سے تو مدت ہوئی کہ میں نے اسے آپ پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ اب ظاہری اعتبار سے بھی چھوڑتا ہوں۔ کیوں کہ آپ ایک صاحب عزم آدمی ہیں اور یہ بات مجھے مدت سے معلوم ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں امید کہ آپ کا مزاج بخیر و عافیت ہو گا۔ والسلام

مخلص

محمد اقبال

(5)

عطیہ فیضی کے نام:

لاہور

30/مارچ،1910ء

مائی ڈیر مس عطیہ!

ملامت نامہ کے لیے جس سے میں بے حد لذت اندوز ہوا، اسراپا سپاس ہوں۔ ایک دوست کی ملامت سے بڑھ کر اور کیا پر لطف انگیز ہوا۔ نواب صاحب کا دعوت نامہ حیدر آباد ہی میں موصول ہوا تھا۔ میں نے فوراً آپ کو لکھا تھا کہ موروڈ (جنجیرہ) آنا میرے لیے ممکن نہیں ،کل واپسی پر آپ کا خط ملا۔ عتاب شیریں۔ اور میں نے نواب صاحب کو تار دیا کہ میں اپنی کالج کی مصروفیت کی وجہ سے، جو پہلے بھی بارہا میرے لیے زنجیر پا بن چکی ہیں، شرف حاضری سے محروم رہ گیا ہوں۔ میں اگر حیدر آباد چندے اور ٹھہر جاتا تو مجھے یقین واثق ہے کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام مجھے شرف باریابی بخشتے۔ میں حیدر آباد میں جملہ اکابر سے ملا اور اکثر نے مجھے اپنے ہاں دعوت پر

بلایا۔ میرا سفر حیدرآباد بلا مقصد نہ تھا۔ عندالملاقات عرض کروں گا۔ خاندان حیدری سے ملاقات ہی مقصود سفر نہ تھا۔ میں ان سے اس سفر میں ہی ملاہوں۔ قبل ازیں ان سے مجھے نیاز حاصل نہ تھا۔ بیگم حیدری کا کرم ہے کہ انہوں نے ان عنایت آمیز الفاظ میں میرا ذکر کیا ہے۔ مجھے ان کا اہل عرب کا سا جذبہ بے حد پسند آیا اور ان کے ہاں مجھے گھر کی سی آسائش میسر آئی۔ میں ان تمام امور میں جو ان کی توجہ یا ہمدردی کا مرکز ہیں، ان کے فہم و فراست کا مداح ہوں۔ حیدری اور بیگم حیدری ہی کے اثر سے مجھے حیدرآباد کی معاشرت کے بعض بہترین نمائندوں سے ملاقات کا موقع میسر آیا۔ حیدری صاحب ایک پابند وضع اور وسیع المشرب بزرگ ہیں۔ ان سے ملاقات سے قبل میری رائے تھی کہ وہ اعداد و شمار سے کام رکھنے والے ایک خشک طبع انسان ہوں گے، لیکن میں نے دیکھا ہے کہ قدرت نے انہیں دردِدل اور فکر بلند کی نعمتوں سے مالامال کر رکھا ہے۔ ان دونوں کے لیے میرے دل میں بے حد احترام ہے۔ ایک حقیقی گھر کا نقشہ ایک تو میں نے آرنلڈ صاحب کے ہاں دیکھا تھا اور دوسرا ان کے ہاں۔ بیگم حیدری اپنے وجدان کی بدولت ہم مردوں کی نسبت جن کا سرمایہ بے جان تجزیاتی استدلال ہے، بہتر معاملہ فہم ہیں۔

اب اتنا کرم فرمایئے کہ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں میری طرف سے معذرت پیش کیجیے۔ حیران ہوں کہ نواب صاحب کے تار کے جواب میں اس خط کا، جو میں نے انہیں لکھا تھا، کیا حشر ہوا؟ شومی قسمت سے میری افتاد طبیعت ایسی ہے کہ میں نے اپنے دلی جذبات کے اظہار و اعلان کا عادی نہیں۔ میرے تعلقِ خاطر میں ایک گہرائی و گرم جوشی پائی جاتی ہے مگر دنیا یہ سمجھتی ہے کہ میں ایک بے حس انسان ہوں۔ ازراہ کرم نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کو یقین دلایئے کہ میں دائم ان کا نیاز مند ہوں۔ جب کبھی حالات نے مساعدت کی، میں انتہائی مسرت کے ساتھ جنجیرہ حاضر ہوں گا۔ میری رخصت اتفاقیہ صرف دس دن کی تھی، جو 28/ کو ختم ہو گئی۔ میں 23/ کو حیدر آباد سے لاہور کے لیے روانہ ہوا۔ چار دن کا سفر ہے۔ واپسی میں مجھے اورنگ زیب کے مزار پر بھی حاضر ہونا تھا۔ حضرت عالم گیر پر میں ایک انتہائی وجد انگیز اور ولولہ خیز نظم لکھوں گا کہ اردو خوانوں کی نظر سے آج تک نہ گزری ہو گی۔

29/ کی صبح کو لاہور پہنچا، سیدھا کالج جانا پڑا، وہاں سے کچہری۔ آپ خود ہی اندازہ لگایئے کہ اندریں حالات میرے لیے جنجیرہ کا سفر کیوں کر ممکن تھا۔ اس بنا پر مجھے بادلِ نخواستہ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کے دیدار کی لذت سے محروم ہونا پڑا۔ مجھے یقین ہے اس تصریح سے آپ کی تسلی ہو جائے گی اور آپ میری طرف سے وکالت کریں گی۔ اپنی لغزشوں اور

کوتاہیوں کا مجھے خود اعتراف ہے، لیکن فراموش گاری اور ریاکاری کا کبھی مرتکب نہیں ہوا ہوں، لیکن شاید جیسا کہ آپ خیال کرتی ہوں گی میں تو خود اپنے لیے بھی ایک معمہ ہوں جس کو سب جانتے ہیں۔

وہ راز ہوں کہ زمانے پہ آشکار ہوں میں

میرے طور طریقے انوکھے ہو سکتے ہیں، لیکن اس دنیا میں ایسوں کی کیا کمی ہے جن کے اطوار مجھ سے بھی حیرت انگیز ہوں۔ موقع ہی انسان کی اصل فطرت کا امتحان ہے اگر کبھی وقت آیا تو میں یقیناً آپ کو دکھادوں گا کہ مجھے اپنے احباب سے کس قدر تعلق خاطر ہے اور ان کے لیے کس قدر دل سوزی مجھ میں پائی جاتی ہے۔ زندگی کسے پیاری نہیں اور کیوں نہ ہو، لیکن اپنے آپ میں اس قدر قوت ضرور پاتا ہوں کہ جب ضرورت پڑے اسے دوسروں پر نثار کر دوں۔ فراموش گاری، ریاکاری کو اشارۃً و کنایتہ بھی مجھ سے منسوب نہ کیجیے گا کہ اس سے میری روح کو اذیت ہوتی ہے۔ میری فطرت سے متعلق آپ کی ناواقفیت پر لرز اٹھتا ہوں۔ کاش میں اپنا باطن آپ پر عیاں کر سکتا۔ تاکہ میری روح پر فراموش گاری کا جو حجاب آپ کو نظر آتا ہے، دور ہو جاتا۔

براہ کرم اس ناگزیر فرد گذاشت کے لیے میری طرف سے ان کی خدمت میں معذرت پیش کیجیے اور مجھے فوری طور پر مطلع کیجیے کہ میری تصریح اُن کے نزدیک قابلِ قبول ثابت ہوئی یا نہیں۔

دائم آپ کا

محمد اقبال

(6)

میر سید غلام بھیک نیرنگ کے نام:

لاہور

5/ دسمبر، 1928ء

ڈیر میر صاحب، السلام علیکم!

میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا کام اس وقت تمام کاموں پر مقدم ہے۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبودی ہے اور حفاظتِ اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے جیسا کہ آج کل کے "قوم پرستوں" کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے تو مسلمان

اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ یہ بات میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں اور سیاسیاتِ حاضرہ کے تھوڑے سے تجربہ کے بعد۔ ہندوستان کی سیاسیات کی روش سے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے خود مذہب اسلام کے لیے ایک خطرۂ عظیم ہے۔ میرے خیال میں شُدھی کا خطرہ اس خطرے کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتا یا کم از کم یہ بھی شُدھی ہی کی ایک غیر محسوس صورت ہے۔ بہر حال جس جانفشانی سے آپ نے تبلیغ کا کام کیا ہے اس کا اجر حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی دے سکتے ہیں۔ میں انشا اللہ جہاں جہاں موقع ہو گا آپ کے ایجنٹ کے طور پر کہنے سننے کو حاضر ہوں مگر آپ اور مولوی عبد الماجد بدایونی جنوبی ہندوستان کے دورے کے لیے تیار رہیں۔

باقی رہا لکچروں کے ترجمے کا کام، سو یہ کام ناممکن نہیں تو مشکل اور از بس مشکل ضرور ہے۔ ان لکچروں کے مخاطب زیادہ تر مسلمان ہیں، جو مغربی فلسفے سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفۂ اسلام کو فلسفۂ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے اور اگر پرانے تخیلات میں خامیاں ہیں تو ان کو رفع کیا جائے۔ میرا کام زیادہ تر تعمیری ہے اور اس تعمیر میں، میں نے فلسفۂ اسلام کی بہترین روایات کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ اردو خواں دنیا کو شاید ان سے فائدہ نہ پہنچے کیوں کہ بہت سی باتوں کا علم میں نے فرض کر لیا ہے کہ پڑھنے والے (یا سننے والے) کو پہلے سے حاصل ہے۔ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ تین لکچر امسال لکھے گئے ہیں، تین آئندہ سال لکھوں گا اور مدراس ہی میں دسمبر 1929ء یا جنوری 1930ء میں دوں گا۔ حیدرآباد دکن بھی ٹھہروں گا۔ کیوں کہ عثمانیہ یونیورسٹی کا تار آیا ہے کہ لکچر وہاں بھی دیے جائیں۔ آئندہ دسمبر تک یہ تمام لکچر تیار ہو کر چھپ جائیں گے۔ اس وقت میں آپ کی خدمت میں ایک کاپی بھیج سکوں گا۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

مخلص

محمد اقبال

(7)

رشید احمد صدیقی کے نام:

لاہور

دسمبر، 1929

جناب صدیقی صاحب السلام علیکم!

آپ کا خط مل گیا ہے۔

میری رائے ناقص میں خواجہ حافظؔ کے شعر میں لفظ "بادیہ پیمائی" ہے۔ پہلے مصرے میں 'اینجا' سے مراد 'دریں بادیہ' ہے۔ مفہوم شعر کا یہ ہے کہ اس دشت میں سینکڑوں ہوائیں بے سلسلہ (یعنی بے زنجیر، آزادانہ) رقص کر رہی ہیں اور یہی ہوائیں اے دل تیری رفیق (حریف بمعنی رفیق) ہیں جب تک تو بادیہ پیما ہے۔ یا ان کا رقص اس غرض سے ہے کہ تو آسانی اور اطمینان سے اس صحرا کو طے کر لے۔ شاعر کا مقصود اپنے آپ کو تسکین دینا ہے کہ تو اس بادیہ گردی میں تنہا نہیں ہے بلکہ عالم کا ہر ذرہ تیری ہی خاطر حالتِ رقص میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلا مصرع بہت بلند ہے اور کسی اور مضمون کا متقاضی ہے۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ والسلام!

مخلص

محمد اقبال

16.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- اقبال کے خطوط اقبال کی سوانحی کوائف کا بہترین مآخذ ہیں۔
- اقبال کے خطوط اس دور کے مسائل اور ان مسائل کے حل کی تلاش ہیں۔
- علامہ اقبال کے خطوط میں ان کی شخصیت کے وہ پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں جو عام طور پر دوسری تحریروں میں نمایاں نہیں ہوتے۔
- مکاتیب اقبال میں ان کے مختلف افکار و نظریات اور فلسفیانہ مسائل کی تشریحات و توضیحات ملتی ہے۔
- علامہ اقبال کی اردو نثر کا بڑا سرمایہ ان کے خطوط ہیں۔ اقبال کا دائرہ احباب بہت وسیع تھا۔ انہوں نے اپنے دوستوں ،عزیزوں، عالموں، دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کو خط لکھے ہیں۔ اب تک ان کے لکھے ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہزار خطوط دستیاب ہو چکے ہیں۔
- علامہ اقبال کے دس سے پندرہ خطوط سب سے پہلے خواجہ حسن نظامی نے اپنی کتاب "اتالیق خطوط نویسی" میں شائع کیے تھے۔
- سید مظفر حسین برنی نے علامہ اقبال کے تمام خطوط کو "کلیاتِ مکاتیب اقبال" کے نام سے چار جلدوں (مع حواشی و تعلیقات) میں مرتب کیا ہے۔
- علامہ اقبال کی سیرت و شخصیت کو بخوبی سمجھنے کے لیے ان کی شاعری سے کہیں زیادہ ان کی نثر بالخصوص ان کے خطوط کا مطالعہ از

حد ضروری ہے۔ علامہ اقبال کی شخصیت میں کوئی جھول نہیں تھا۔ وہ حق بات کو بغیر کسی خوف کو خطر کے کہہ جاتے تھے۔

16.4 مشکل الفاظ

فلسفہ	ایک علم جس سے انسان میں سوچنے اور بحث کرنے کا مادہ بڑھتا ہے	Philosophy
مشاہیر	مشہور اشخاص، بزرگ اور نامور لوگ	Celebrities / Renowned Personalities
رجحانات	توجہ، میلان	Trends / Inclinations
تعلیقات	حاشیے کی وضاحت	Relations / Connections
تنوع	رنگا رنگی، مختلف اقسام کا پایا جانا	Diversity / Variety
فقہی	فقہ کا، شرعی احکام و مسائل سے متعلق	Jurisprudential
صحیفہ	رسالہ، کتاب بالخصوص الہامی کتاب	Scripture / Holy Book
صداقت	سچائی، ثبوت، راست بازی	Truth / Honesty
اتالیق	معلم، استاد	Tutors / Mentors
تصحیح	درست کرنا، غلطی دور کرنا	Correction / Rectification
مساعی	کوشش، دوڑ دھوپ	Efforts / Endeavours
قطع نظر	چھوڑ کر، علاوہ	Regardless / Irrespective
جزئیات	جزو کی جمع، چھوٹے چھوٹے امور	Details / Particulars
تحلیل	حل کرنے، گھلنے گھلانے کا عمل	Analysis
قطعیت	حتمی ہونا، یقینی و قطعی ہونا	Certainty / Finality

16.5 مشقیں

مشق 1: دیے گئے لفظ کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

1۔ اتالیق .....

2۔ فلسفہ .....

3۔ جزئیات .....

4۔ تنوع .....

5۔ شخصیت .....

مشق2: دیے گئے جملوں میں صحیح اور غلط کا نشان لگائیں۔

1۔ علامہ اقبال کی پیدائش 1877 میں لاہور میں ہوئی۔ ( )

2۔ کلیات مکاتیب اقبال کو سید مظفر حسین برنی نے مرتب کیا۔ ( )

3۔ علامہ اقبال کی والدہ کا نام سردار بیگم تھا۔ ( )

4۔ کلیات مکاتیب اقبال کی کل پانچ جلدیں ہیں۔ ( )

5۔ علامہ اقبال کا انتقال 1938 میں لاہور میں ہوا۔ ( )

مشق3: دیے گئے الفاظ کے معنی لکھیے۔

1۔ مساعی .....

2۔ قطع نظر .....

3۔ تحلیل .....

4۔ صداقت .....

5۔ صحیفہ .....

16.6 نمونہ امتحانی سوالات

16.6.1 معروضی سوالات:

1۔ علامہ اقبال کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی؟

(a) 1850 (b) 1860 (c) 1870 (d) 1877

2۔ اقبال کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(a) سیالکوٹ (b) لاہور (c) کراچی (d) اسلام آباد

3۔ اقبال کے والد کا کیا نام تھا؟

(a) شیخ احمد (b) شیخ نور محمد (c) شیخ نور الدین (d) شیخ علیم الدین

4۔ اقبال کی والدہ کا کیا نام تھا؟

(a) مختار بیگم (b) سردار بیگم (c) امام بی بی (d) بڑی بیگم

5۔ علامہ اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ کس سنہ میں گئے؟

1905(a) 1908(b) 1910(c) 1912(d)

6۔ اقبال نے فلسفہ کی ڈگری کس یونیورسٹی سے حاصل کی؟

(a)کیمبرج یونیورسٹی (b)میونخ یونیورسٹی (c)تہران یونیورسٹی (d)ان میں سے کوئی نہیں

7۔ اقبال نے پی ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری کس یونیورسٹی سے حاصل کی؟

(a)تہران یونیورسٹی (b)کیمبرج یونیورسٹی (c)میونخ یونیورسٹی (d) لاہور یونیورسٹی

8۔ "کلیاتِ مکاتیب اقبال" کو کس نے مرتب کیا؟

(a)سید مظفر حسین برنی (b) حمید اللہ ہاشمی (c) شیخ محمد عطااللہ (d) نذیر نیازی

9۔ کلیاتِ مکاتیب اقبال کے اردو خطوط کی کتنی جلدیں ہیں؟

(a) ایک (b) تین (c)چار (d)پانچ

10۔ علامہ اقبال کا انتقال کہاں ہوا؟

(a)سیالکوٹ (b)لاہور (c)گجرات (d)پنجاب

16.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ خطوط اقبال کے موضوعات پر روشنی ڈالیے۔

2۔ خطوط اقبال کی خوبیاں بیان کیجیے۔

3۔ "کلیاتِ مکاتیب اقبال" کے بارے میں لکھیے۔

4۔ خطوط اقبال کی روشنی میں اقبال کی شخصیت کو واضح کیجیے۔

5۔ مولوی عبدالحق کو لکھے گئے خط کا خلاصہ لکھیے۔

16.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ علامہ اقبال کے حالات زندگی بیان کیجیے۔

2۔ علامہ اقبال کی خطوط نگاری پر نوٹ لکھیے۔

3۔ مکاتیب اقبال کی روشنی میں اقبال کے نثری اسلوب کا جائزہ لیجیے۔

16.6.1 کے جوابات:

A (v)	C (iv)	B (iii)	A (ii)	D (i)
C (x)	C (ix)	A (viii)	C (vii)	A (vi)

نمونۂ امتحانی پرچہ

نشانات : ۷۰ Marks: 70 وقت: 3 گھنٹے Time :3hours

ہدایات :

یہ پرچۂ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہیں۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں، جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ پُر کرنا / مختصر جواب والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہیں۔ Marks 1x10=10

2۔ حصہ دوم میں آٹھ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ Marks 5x6=30

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ Marks 3x10=30

حصہ اول

سوال:1

(i) اردو میں داستان کی ابتدا کہاں ہوئی؟

(a) دہلی (b) لکھنؤ (c) دکن (d) کلکتہ

(ii) انشا اللہ خاں انشا کے والد کا کیا نام تھا؟

(b) ماشا اللہ خاں (b) نور اللہ خاں (c) عباد اللہ خاں (d) نصر اللہ خاں

(iii) امراؤ جان ادا کس کی تصنیف ہے؟

(a) نذیر احمد (b) مرزا ہادی رسوا (c) پریم چند (d) سرشار

(iv) کرشن چندر کی ولادت کب ہوئی؟

(b) نومبر 1914 (b) دسمبر 1925 (c) اکتوبر 1911 (d) جنوری 1909

(v) پریم چند کا اصل نام کیا تھا؟

(b) پریم چند (b) دھنپت رائے (c) نواب رائے (d) بھگت رائے

(vii) افسانہ "بھولا" کس نے لکھا؟

(a)راجندر سنگھ بیدی (b)پریم چند (c)کرشن چندر (d)سعادت حسن منٹو

(vii) ڈراما آگرہ بازار پہلی مرتبہ کہاں کھیلا گیا؟

(a) جامعہ ملیہ اسلامیہ (b) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (c) جامعہ عثمانیہ (d) جامعہ ہمدرد

(viii) سیر گولکنڈہ کس کی تصنیف ہے؟

(a)محسن الملک (b)سر راس مسعود (c)ڈاکٹر زور (d)مولوی عبدالحق

(ix) محمد حسین آزاد لاہور میں کس زبان کے استاد تھے؟

(b) انگریزی (b)عربی (c)ترکی (d)اردو

(x) مولوی عبدالحق کا انتقال کہاں ہوا؟

(a)لاہور (b)کراچی (c)اورنگ آباد (d)میرٹھ

حصہ دوم

2۔ داستان کسے کہتے ہیں؟

3۔ بھولا کے ماموں جی پر ایک نوٹ لکھیے۔

4۔ اکبر کون تھا؟ بیان کیجیے۔

5۔ پانچ ایسے جملے بنائیے جس میں "اتفاق، اختلاف، بحث ومباحثہ، سرسید، علی گڑھ" الفاظ استعمال ہوں۔

6۔ محمد قلی قطب شاہ کے بارے میں لکھیے۔

7۔ اس عبارت سے آپ کو کیا سبق ملتا ہے؟ بیان کیجیے۔

"انسان مثل ایک جھینگر کے ہے۔ جو کتابیں چاٹ لیتے ہیں۔ سمجھتے بوجھتے خاک نہیں۔"

8۔ مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری کے بارے میں لکھیے۔

9۔ علامہ اقبال کا تعارف پیش کیجیے۔

حصہ سوم

10۔ امراؤ جان ادا کا خلاصہ بیان کیجیے۔

11۔ افسانہ "نجات" کی خوبی بیان کیجیے۔

12۔ ڈراما آگرہ بازار کا موضوع بیان کیجیے۔

13۔ غالب نے میر سرفراز حسین کو جو خط لکھا۔ اس میں کس چیز کا ذکر کیا ہے؟

14۔ مولوی عبدالحق کو لکھے گئے خط کا خلاصہ لکھیے۔